دوم

قصص القرآن

حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ
یہ بیانِ حق ہے

قصص القرآن

حصۂ دوم

قصصِ قرآن اور انبیاء علیہم السلام کے سوانحِ حیات اور اُن کی
دعوتِ حق کی مستند ترین تاریخ و تفسیر جس میں حضرت یوشع علیہ السلام
کے واقعات سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات تک
نہایت مُبصرانہ اور محققانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی



فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

طبعِ اوّل

الحمد للہ الذی خلق الانسان وعلمہ البیان، ولھدایۃ الثقلین نزل القرآن تبیاناً لکل شیٔ وبرھان والصلوٰۃ والسلام علی سید بنی عدنان، الذی اسمہ احمد فی الانجیل والقرآن خاتم النبیین للانسان والجان وعلی آلہ واصحابہ العزیز الکرام، السابقین الاولین الی الھدایۃ والایمان، والذین اتبعوھم بالخیر والاحسان۔

اما بعد جب قصص القرآن جلد اوّل طبع ہوکر شائع ہوئی اس وقت یہ خیال بھی نہیں تھا کہ یہ کتاب اس درجہ مقبول ہوگی اور اس قدر پسند کی جائے گی جس کا مشاہدہ عام پڑھنے والوں کی قدر افزائی کے علاوہ معزز رسائل اور مؤقر جرائد کے ذریعہ اہلِ قلم کی آراء اور ان کے تبصروں کی شکل میں ہوا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

یہ جلد حضرتِ یوشع (علیہ السلام) کے واقعات سے شروع ہوکر حضرتِ یحییٰ (علیہ السلام) کے حالاتِ طیبہ پر ختم ہوئی ہے۔ واقعات کی ترتیب میں جلدِ اوّل ہی کے اسلوب کو برقرار رکھا گیا ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل کے سلسلۂ ترتیب کے درمیان حضرتِ ایوب (علیہ السلام) اور حضرتِ یونس (علیہ السلام) کا بھی ذکر آگیا ہے حالانکہ ان ہر دو پیغمبروں کا سلسلۂ نسب حضرتِ اسرائیل سے وابستہ نہیں ہے کیونکہ دونوں متقدم ہیں اور چونکہ حضرتِ زکریا و حضرتِ یحییٰ (علیہما السلام) کا ذکر

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے ذکرِ پاک کے لیے توطیہ وتمہید ہے اس لیے حضرتِ ایوبؑ اور حضرتِ یونسؑ کا ذکر حضرتِ زکریا (علیہ السلام) سے قبل آجانا ہی مناسب سمجھا گیا۔ اصحابِ ذوق کتاب کے مطالعہ کے وقت جلدِ اوّل کی طرح اس جلد میں بھی حسبِ ذیل خصوصیات پائیں گے:

(۱) کتاب میں تمام واقعات کی اساس قرآنِ عزیز کو بنایا گیا ہے اور صحیح احادیث اور مستند تاریخی واقعات سے ان کی توضیح وتشریح کی گئی ہے۔

(۲) کتبِ عہدِ قدیم اور قرآنِ عزیز کے "یقینِ محکم" کے درمیان جس جگہ تعارض نظر آتا ہے اُس کو یا روشن دلائل کے ذریعہ تطبیق دے دی گئی ہے اور یا پھر قرآنِ عزیز کی صداقت کو واضح براہین کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔

(۳) اسرائیلی خرافات اور معاندین کے اعتراضات کی خرافات کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کردیا گیا ہے۔

(۴) تفسیری، حدیثی اور تاریخی مسائل اور اُن سے متعلقہ اشکالات پر بحث وتمحیص کے بعد سلفِ صالحین کے مسلکِ قدیم کے مطابق اُن کا حل پیش کیا گیا ہے۔

(۵) کسی پیغمبر کے حالات قرآنِ عزیز کی کن کن سورتوں میں بیان ہوئے ہیں اُن کو نقشہ کی شکل میں ایک جگہ جمع کردیا گیا ہے۔

(۶) ان تمام خصوصیات کے ساتھ "نتائج وعبر"، "مواعظ وبصائر" کے عنوانات سے واقعات واخبار کے حقیقی مقصد اور اصل غرض وغایت یعنی "عبرت وبصیرت" کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔

مصنّف کو ان خصوصیات کے متعلق کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی اس کا فیصلہ اصحابِ ذوق اور اہلِ نظر کے ہاتھ میں ہے۔ وما توفیقی الا باللہ، وھو حسبی ونعم الوکیل۔

خادمِ ملت

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی سیوہاروی

شعبان ۱۳۶۱ھ

دیباچہ طبعِ دوم

الحمدللہ کہ قرآنِ عزیز کی یہ خدمت مقبولِ عام و خاص ہوئی، پہلے حصہ کی طرح دوسرا حصہ بھی بہت جلد ختم ہوگیا اور تقریباً ڈیڑھ سال سے اس کی ایک جلد بھی دفتر میں برائے فروخت موجود نہیں تھی ارادہ تھا کہ طبعِ دوم میں کچھ حک و فک کیا جائے اور نقشِ ثانی کو نقشِ اول سے زیادہ بہتر اور مکمل کرنے کی سعی کی جائے لیکن وقت کی دوسری اور اہم مصروفیتوں اور تصنیف و تالیف کے دیگر ناگزیر مشاغل نے اس کا موقع نہ دیا اور پہلی جلد کی طرح یہ جلد بھی بعینہٖ شائع کردینی پڑی۔ توفیقِ الٰہی شاملِ حال رہی تو طبعِ سوم میں اس کی تلافی کی جائے گی۔

محمد حفظ الرحمٰن

۲ مارچ سنہ ۴۷ء

دیباچہ طبعِ سوم

سنہ ۴۷ء کے شروع میں قصص القرآن جلد اوّل کی طرح جلد دوم بھی کئی ہزار کی تعداد میں طبع کرائی گئی تھی اور سمجھ لیا گیا تھا کہ ان دونوں جلدوں کی طباعت سے اب چند سال کے لیے فراغت ہوگئی ہے لیکن قضاء و قدر کے فیصلے ہمارے اندازوں پر مُسکرا رہے تھے۔

۸ ستمبر سنہ ۴۷ء کی صبح "ندوۃ المصنفین" کے لیے صبحِ قیامت ثابت ہوئی، چند لمحوں

کے اندر ادارے اور اس کے کارکنوں کے نظامِ حیات کا شیرازہ بکھر کے رہ گیا اور لاکھوں روپے کے ذخیرۂ کتب کے ساتھ اس کتاب کا بھی تمام ذخیرہ ضائع ہوگیا۔ تباہی و بربادی کے اس فیصلہ کے باوجود قدرت کا دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ تلخیوں اور ناسازگاریوں کی موجودہ فضا میں یہ ادارہ پھر زندگی کے میدان میں قدم رکھے گا چنانچہ جیسے ہی دفتر کا قیام عمل میں آیا، اس متبرک کتاب کی اشاعت کا کام شروع کردیا گیا۔ پہلے جلد سوم طبع کرائی گئی اور ابھی پچھلے مہینے میں جلد چہارم چھپی، اب جلد دوم حاضر ہے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۱۲ر جنوری ۵۰ء

دیباچہ طبعِ چہارم

کتاب کے ایڈیشن پر ایڈیشن نکل رہے ہیں لیکن نظرثانی کی نوبت نہیں آتی، دیکھنا چاہیے کہ طبعِ پنجم کے وقت بھی نظرثانی ہوسکے گی۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ کتاب کا یہ حصہ اپنی ترتیب اور مضامین کے لحاظ سے نظرثانی کا کچھ زیادہ محتاج نہیں ہے اور یوں انسانی جدوجہد کو ہر حیثیت سے مکمل کسی وقت بھی نہیں کہا جاسکتا۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۲۰ رجب المرجب ۷۴ھ مطابق ۱۶ مارچ ۱۹۵۵ء

دیباچہ طبعِ پنجم عکسی

"قصص القرآن حصہ اول" کی عکسی طباعت جو ہر اعتبار سے دل کش اور دیدہ زیب ہے، اپریل ۱۹۶۵ء میں وجود میں آئی تھی، اُسی وقت سے ارادہ تھا کہ حصہ دوم بھی جلد سے جلد اعلیٰ طباعت کے زیور سے آراستہ ہو کر سامنے آئے، لیکن اندازے کے خلاف کتابت کے کام میں تعویق ہوتی گئی، ہمارے نامور اور باکمال خطاط منشی محمد خلیق صاحب ٹونکی آنتوں کے مرض میں مُبتلا ہو گئے اور علالت کا تسلسُل کئی سال تک قائم رہا، یہ طے کر لیا گیا تھا کہ حصہ دوم کی کتابت بھی حصہ اول ہی کا کاتب کرے گا، ادھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خلیق صاحب کی جگہ کوئی دوسرا کاتب لے بھی نہیں سکتا تھا، اس لیے انتظار کے سوا چارہ نہ تھا، شکر ہے کئی سال کے انتظار کے بعد طباعت کی نوبت آ ہی گئی۔

مصنف مرحوم اپنی رحلت سے قبل کتاب کے دونوں حصوں پر مکمل نظرثانی کر چکے تھے اور مرحلہ صرف طباعت کا باقی رہ گیا تھا، جیسا کہ معلوم ہے "قصص القرآن" کا شمار ہمارے ادارے کی اہم ترین اور مقبول ترین تصنیفات میں ہوتا ہے، جی چاہتا تھا کہ کتاب کے شایانِ شان کتابت و طباعت بھی ہو، الحمد للہ یہ آرزو پوری ہو گئی۔

خیال ہے حصہ سوم اور حصہ چہارم بھی کتابت و طباعت کے اسی معیار کے مُطابق شائع ہوں، یہ دونوں حصے پہلے ہی سے نظرثانی کے کچھ زیادہ محتاج نہیں تھے لیکن مصنف مرحوم دنیا میں ہوتے تو ان حصوں کے بھی نوک پلک اور زیادہ درست کرتے۔

یقین ہے کتاب کے مطالعہ کے وقت قارئین مرحوم کے لیے ایصالِ ثواب کا خیال رکھیں گے کہ یہ ہم سب پر مرحوم کا حق ہے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۳ر شعبان المعظم ۱۳۸۹ھ مطابق ۱۶ر اکتوبر ۱۹۶۹ء

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام

نیابت حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) • حضرت یوشعؑ کا ذکر قرآن میں،
• ارضِ مقدس میں داخلہ • حق ناسپاسی • جزاءِ عمل،

نیابت حضرت موسیٰؑ | حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کی زندگی مبارک کے واقعات میں حضرتِ ہارونؑ کے بعد توراۃ میں حضرتِ یوشع (یشوع) کا ذکر بہ کثرت آتا ہے ہم نے بھی صفحاتِ گذشتہ میں دو تین جگہ اُن کا تذکرہ کیا ہے، یہ حضرتِ موسیٰؑ کی حیات میں اُن کے خادم تھے اور حضرتِ ہارونؑ اور حضرتِ موسیٰؑ کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ اور جانشینِ نبوت بنے، کنعان میں جابر اور مشرک قوموں کے حالات معلوم کرنے کے لئے جو وفد گیا تھا اس کے ایک رکن یہ بھی تھے، اور جب حضرتِ موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو اُن قوموں سے جنگ کرنے کی دعوت و ترغیب دی اور انھوں نے انکار کیا، تب یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے بنی اسرائیل کو جرأت و ہمت دلانے کی کوشش کی اور خدا کا وعدہ نصرت یاد دلا کر جہاد پر اکسایا اور کہا کہ اگر تم جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ تو یقیناً فتح تمہاری ہے۔

توراۃ میں ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ کی زندگی ہی میں حق تعالیٰ نے اُن پر ظاہر کر دیا تھا کہ یوشع میرا خاص بندہ ہے اور بنی اسرائیل کے نوجوان اسی کی سرکردگی میں کنعان اور بیت المقدس کو جابر مشرکین سے پاک کریں گے۔

"خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ نون کے بیٹے یشوع کو لے کر اس پر اپنا ہاتھ رکھ کیونکہ اُس شخص میں روح ہے اور اسے الیعزر کاہن اور ساری جماعت کے آگے کھڑا کر کے ان کی آنکھوں کے

سامنے اُسے وصیت کر، اور اپنے رعب داب سے اُسے بہرہ ور کردے تاکہ بنی اسرائیل کی ساری جماعت اس کی فرمانبرداری کرے[1]۔ اور نون کا بیٹا یشوع (یوشع) دانائی کی روح سے معمور تھا کیونکہ موسیٰ نے اپنے ہاتھ اس پر رکھے تھے اور بنی اسرائیل ان کی بات مانتے رہے[2]۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے بعد ان ہی کی قیادت میں چالیس برس کے بعد بنی اسرائیل کی نسل ارضِ مقدس میں داخل ہوئی اور انھوں نے کنعان، شام، شرق اردن سے تمام جابر و ظالم طاقتوں کو پامال کردیا۔

حضرت یوشع کا ذکر قرآن میں قرآنِ عزیز میں حضرت یوشع (علیہ السلام) کا نام مذکور نہیں ہے، البتہ سورۂ کہف میں دو جگہ حضرت موسیٰؑ کے ایک نوجوان رفیقِ سفر کا تذکرہ موجود ہے جبکہ وہ حضرت خضر سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے "وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِفَتٰىهُ" "فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ" ایک صحیح حدیث میں جو حضرت اُبی بن کعب سے منقول ہے اس نوجوان رفیق کا نام یوشع بتایا گیا ہے۔ اس طرح گویا اُن کا ذکر بھی قرآنِ عزیز میں موجود ہے، اہلِ کتاب کا اُن کے نبی ہونے پر اتفاق ہے اور توراۃ (عہدِ قدیم) میں یشوع کی کتاب بھی مستقل صحیفہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

نسب حضرت یوشع (علیہ السلام)، بنی اسرائیل کے اسباط (اولاد) میں سے حضرت یوسف (علیہ السلام) کے سبط سے تعلق رکھتے ہیں، چنانچہ مؤرخین نے اُنکا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے: یوشع بن نون بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب بن ابراہیم (علیہم السلام)

خدائے تعالیٰ کی کرشمہ سازیوں کا یہ عجب مظاہرہ ہے کہ جس یوسفؑ کی بدولت کنعان کے ستر انسانوں پر مشتمل خاندان عزت و عظمت اور جاہ و جلال کے ساتھ کنعان سے ہجرت کر کے مصر میں آباد ہوا تھا، آج اُس کے پوتے یوشع کی قیادت میں لاکھوں کی مردم شماری کا یہ خاندان پھر اپنے آباء و اجداد کے وطن کنعان میں اسی جاہ و جلال اور سطوت و جبروت

---

[1] گنتی باب ۲۷، آیات ۱۹-۲۰ - [2] استثنا، باب ۳۴، آیت ۹-

کے ساتھ داخل ہو رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس سال گزر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع کو حکم دیا کہ تم بنی اسرائیل کے اس قافلہ کو لے کر موعودہ سرزمین کی طرف بڑھو اور وہاں عمالقہ اور دوسری جابر قوموں سے جنگ کر کے ان کو شکست دو، میری مدد تمہارے ساتھ ہے۔ توراۃ میں ہے:

اور خدا کے بندے موسیٰ کی وفات کے بعد ایسا ہوا کہ خداوند نے اس کے خادم نون کے بیٹے یشوع سے کہا۔ میرا بندہ موسیٰ مرگیا ہے سو اب تو اٹھ اور ان سب لوگوں کو ساتھ لے کر اس یردن کے پار اس ملک میں جا، جسے میں ان کو یعنی بنی اسرائیل کو دیتا ہوں۔ جس جس جگہ تمہارے پاؤں کا تلوا ٹکے اس کو جیسا میں نے موسیٰ کو کہا: میں نے تم کو دیا ہے۔ بیابان اور اس لبنان سے لے کر بڑے دریائے فرات تک حتیوں کا سارا ملک اور مغرب کی طرف بڑے سمندر تک تمہاری حد ہوگی، تیری زندگی بھر کوئی شخص تیرے سامنے کھڑا نہ رہ سکے گا، جیسا میں موسیٰ کے ساتھ تھا ویسے ہی تیرے ساتھ رہوں گا، میں نہ تجھ سے دست بردار ہوں گا اور نہ تجھے چھوڑوں گا۔[۱]

ارضِ مقدس میں داخلہ حضرت یوشعؑ نے بنی اسرائیل کو خدا کا پیغام سنایا اور وہ سب دشتِ سینا سے نکل کر ارضِ کنعان کے سب سے پہلے شہر اریحا (یریحو) کی جانب بڑھے اور دشمنوں کو للکارا، دشمنوں نے بھی باہر نکل کر سخت مقابلہ کیا اور آخر کار شکست کھا کر میدان چھوڑ گئے اور بنی اسرائیل کو زبردست فتح و نصرت نصیب ہوئی اور آہستہ آہستہ اسی طرح یشوعؑ اور بنی اسرائیل لڑتے لڑتے تمام ارضِ مقدس پر قابض ہو گئے اور جابر مشرکوں سے اس کو پاک کر کے ایک مرتبہ پھر اپنے آبائی وطن کے مالک کہلائے۔

توراۃ میں ہے کہ جب بنی اسرائیل جنگ کے لئے تیار ہوئے تو خدا کے حکم سے عہد کا صندوق (تابوتِ سکینہ) ان کے ساتھ تھا، اس میں عصاءِ موسیٰ، پیرہنِ ہارونؑ، اور منّ کا مرتبان بھی تھا اور ان کے علاوہ دوسرے تبرکات بھی تھے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا کہ تم منّ کو محفوظ کر لو، تاکہ تمہاری آئندہ نسلیں بھی مشاہدہ کر لیں کہ تم پر خدا کا انعام ہوا تھا

[۱] یشوع کی کتاب، باب ۱۔ ۵-۱۔

ابنِ اثیر فرماتے ہیں کہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی زندگی ہی میں ارضِ مقدس میں جابر طاقتوں سے مقابلہ کے لئے حضرتِ یوشعؑ کو امیرِ جیش نامزد کر کے بنی اسرائیل کے اسباط کی تقسیم اور ان کے سپہ سالاروں کی نامزدگیاں کر دی تھیں اس لئے حضرتِ یوشعؑ کا یہ معاملہ ٹھیک ٹھیک حضرتِ اسامہ کا سا معاملہ تھا۔ کیوں کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی زندگیِ مبارک ہی میں شام کی تسخیر کے لئے حضرتِ اسامہؓ کو امیر منتخب کیا تھا اور دستِ مبارک سے ان کے لئے جھنڈا بنایا تھا، مگر لشکر ابھی روانہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات ہو گئی اور پھر خلافتِ صدیقی میں یہ ہوا کہ جیشِ اسامہ کو شام کی مہم پر روانہ کیا گیا اور آخر کار یہی مہم روم، ایران اور عراق کی فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

اسی طرح حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے ارضِ مقدس میں جابر طاقتوں کے استیصال کے لئے بحکمِ الٰہی حضرتِ یوشعؑ کو امیرِ جیش بنایا اور جنگ کے ابتدائی مراحل کو خود انجام دیا لیکن جیش کی روانگی سے قبل ہی حضرتِ موسیٰؑ کی وفات ہو گئی اور اب حضرتِ یوشعؑ کو خدائے تعالیٰ نے نبوت سے بھی سرفراز فرما دیا اور ان ہی کے ہاتھوں آخر کار ارضِ مقدس مشرک اور جبار طاقتوں سے پاک ہوئی اور اریحا کی کامیابی تمام ارضِ مقدس کی فتح و نصرت کا پیش خیمہ بنی۔

حضرتِ یوشعؑ نے سب سے پہلے کس شہر کو فتح کیا۔ قرآنِ عزیز نے اس کا نام نہیں بتایا بلکہ "قریہ" کہہ کر مبہم چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے کہ اس واقعہ کے بیان کرنے سے اس کا جو مقصد ہے قریہ کی تعیین کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حافظ عماد الدین کہتے ہیں کہ راجح قول یہ ہے کہ یہ بیت المقدس (یروشلم) ہے اور اریحا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے اس راستہ میں نہیں پڑتا اور نہ خدا نے بنی اسرائیل سے اس کا وعدہ کیا تھا۔ بلکہ بیت المقدس کا وعدہ تھا۔

مگر ہمارے نزدیک اُن کا یہ فرمانا تو صحیح ہے کہ قریہ سے مراد بیت المقدس ہے، لیکن انھوں نے اس سلسلہ میں جو دلائل پیش فرمائے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، اس لئے کہ یہ ایک

ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اگر بنی اسرائیل بیابانِ سینا سے براہِ راست بیت المقدس کا ہی ارادہ کرتے تب بھی خشکی کی راہ سے ارضِ کنعان پہلے پڑتی اور اریحا اس کا پہلا شہر تھا نقشہ سامنے رکھیے اور دیکھیے کہ خشکی کی راہ سے جب کوئی اس زمانہ میں بیابانِ سینا کو عبور کر کے یروشلم جانا چاہے تو اس کو کنعان سے ہی راہ ملے گی۔ نیز بنی اسرائیل سے خدا کا وعدہ یہ تھا کہ وہ اُن کو اُن کے باپ دادا کی سرزمین میں واپس کرے گا اور یہ ظاہر ہے کہ اُن کے باپ دادا کی سرزمین صرف بیت المقدس ہی نہیں ہے، بلکہ ارضِ کنعان بھی ہے، جہاں سے ہجرت کر کے حضرت یوسف و یعقوب (علیہما السلام) کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر میں آکر بسے تھے۔ لہٰذا ابنِ کثیرؒ کے ہر دو دلائل کمزور بلکہ حقیقت کے خلاف ہیں۔ البتہ قریہ سے مراد بیت المقدس ہونا اس لیے صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے یوشع اور بنی اسرائیل نے اریحا میں سب سے پہلے عمالقہ کو شکست دی اور اس کے بعد ارضِ کنعان کو فتح کرتے ہوئے ارضِ فلسطین جا پہنچے اور بیت المقدس کو بھی فتح کرلیا اور چونکہ یہ مقام ان کی فتوحات کا مرکز اور مقصدِ وحید تھا اس لیے جب وہ بھی فتح ہو گیا تو اب اللہ تعالیٰ نے اس عظیم الشان کامیابی پر وہ حکم دیا جس کا ذکر قرآنِ عزیز میں ہے۔

حق ناسپاسی قرآنِ عزیز میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کامیاب کیا اور شہر کے اندر اُن کا فاتحانہ داخلہ ہونے لگا تو اُس نے حکم دیا کہ مغرور اور متکبر انسانوں کی طرح داخل نہ ہونا بلکہ خدا کا شکر ادا کرنے والوں کی طرح درگاہِ الٰہی میں خشوع کے ساتھ جھکتے ہوئے اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے داخل ہونا، تاکہ خدا کے شکر گذار بندوں اور مغرور و سرکش انسانوں کے درمیان امتیاز رہے مگر فتح و نصرت کے بعد بنی اسرائیل کی سرشت غالب آئی اور خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مغرور اور متکبر انسانوں کی طرح بستی میں داخل ہوئے وہ اِتراتے ہوئے سر کو بلند کرتے ہوئے اور اکڑتے ہوئے جا رہے تھے اور استغفار و نیازمندی کی بجائے سوقیانہ الفاظ کہتے ہوئے گویا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے ساتھ ٹھٹول کرتے ہوئے داخل ہو رہے تھے۔ آخر غیرتِ حق کو جوش آیا اور جزاءِ اعمال کے قانونِ الٰہی نے عذاب کی

صورت میں اُن کو آپکڑا۔

قرآنِ عزیز میں اس کو دو جگہ اختصار اور قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: سورۂ بقرہ میں اور سورۂ اعراف میں :-

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ	اور جب ہم نے کہا: اس بستی میں داخل ہو اور اپنی مرضی
فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا	کے مطابق جو چاہو کھاؤ اور شہر کے دروازے میں
وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا	نیازمندی کے ساتھ جھکتے ہوئے داخل ہونا اور یہ
حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ ۚ وَ	کہتے ہوئے جانا "الٰہی ہماری خطاؤں کو معاف فرما"
سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۝ فَبَدَّلَ	ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دیں گے اور عنقریب نکوکاروں
الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي	کو اور زیادہ دیں گے پس ظالموں نے اس قول کو جو اُن
قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ	سے کہا گیا تھا دوسرے قول میں بدل دیا، پس ہم نے
ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا	ظالموں پر ان کی نافرمانی کی وجہ سے آسمان سے
كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ (بقرہ پ۱ ع۶)	سخت عذاب بھیجا۔
وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ اسْكُنُوا هَٰذِهِ	اور پھر اُن سے کہا گیا تم اس بستی میں رہو اور جس طرح
الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ	تمہارا جی چاہے کھاؤ پیو، اور یہ کہتے ہوئے شہر میں
وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ	جاؤ: "اے خدا! ہماری خطاؤں کو محو کر دے" اور شہر
سُجَّدًا نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَاتِكُمْ ۚ	میں نیازمندی کے ساتھ جھکتے ہوئے اور سجدہ ریز ہوکر
سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِينَ	داخل ہو تو ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دیں گے اور عنقریب
ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ	نکوکاروں کو زیادہ دیں گے، پس ظالموں نے اس قول کو
لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِنَ	جو اُن کو بتایا گیا تھا دوسرے قول سے بدل ڈالا، پس
السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ ۝	ہم نے اُن پر آسمان سے عذاب نازل کر دیا اُن کے ظالم
(اعراف پ۹ ع۱۰)	ہونے کی وجہ سے۔

ان آیات میں لفظ حِطَّۃٌ آیا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ اور بنی اسرائیل نے کیا تبدیلِ قول کرلیا تھا؟ یہ دو سوال ہیں جو تشریح طلب ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں أی مغفرۃ استغفروا۔ اور حضرت قتادہ فرماتے ہیں "احطط عنا خطایانا" دونوں کا حاصل یہ ہے کہ یہ کہتے ہوئے داخل ہو "خدایا! ہم کو بخش دے اور ہماری خطاؤں کو محو کردے" گویا حِطَّۃٌ اس طویل عبارت کا اسی طرح مختصر (شارٹ) ہے جس طرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا "بسملہ" اور لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا "حوقلہ" اور لاالٰہ الا اللہ کا "ہلیلہ" مختصر ہے! اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل نے حِطَّۃٌ کی جگہ حبۃٌ فی شعرۃٍ کہنا شروع کردیا۔ یعنی یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے "ہم کو بالوں میں محفوظ دانوں کی ضرورت ہے" گویا اس حکمِ خداوندی کے ساتھ ٹھٹول کرتے تھے، اور سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کی بجائے سرینوں کے بل چل رہے تھے۔ "یزحفون علٰی استاھھم"

روایتِ بخاری کی اس عبارت کا عام طور پر یہ مطلب سمجھا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل سرینوں کے بل زمین پر گھسٹ کر چل رہے تھے، مگر اس صورت میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ مغرورانہ اور متکبرانہ انداز میں چلنے کا یہ طریقہ تو کہیں بھی مروج و معقول نہیں ہے اور اس طرح تو خود کو مذاق اور مضحکہ بنانا ہے نہ کہ دوسروں کے ساتھ ٹھٹول کرنا۔ لہٰذا حدیث کے اس جملہ کی صحیح تفسیر وہ ہے جو حضرتِ عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل شہر میں داخل ہوتے وقت سر جھکائے ہوئے چلنے کے بجائے اکڑتے ہوئے سربلند کرتے ہوئے چل رہے تھے یعنی جس طرح ایک مغرور انسان اکڑتے ہوئے اور مٹکتے ہوئے سرینوں کو حرکت دے دے کر ایک عجب انداز سے چلتا ہے اسی طرح بنی اسرائیل بھی سرینوں کو اُبھارے ان کے بل پر مٹکتے ہوئے داخل ہو رہے تھے۔

بہرحال خدائے تعالیٰ نے ان آیات میں اپنے سچے اور نیازمند بندوں اور متکبر انسانوں کے درمیان ایک امتیاز کردیا ہے کیوں کہ اس کے متواضع اور فرمانبردار بندے کسی سے اپنی

(۲) ۱؎ تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۹۸۔

ذاتی غرض اور ذاتی سربلندی کے لئے نہیں لڑتے بلکہ خدا کے دشمنوں، مفسد اور شریر انسانوں کی شرارت اور ظالم و سرکش قوموں کے ظلم و طغیان کو مٹانے کے لئے صرف اسلئے جنگ کرتے ہیں کہ اس سے عدل و نصفت غلبہ پاتے ہیں اور خدا کا حکم بلند ہوتا ہے اور وہ اس یقین کے ساتھ لڑتے ہیں کہ "اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ" فتنہ و فساد قتل سے بھی زیادہ سخت بُری چیز ہے، لہٰذا جب اُن کو کافروں پر کامیابی نصیب ہوتی ہے تو وہ اپنی مسرت کا اظہار غرور و تمکنت سے نہیں کرتے بلکہ خدا کی جناب میں خشوع و خضوع کے ساتھ سجدہ ریز ہوکر کرتے ہیں اور جب مفتوحہ علاقوں میں داخل ہوتے ہیں تو شکر گزار اور متواضع انسان کی طرح داخل ہوتے ہیں، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ معظمہ کو مشرکین سے پاک کرکے جانب اعلیٰ سے داخل ہونے لگے تو تواضع اور فروتنی کی یہ کیفیت تھی کہ ناقہ پر بیٹھے بیٹھے اس قدر جھکے جارہے تھے کہ ریش مبارک کجاوے کے سرے سے مس کرتی جاتی تھی اور جب حرم میں داخل ہوئے ہیں تو فوراً درگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوگئے اور آٹھ رکعات نمازِ شکر ادا کی۔

یہی حال صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) کا تھا۔ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر جب بیت المقدس فتح ہوا اور حضرتِ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ایران، تو ان عظیم المرتبت فاتحین کا داخلہ متکبر بادشاہوں کی طرح نہیں تھا بلکہ خدا کے متواضع اور منکسر المزاج فرمانبردار بندوں کی طرح تھا اور جب حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ حریم قدس میں اور حضرتِ سعد رضی اللہ عنہ ایوانِ کسریٰ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خدا کی جناب میں سجدہ ریز ہوکر نمازِ شکر ادا کی اور اپنی بندگی اور عاجزی کا عملی اعتراف کیا، وہ لڑتے تھے تو شیرِ نیستاں کی طرح شجاعت اور بہادری کے ساتھ دشمن پر بھاری ہوتے اور جب کامیاب ہوجاتے تو عجز و نیاز کے ساتھ خدا کا شکر بجالاتے اور مخلوقِ خدا کے لئے رحیم و کریم ثابت ہوتے۔

غرض بنی اسرائیل نے اپنے کئے کی سزا پائی، اور عذاب الٰہی کے سزاوار بنے، وہ عذاب کیا تھا؟ قرآنِ عزیز نے اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی، صرف رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ

کہہ کر مبہم چھوڑ دیا ہے اور عبرت و بصیرت کے لئے اسی قدر کافی ہے۔

سورۂ اعراف کے اس جملہ سے " فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ " پس ان میں سے جنھوں نے ظلم سے اس قول کو بدل دیا" یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناسپاسی اور نافرمانی کا یہ مذموم فعل بنی اسرائیل کی پوری جماعت سے سرزد نہیں ہوا تھا بلکہ ان میں سے ایک جماعت وہ تھی جو خدا کے حکم کی فرمانبردار رہی اور جس نے تعمیلِ ارشاد میں حضرتِ یوشع علیہ السلام کا ساتھ دیا۔

بصیرت و عبرت | (۱) حضرتِ یوشعؑ اور بنی اسرائیل کے ان واقعات میں سب سے زیادہ جو بات جاذبِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک انسان کا انسانی اور اخلاقی فرض ہے کہ جب اس کو کسی مصیبت یا امتحان سے نجات ملے اور وہ کامیاب اور فائز المرام ہو کر اپنی مراد کو پہنچے تو غرور و نخوت کے جال میں پھنس کر یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یہ میری ذاتی استعداد و قابلیت کا نتیجہ ہے بلکہ خدائے برتر کا شکر گزار بنے اور اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے سامنے سرِ نیاز جھکا دے تاکہ رحمتِ الٰہی اس کو اپنے دامن میں چھپالے اور دنیا کی طرح آخرت میں بھی وہ بامراد اور شادکام ہو۔

(۲) سخت سے سخت نا اُمیدی کی حالت میں بھی انسان کو خدا سے نا اُمید نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ اگر وہ مظلوم ہے اور ستم رسیدہ، تو خدا کا فضل اس کو بھی محروم نہیں چھوڑتا۔ البتہ دقیق اور دور رس حکمتوں اور مصلحتوں کی وجہ سے تاخیر ضرور ہو جاتی ہے۔

(۳) جس قوم پر خدا کا فضل و احسان اور انعام و اکرام کھلی ہوئی نشانیوں کے ذریعہ ہوتا ہے وہ اگر شکر و اطاعت کی بجائے ناسپاسی اور نافرمانی پر اُتر آتی ہے تو پھر جلد ہی خدا کی بطشِ شدید اور سخت گرفت کا شکار بھی ہو جاتی ہے کیوں کہ اُس کی سرکشی و بغاوت مشاہدہ اور تجربہ کے بعد ہے اور بے شبہ وہ سخت سزا کی مستوجب ہے۔

حضرتِ حزقیل علیہ السلام

• تمہید • نام ونسب اور بعثت • قرآنِ عزیز اور حزقیل (علیہ السلام)
• فرار از جہاد • آیتِ جہاد سے روایت کی تائید • احیاءِ موتیٰ • بصائر

تمہید حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد انبیاء بنی اسرائیل کا طویل سلسلہ ہے جو حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) تک پہنچتا ہے، صدیوں کے اس دور میں کس قدر انبیاء ورسل مبعوث ہوئے، ان کی صحیح تعداد رب العزت ہی جانتا ہے، قرآنِ عزیز نے ان میں سے چند پیغمبروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض کا ذکر تو تفصیل سے آیا ہے اور بعض کا اجمال کے ساتھ اور بعض کا صرف نام ہی مذکور ہے، تورات میں قرآنِ عزیز کی بیان کردہ فہرست پر چند اور پیغمبروں کا اضافہ ہے، اور ان کے واقعات وحالات کا بھی۔

ان اسرائیلی پیغمبروں کے درمیان تاریخی ترتیب اختلافی مسئلہ ہے، ہم ابن جریر طبری اور ابن کثیر کی ترتیب کو راجح سمجھتے ہیں اور اس لئے اُسی کے مطابق ان پیغمبروں کے حالات زیرِ بحث لائیں گے۔

حضرتِ موسیٰ اور حضرتِ ہارون (علیہما السلام) کے بعد باتفاق تورات وتاریخ حضرتِ یوشع (علیہ السلام) منصبِ نبوت پر فائز ہوئے اور ان کے بعد ان کی جانشینی کا حق حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے دوسرے رفیق کالب بن یوحنا نے ادا کیا۔ یہ حضرتِ موسیٰ کی ہمشیر مریم بنت عمران کے شوہر تھے مگر نبی نہیں تھے[1]

طبری کہتے ہیں کہ اُن کے بعد سب سے پہلے جس ہستی نے بنی اسرائیل کی روحانی اور دنیوی

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۔

قیادت وراہنمائی کا فرض انجام دیا وہ حزقیل (علیہ السلام) ہیں۔

نام ونسب اور بعثت | تورات میں ہے کہ وہ بوزی کاہن کے بیٹے ہیں اور ان کا نام حزقی ایل ہے[1] عبرانی زبان میں ایل اسمِ جلالت ہے اور حزقی کے معنی قدرت اور قوت کے ہیں، اس لئے عربی زبان میں اس مرکب نام کا ترجمہ "قدرت اللہ" ہے، کہتے ہیں کہ حضرتِ حزقیلؑ کے والد کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا اور جب ان کی بعثت کا زمانہ قریب آیا تو ان کی والدہ بہت ضعیف اور معمر ہو چکی تھیں، اس لئے اسرائیلیوں میں یہ ابن العجوز[2] کے لقب سے مشہور تھے[3]۔

حضرتِ حزقیل عرصۂ دراز تک بنی اسرائیل میں تبلیغِ حق کرتے اور ان میں دین و دنیا کی راہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے۔

قرآن اور حزقیل علیہ السلام | قرآنِ عزیز میں حزقیل نبی کا نام مذکور نہیں ہے لیکن سورۂ بقرہ میں بیان کردہ ایک واقعہ کے متعلق سلفِ صالحین سے جو روایات منقول ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق حضرتِ حزقیلؑ کے ساتھ ہی ہے۔

کتبِ تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے یہ روایت منقول ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک بہت بڑی جماعت سے جب اُن کے بادشاہ یا اُن کے پیغمبر حزقیل (علیہ السلام) نے یہ کہا کہ فلاں دشمن سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کا فرض ادا کرو تو وہ اپنی جانوں کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور یہ یقین کر کے کہ اب جہاد سے بچ کر موت سے محفوظ ہو گئے ہیں، دور ایک وادی میں قیام پذیر ہو گئے۔

اب یا تو پیغمبر نے ان کے اس فرار کو خدا کے حکم کی خلاف ورزی یا قضاء وقدر کے فیصلہ سے روگردانی سمجھ کر اظہارِ ناراضی کرتے ہوئے اُن کے لئے بددعاء کی اور یا خود اللہ تعالیٰ کو اُن کی یہ حرکت ناگوار ہوئی، بہرحال اس کے غضب نے ان پر موت طاری کر دی اور وہ سب کے سب آغوشِ موت میں چلے گئے۔ ایک ہفتہ کے بعد اُن پر

[1] حزقی ایل کی کتاب۔ بنی اسرائیل کے یہاں کاہن، متبحر عالم و شیخ کامل کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔
[2] بڑھیا کا بیٹا۔ [3] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲

حضرت حزقیل علیہ السلام کا گزر ہوا تو انھوں نے اُن کی اس حالت پر اظہارِ افسوس کیا اور دعاء مانگی کہ الٰہ العٰلمین اُن کو موت کے عذاب سے نجات دے تاکہ اُن کی زندگی خود اُن کے لئے اور دوسروں کے لئے عبرت و بصیرت بن جائے۔ پیغمبر کی دعاء قبول ہوئی اور وہ زندہ ہو کر نمونۂ عبرت و بصیرت بنے۔[1]

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ یہ اسرائیلی جماعت داوردان کی باشندہ تھی جو شہر واسط سے چند کوس پر اس زمانہ کی مشہور آبادی تھی، اور یہ فرار ہو کر اُفیح کی وادی میں چلے گئے تھے، وہیں اُن پر موت کا عذاب نازل ہوا۔

قرآن عزیز میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ	(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا
وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ	جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے ہزاروں کی
اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ	تعداد میں نکلے، پھر اللہ نے فرمایا کہ مرجاؤ پھر ان
فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ	کو زندہ کر دیا، بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل
لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ (بقرہ پ ۲ ع ۱۶)	کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

فرار از جہاد شریعتِ محمدیہ میں بھی میدانِ جہاد سے فرار (شرک باللہ کے بعد) سب سے بڑا گناہ شمار ہوتا ہے اور حقیقتِ حال بھی یہی ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے بعد جبکہ انسان اپنی جان و مال کو اس کے سپرد کر دیتا ہے اور سپردگی ہی کا نام اسلام ہے تو پھر اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ حق نہیں رہتا کہ وہ اس کے حکم کے خلاف جان کو بچانے کی فکر کرے، جبن اور نامردی اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہوتی، اور راہِ حق میں شجاعت ہی اسلام کا طغرائے امتیاز ہے۔

اسی طرح جب انسان کا اذعان و اعتقاد اس یقین کو حاصل کر لے کہ خیر و شر اور موت

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۴۱۳ قدیم و روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۱۳۰ و تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۲۸۲۔

[2] بخاری و مسلم کتاب الایمان و مستدرک جلد ۲ ص ۲۵۹۔

وحیات سب خالقِ کائنات کے قضا و قدر کے ہاتھ ہے تو پھر آنِ واحد کے لئے بھی اس کو خیال نہیں آتا کہ وہ خدا کی مقررہ قدر کے متعلق یہ باور کرے کہ اس کا حیلہ خدا کے فیصلہ کو رد کر سکتا ہے اور ایک مقام پر اگر اس کی تقدیر نافذ ہے تو دوسرے مقام پر وہ اس کے اثر سے آزاد رہ سکتا ہے۔

اسلام کی نگاہ میں تقدیر کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اپنے اندر یہ یقین پیدا کرلے کہ میرا فرض خدا کے احکام کی تعمیل ہے، رہا یہ امر کہ اس اداءِ تعمیل میں جان کا خوف یا مال کی تباہی کا ڈر ہو تو یہ میرے اپنے اختیار میں نہیں ہے اگر قدرت کا ہاتھ جان و مال کی ہلاکت کا فوری فیصلہ کر چکا ہے تو دوسرے اسباب پیدا ہو کر عالمِ تکوین کے اس فیصلہ کو ضرور صادق کر دکھائیں گے، یہی یقین انسان کو شجاع اور بہادر بناتا اور جُبن و نامردی سے دور رکھتا ہے، اس کی نظر صرف اداءِ فرض پر جم جاتی ہے اور وہ تکوینی فیصلوں کو اپنی دسترس سے بالاتر سمجھ کر اُس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اسلام نے تقدیر کے یہ معنی کبھی نہیں بتائے کہ ہاتھ پیر توڑ کر اور جد و جہد اور عمل کی زندگی کو چھوڑ کر غیبی مدد کے منتظر ہو بیٹھو اور اداءِ فرض کو یہ کہہ کر ترک کر دو کہ تکوینی فیصلہ کے مطابق جو کچھ ہونا ہوگا ہو رہے گا۔ دراصل یہ خیال جُبن اور نامردی کی پیداوار ہے جو اداءِ فرض سے روکتا اور تن آسانی کی دعوت دے کر ذلت کے حوالہ کر دیا کرتا ہے۔

آیتِ جہاد سے روایت کی تائید

اِن آیات کے متعلق جو روایت نقل کی گئی ہے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان آیات کے بعد ہی دوسری آیت "آیتِ جہاد" ہے، جس میں مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کیا گیا ہے وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اور اس کی راہ میں جنگ کرو اور چونکہ فریضۂ جہاد سخت جانبازی اور فداکاری کی دعوت دیتا اور موت کے ڈر کو دل سے نکالتا ہے اس لیے یہ مناسب سمجھا گیا کہ پہلے بنی اسرائیل کے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کر دیا جائے جس میں جہاد کے خوف سے بھاگ جانے والوں پر موت کا عذاب مسلط کیا گیا۔

تاکہ وہ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں اور اُن کے قلوب میں شجاعت و بہادری کا جذبہ اور بزدلی و نامردی کے خلاف نفرت پیدا ہو۔

احیاءِ موتیٰ | یہ تمام تصریحات و تفصیلات جمہور کے مسلک کے مطابق کی گئی ہیں۔

ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ احیاءِ موتیٰ کا یہ معاملہ ان لوگوں کی عبرت کے لئے تھا جو قیامت کے دن حشرِ اجساد کے منکر ہیں کیونکہ بنی اسرائیل میں بھی مشرکین کا ایک ایسا گروہ تھا جو حشرِ اجساد کا قائل نہ تھا۔

ہم اگرچہ اس مسئلہ پر گزشتہ صفحات میں بحث کر آئے ہیں لیکن اس مقام پر بھی اس قدر واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب کہ روحانیت (SPIRITUALISM) کے ماہرین کے نزدیک یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ "روح" جسم سے الگ ایک مستقل مخلوق ہے، اور جسم کے گل سڑ جانے اور اس کی عنصری ترکیب کے مٹ جانے کے باوجود روح زندہ رہتی ہے، نیز یہ بھی امرِ معقول ہے کہ جس ہستی نے کسی شے کو ترکیب دیا ہے وہ ترکیب کے بکھر جانے کے بعد دوبارہ اس کو ترکیب دے سکتی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ حیاتِ روح اور بکھرے ہوئے اجزاء کی دوبارہ ترکیب کے معقول ہونے کے بعد احیاءِ موتیٰ کا انکار کیا جائے جو بعض خاص حالات میں نبی اور رسول کی تصدیق اور تائید کے لئے اسی دنیا میں بصورتِ معجزہ عالمِ وجود میں آجاتا ہے۔

اور جن حضرات نے جلدِ اوّل میں معجزہ کی بحث کا مطالعہ فرمایا ہے وہ اس شبہ کا جواب بھی پا سکتے ہیں کہ عالمِ دنیا میں عام قانون کے مطابق اگرچہ دوبارہ زندگی نہیں ملتی اور قیامت ہی کے دن حشرِ اجساد کا واقعہ پیش آئے گا، لیکن خاص قانون کے پیشِ نظر کسی حکمت و مصلحت کی بناء پر ایسا ہونا عقلاً نہ صرف ممکن ہے بلکہ واقع ہوتا رہا ہے۔

لیکن جمہور کے خلاف مشہور تابعی مفسر ابن جریجؒ کہتے ہیں کہ ان آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک تمثیل ہے جو جہاد سے ڈر کر بھاگنے والوں کی عبرت و بصیرت کے لئے قرآن نے بیان

کی ہے کسی واقعہ کا ذکر نہیں ہے جو بنی اسرائیل کی سابق تاریخ میں پیش آیا ہو۔

ہمارے نزدیک جمہور کا قول صحیح ہے اس لئے کہ قرآنِ عزیز کے نظمِ کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات سے پہلے زن وشوہر سے متعلق طلاق کے بعض احکام بیان کئے جا رہے ہیں اور جہاد کا قطعاً کوئی تذکرہ نہیں ہے، البتہ ان آیات کے بعد آیتِ جہاد مذکور ہے۔ پس اگر یہ آیات "جہاد" کی ترغیب و ترہیب کے لئے بطور تمثیل پیش کی گئی ہیں تو بلاغت کے اعتبار سے پہلے جہاد کا حکم مذکور ہوتا اور پھر جہاد سے جی چرانے والوں کے لئے بطور تمثیل اس حقیقت کا اظہار کیا جاتا کہ جہاد سے بھاگنے والوں کا حشر خراب ہوتا ہے مگر یہاں اس کے برعکس ہے، یعنی پہلے تمثیل بیان ہوئی ہے۔ پھر آیتِ جہاد ہے۔

اس لئے صحیح تفسیر یہ ہے کہ جب کلام کا رُخ حکمِ جہاد کی جانب ہوا تو اس سے قبل بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان کیا گیا کہ اگلے وقتوں میں ایک قوم نے جہاد سے روگردانی کر کے خدا کا عذاب مول لیا تھا۔ اور اس کے بعد مخاطبینِ قرآن کو حکم دیا گیا کہ جہاد کے لئے تیار ہو جاؤ، اس طریقِ بیان کا نفسیاتی اثر یہ ہوتا ہے کہ اس حکم کی روگردانی مشکل ہو جاتی اور وساوس وشبہات اور ہواجس وخطرات کا جو ہجوم جان طلبی کے اس اہم موقعہ پر دل پر چھا جاتا ہے وہ مردِ سلیم الطبع سے فوراً کافور ہو جاتا ہے اور پھر وہ خود کو حق کی راہ میں جاں سپاری کے لئے ہر طرح آمادہ پاتا ہے۔

بصائر حضرت حزقیل اور بنی اسرائیل سے متعلق ان آیات میں جو بصیرتیں نمایاں طور پر ہم کو دعوتِ نظر دیتی ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) اگر فطرت سلیم اور طبع مستقیم ہو تو انسان کی ہدایت اور بصیرت کے لئے ایک مرتبہ فکر و ذہن کو حقائق کی جانب متوجہ کر دینا کافی ہے پھر اس کی انسانیت خود بخود راہِ مستقیم پر گامزن ہو جاتی اور منزلِ مقصود کا پتہ لگا لیتی ہے لیکن اگر خارجی اسباب کی بنا پر فطرت میں کجی اور طبیعت میں زیغ پیدا ہو چکا ہو تو اُس کو ہموار کرنے کے لئے اگرچہ بار بار خدا کی

پکار اُس کو بیدار کرتی ہے مگر ہر مرتبہ کے بعد اُس کی صلاحیتیں اور استعدادی قوتیں خفتہ ہو جاتیں بلکہ اور زیادہ غفلت میں سرشار ہو کر رہ جاتی ہیں حتیٰ کہ قوت و استعداد باطل ہو جاتی ہے اور جب اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے جس کا ذکر قرآنِ عزیز نے اس طرح کیا ہے "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" تو پھر اُس پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے اُس کے غضب اور اس کی پھٹکار کا نشانہ بن جاتا اور اُس اعلان کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ چنانچہ بنی اسرائیل کی پیہم سرکشی اور خدا کے فرامین کے مقابلہ میں مسلسل بغاوت نے ان کی کج روی کو اس دوسری راہ پر ڈال دیا تھا اور حضرتِ حزقیل (علیہ السلام) کے دَور میں بھی وہ اسی راہِ بد کی تکمیل میں مصروف تھے مگر ان میں ایک چھوٹی سی جماعت پیغمبروں کی رُشد و ہدایت کے سامنے ہمیشہ سر جھکاتی رہی اور لغزشوں اور خطا کاریوں کے باوجود اس نے راہِ مستقیم کو گرتے پڑتے حاصل کر ہی لیا۔

(۲) جہاد اگرچہ قوم کے بعض افراد کے لئے پیغامِ موت بن کر اُن کو دنیوی لذائذ سے محروم کر دیتا ہے لیکن وہ اُمت اور قوم کے لئے اکسیرِ حیات ہے اور نظامِ قومی و ملّی کے لئے بقاء و دوام کا کفیل اور ساتھ ہی آغوشِ موت میں جانے والے افراد کے لئے فانی اور ناپائدار حیات کے عوض حیاتِ سرمدی عطا کرنے والا ہے، یہی موت کا وہ فلسفہ ہے جس نے مسلمانوں کی زندگی کو دوسری قوموں سے اس طرح ممتاز کر دیا تھا کہ خدا کا کلمہ بلند کرنیوالا انسان حیاتِ دنیوی سے اگر شادکام رہا تو غازی اور مجاہد ہے اور اگر موت کا شربت حلق سے اُتار لیا تو شہید ہے اسی لئے ارشاد ہے :-

لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ	جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ان کو مُردہ نہ کہو
اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ	بلکہ حقیقی حیات تو اُن ہی کو حاصل ہے لیکن
لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ (بقرہ پ ۲ ع ۳)	تم اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہو۔

اور اسی لئے اس زندگی سے جان چُرانے والے کے لئے یہ وعید ہے:-

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا	اور جو کوئی اس روز (جہاد کے روز) ان (کافروں) کو
مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى	اپنی پیٹھ دے گا، سوائے اس شخص کے جو لڑائی کی جانب واپس
فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ	آنیوالا ہو یا اپنی جماعت میں پناہ تلاش کرنیوالا ہو وہ اللہ کے
وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ	غضب کی طرف لوٹا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُری
(انفال پ ع)	جگہ ہے۔

(۳) اسلام، شجاعت کو خُلقِ حسن قرار دیتا اور بزدلی کو اخلاقِ ردیہ میں شمار کرتا ہے۔ ایک حدیث میں مختلف اعمالِ بد کو شمار کراتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی لغزش اور خطا کی راہ سے ان اعمال کا صدور ممکن ہے۔ لیکن اسلام کے ساتھ جُبن (بزدلی) کسی حال میں بھی جمع نہیں ہو سکتی، مگر یاد رہے کسی پر بیجا قوت آزمائی کا نام شجاعت نہیں ہے، بلکہ امرِ حق پر قائم ہو جانا اور باطل سے بے خوف بن جانا شجاعت ہے۔

حضرتِ الیاس علیہ السلام

• تمہید • نام • نسب • قرآن اور حضرتِ الیاسؑ • بعثت
• قومِ الیاسؑ اور بعل • تفسیری نکتہ • موعظت

تمہید | گزشتہ صفحات میں یہ واضح ہوچکا کہ حضرتِ موسیٰ وہارون (علیہما السلام) کے بعد قرآنِ عزیز میں اُن کے ابتدائی جانشینوں کے نام مذکور نہیں، حضرتِ یوشعؑ کا دو جگہ ذکر آیا۔ مگر ایک جگہ "فتیٰ" (جوان) یعنی صاحبِ موسیٰؑ کہہ کر تذکرہ کیا اور دوسری جگہ یعنی مائدہ میں حضرتِ یوشعؑ اور کالب بن یوفنا کو "رجلان" دو اشخاص کہہ کر تذکرہ کیا ہے اور حضرتِ حزقیلؑ کا ذکر جمہور کی روایت کے مطابق صرف قصہ کے ضمن ہی میں آتا ہے ورنہ آیت میں کسی صفت کے ساتھ بھی اُن کا تذکرہ موجود نہیں ہے۔ سب سے پہلے جس نبی اور پیغمبر کا ذکر حضرتِ موسیٰ اور حضرتِ ہارون (علیہما السلام) کے بعد قرآنِ عزیز میں صراحت کے ساتھ موجود ہے، وہ حضرتِ الیاس (علیہ السلام) ہیں، یہ حضرتِ حزقیلؑ کے جانشین اور بنی اسرائیل میں ایلیا کے نام سے مشہور ہیں۔

نام | قرآنِ عزیز نے اُن کا نام الیاس بتایا ہے اور انجیل یوحنا میں ان کو ایلیاہ نبی کہا گیا ہے، بعض آثار میں ہے کہ الیاس اور ادریس ایک نبی کے دو نام ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے، اوّل تو ان آثار کے متعلق محدثین کو کلام ہے اور وہ ان کو ناقابلِ حجت قرار دیتے ہیں[1] دوسرے قرآن عزیز کا اندازِ بیان بھی ان آثار کی تردید کرتا ہے، اس لئے کہ اُس نے انعام

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۱- ص ۲۳۷ - ۲۳۹ -

اور والصّافات میں حضرت الیاسؑ کے جو اوصاف وحالات قلم بند کئے ہیں ان میں کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں ملتا کہ اُن کو ادریس بھی کہتے ہیں اور سورۂ انبیاء میں ادریس علیہ السلام کا جس آیت میں تذکرہ ہے اس میں بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا کہ جس سے ان دونوں پیغمبروں کے اوصاف وحالات کی مشابہت پر بھی استدلال کیا جا سکے چہ جائیکہ ان حالات کو صرف ایک ہی شخصیت سے متعلق سمجھ لیا جائے۔

علاوہ ازیں مؤرخین نے حضرت ادریسؑ کا جو نسب نامہ بیان کیا ہے وہ اس نسب نامے سے قطعًا جدا ہے جو حضرت الیاسؑ سے متعلق ہے اور اس لحاظ سے دونوں کے درمیان صدیوں کا بُعد ہو جاتا ہے۔ پس اگر یہ دونوں نام ایک ہی پیغمبر کے ہوتے تو قرآن عزیز ضرور اس جانب اشارہ کرتا اور مؤرخین ضرور ہر دو نسب ناموں کی وحدت کسی دلیل سے بیان کر سکتے۔ اس لیے صحیح یہ ہے کہ حضرت ادریس حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیم (علیہما السلام) کے درمیانی دَور کے پیغمبر ہیں، اور حضرت الیاسؑ اسرائیلی نبی ہیں اور حضرت موسٰیؑ کے بعد مبعوث ہوئے ہیں، چنانچہ طبری کہتے ہیں کہ یہ حضرت الیسع (علیہ السلام) کے چچازاد بھائی تھے اور یہ کہ ان کی بعثت حزقیلؑ نبی کے بعد ہوئی ہے۔

نسب بیشتر مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت الیاسؑ، حضرت ہارون (علیہ السلام) کی نسل سے ہیں اور اُن کا نسب نامہ یہ ہے: الیاس بن یاسین بن فنحاص بن یعزار بن ہارون یا الیاس بن عازر بن یعزار بن ہارون (علیہ السلام)

قرآنِ عزیز اور حضرتِ الیاسؑ قرآنِ عزیز میں حضرت الیاسؑ کا ذکر دو جگہ آیا ہے، سورۂ انعام میں اور سورۂ والصّافات میں۔ سورۂ انعام میں تو اُن کو صرف انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں شمار کیا ہے، اور والصّافات میں بعثت اور قوم کی ہدایت سے متعلق حالات کو مختصر طور پر بیان کیا ہے:۔

سورۂ انعام: آیت ۸۵ - شمارہ ۱ سورۂ والصّافات: آیت ۱۲۳-۱۳۱ - شمارہ $\frac{9}{10}$

بعثت حضرتِ الیاس (علیہ السلام) کی بعثت کے متعلق مفسّرین اور مؤرخین کا اتفاق ہے کہ وہ شام کے باشندوں کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے اور بعلبک کا مشہور شہر اُن کی رسالت وہدایت کا مرکز تھا۔

حضرتِ الیاسؑ کی قوم مشہور بت بعل کی پرستار اور توحید سے بیزار، شرک میں مبتلا تھی. خدا کے برگزیدہ پیغمبر نے ان کو سمجھایا اور راہِ ہدایت دکھائی۔ صنم پرستی اور کواکب پرستی کے خلاف وعظ وپند کرتے ہوئے توحیدِ خالص کی جانب دعوت دی۔

قومِ الیاسؑ اور بعل یہ مشرق میں آباد سامی اقوام کا مشہور اور سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا۔ یہ بت مذکر تھا اور زُحل یا مشتری کا مثنیٰ سمجھا جاتا تھا۔

فینیقی، کنعانی، موآبی اور مدیانی قبائل خاص طور پر اس کی پرستش کرتے تھے اس لئے بعل کی پرستش عہدِ قدیم سے چلی آتی تھی اور موآبی اور مدیانی اس کو حضرت موسٰی (علیہ السلام) کے عہد سے پوجتے چلے آتے تھے چنانچہ شام کا مشہور شہر بعلبک بھی اسی کے نام سے منسوب تھا اور حضرتِ شعیب کو مدین میں اسی کے پرستاروں سے واسطہ پڑا تھا، بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ حجاز کا مشہور بت ہُبل بھی یہی بعل ہے۔

بعل دیوتا کی عظمت کا یہ حال تھا کہ وہ مختلف مربیانہ عطاء ونوال کی وجہ سے مختلف ناموں کے ساتھ موسوم تھا، چنانچہ تورات میں سامی قوموں کی پرستشِ بعل کا ذکر کرتے ہوئے بعل کو بعلِ بریث اور بعلِ فغور کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے اور عقرونیوں کے یہاں بعلزبوب کا اور اضافہ پایا جاتا ہے، کلدانیوں کے یہاں بِعل باء کے زیر کے ساتھ بولا جاتا ہے اور وہ اکثر بیل اور بیلوس یا بعل اور بعلوس بھی کہتے ہیں۔

سامی اور عبرانی زبانوں میں بعل کے معنی مالک، سردار، حاکم اور ربّ کے آتے ہیں اسی لئے اہلِ عرب شوہر کو بھی "بعل" کہتے ہیں، لیکن جب بعل پر الف لام لے آتے ہیں یا کسی شئے کی جانب اضافت کرکے بولتے ہیں تو اُس وقت فقط دیوتا اور معبود مراد ہوتا ہے۔

یہود یا مشرقی اسرائیلیوں کے یہاں بعل کی پرستش کے لئے مختلف موسموں میں عظیم الشان مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں اور اس کے لئے بڑے بڑے ہیکل اور عظیم الشان قربانگاہیں بنائی جاتی تھیں اور کاہن اس کو بخورات کی دھونی دیتے اور اس پر طرح طرح کی خوشبوئیں چڑھاتے تھے اور کبھی کبھی اس کو انسانوں کی بھینٹ بھی دی جاتی تھی[1]۔

کتب تفسیر میں منقول ہے کہ بعل سونے کا تھا۔ بیس گز کا قد تھا اور اس کے چار منہ تھے اور اس کی خدمت پر چار سو خادم مقرر تھے[2]۔

حضرت الیاسؑ کے زمانہ میں بھی یمن و شام کا یہ بت ہی محبوب دیوتا تھا اور حضرت الیاسؑ کی قوم دوسرے بتوں کے ساتھ خصوصیت سے اس بت کی پرستش کرتی تھی۔ چنانچہ اسی تقریب سے قرآن عزیز میں اس کا ذکر آیا ہے :۔

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝	اور بے شبہ الیاسؑ رسولوں میں سے ہیں اور وہ وقت
اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝	ذکر کے قابل ہے جب اس نے اپنی قوم سے کہا، کیا
اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ	تم خدا سے نہیں ڈرتے، کیا تم بعل کو پکارتے ہو، اور
الْخَالِقِيْنَ ۝ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ	سب سے بہتر خدا کو چھوڑے ہوئے ہو، اللہ جو تمہارا
الْاَوَّلِيْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ	اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا پروردگار ہے، پس
لَمُحْضَرُوْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ	انہوں نے الیاسؑ کو جھٹلایا تو بے شبہ وہ لائے جائیں گے
الْمُخْلَصِيْنَ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝	پکڑے ہوئے بجز اُن کے جو چن لئے گئے ہیں اور ہم نے
سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ	بعد کے لوگوں میں الیاسؑ کا ذکر باقی رکھا، الیاسؑ پر
نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ	سلام ہو، بے شبہ ہم نکوکاروں کو اسی طرح بدلہ دیا
عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الصافات پ ۲۳)	کرتے ہیں بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہے۔

---

[1] دائرۃ المعارف البستانی۔ جلد ۵۔

[2] روح المعانی جلد ۲۳ ص ۶۲۷۔

تفسیری نکتہ | سورۂ انعام میں حضرت الیاسؑ کا جن آیات کے اندر ذکر آیا ہے وہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم (علیہما السلام) کی ذریت اور ان کی نسل کے انبیاء و رُسل کی ایک مختصر فہرست ہے۔ ارشاد ہے :-

كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ	ہم نے (ان میں سے) ہر ایک کو ہدایت عطا کی اور
قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَٰنَ	نوح کو ہدایت بخشی ان سے پہلے اور ابراہیم کی نسل میں سے
وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَٰرُونَ ۚ	داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون
وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ وَزَكَرِيَّا	کو بھی یہی راہ دکھائی اور ہم اس طرح نیک کرداروں
وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ ۖ كُلٌّ مِّنَ	کو نیکی کا بدلہ دیتے ہیں اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور
الصَّٰلِحِينَ ۝ وَإِسْمَٰعِيلَ وَالْيَسَعَ	الیاس کو بھی یہ سب صالح انسانوں میں سے تھے
وَيُونُسَ وَلُوطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا	اور اسمٰعیل، اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی ان
عَلَى الْعَٰلَمِينَ ۝ (انعام پ ۷ ع ۱۰)	سب کو ہم نے دنیا والوں پر برتری دی تھی۔

قرآن عزیز نے اس فہرست میں انبیاء علیہم السلام کو تین جدا جدا حلقوں میں بیان کیا ہے، اس کی حکمت کیا ہے؟ اکثر مفسرین اس کے انکشاف پر متوجہ ہوئے ہیں، ان تمام اقوال میں سب سے بہتر توجیہی قول صاحبُ المنار کا ہے جس کا حاصل یہ ہے :

اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر انبیاء و رُسل کو تین جدا جدا جماعتوں میں اس لئے بیان فرمایا ہے کہ انبیاءِ بنی اسرائیل میں خصوصی امتیازات کے پیشِ نظر تین قسم کی جماعتیں تھیں، بعض انبیاء علیہم السلام وہ تھے جو صاحبِ تخت و تاج اور صاحبِ حکومت تھے یا وزارت و سرداری کے مالک تھے اور بعض انبیاء علیہم السلام کی زندگی اس کے برعکس زاہدانہ اور راہبانہ تھی اور دولت و ثروت سے یکسر نفور فقیرانہ معیشت کے حامل تھے اور بعض نہ تو اپنی قوم میں حاکم اور صاحبِ تاج و تخت تھے اور نہ خالص راہبانہ زندگی کے حامل، بلکہ ایک طرف قوم کے ہادی و پیغمبر تھے اور دوسری جانب متوسط معیشت سے وابستہ، لہٰذا جب

قرآنِ عزیز نے ان انبیاء و رسل کا ذکر کیا تو ان کے زمانہائے بعثت اور بعض دوسری خصوصیات میں مشابہت سے الگ ہو کر اسی نقطۂ نظر سے اُن کو تین جماعتوں میں تقسیم کر دیا اور پھر ترتیبِ درجات کے لحاظ سے ترتیبِ ذکر کو بھی ضروری سمجھا یعنی پہلی فہرست میں اوّل حضرتِ داؤدؑ اور حضرتِ سلیمانؑ کا ذکر کیا جو نبی و رسول ہونے کے علاوہ صاحبِ مملکت بھی تھے اور اس کے بعد حضرتِ ایوبؑ اور حضرتِ یوسفؑ کا تذکرہ کیا جو اگرچہ صاحبِ مملکت نہ تھے مگر اوّل الذکر چھوٹی سی ریاست کے مالک تھے اور ثانی الذکر حکومتِ مصر کے وزیر اور مختارِ کل تھے اور اس کے بعد حضرتِ موسیٰؑ اور ہارونؑ کا نام آیا جو نہ بڑی حکومت کے مالک تھے اور نہ چھوٹی ریاست کے مالک یا کسی حکومت کے وزیر اور مختارِ کل بلکہ اپنی قوم کے رسول اور پیغمبر بھی تھے اور ان کے سردار بھی!

اور دوسری فہرست میں ان انبیاءِ کرام کا تذکرہ ہے جنھوں نے ساری عمر زہادت میں گذاری، انھوں نے نہ رہنے کو مکان بنایا اور نہ کھانے پینے کا سامان فراہم کیا۔ دن بھر تبلیغ حق میں مصروف رہتے اور شب کو یادِ الٰہی کے بعد جہاں جگہ میسر آجاتی ہاتھ کا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سو رہتے، حضرتِ یحییٰ، زکریا، عیسیٰ اور الیاس علیہم السّلام اس سلسلہ میں بہت مشہور اور ممتاز ہیں۔

اور تیسری فہرست میں ان پیغمبروں کا مذکور ہے جنھوں نے نہ حکومت و سرداری کی اور نہ خالص زہادت اختیار کی بلکہ متوسط زندگی سے وابستہ رہ کر حقِ تبلیغ و ریاست ادا کیا، چنانچہ حضرتِ اسمٰعیل، الیسع، یونس اور لوط علیہم السّلام اسی درمیانی زندگی کے حامل تھے۔

موعظت | حضرتِ الیاسؑ اور اُن کی قوم کا واقعہ اگرچہ قرآن میں بہت مختصر مذکور ہے۔ تاہم اس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ یہودِ بنی اسرائیل کی ذہنیت اس درجہ مسخ تھی کہ دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں تھی جس کے کرنے پر یہ حریص نہ ہوں اور کوئی خوبی ایسی نہ تھی جس کے یہ دلدادہ ہوں، اور انبیاء و رسل کے ایک طویل اور پیہم سلسلہ کے باوجود بت پرستی، عناصر پرستی، کواکب پرستی، غرض غیر اللہ کی پرستش کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کے یہ پرستار

نہ بنے ہوں۔

پس قرآنِ عزیز میں بنی اسرائیل سے متعلق ان واقعات میں جہاں اُن کی بدبختی اور کج روی پر روشنی پڑتی ہے وہیں ہم کو یہ موعظت وعبرت بھی حاصل ہوتی ہے کہ اب جبکہ انبیاء و رُسل کا سلسلہ منقطع ہو چکا اور خاتم النبیین کی بعثت اور قرآنِ عزیز کے آخری پیغام نے اس سلسلہ کو ختم کر دیا ہے تو ہمارے لئے ازبس ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کی مسخ فطرت اور تباہ ذہنیت کے خلاف خدائی احکام کو مضبوطی سے پکڑیں اور اُن میں کجروی اور زیغ سے کام لے کر ان کی خلاف ورزی کی جرأت نہ کریں، گویا ہمارا شیوہ سپردو تسلیم ہو، انکار و انحراف نہ ہو کہ "اسلام" کے یہی اور صرف یہی معنی ہیں۔



حضرتِ الیسع علیہ السلام

• نام ونسب • بعثت • قرآن اور حضرتِ الیسعؑ

نام ونسب وہب بن منبہؒ کی اسرائیلی روایات میں ہے کہ ان کا نام الیسع ہے اور یہ خطوب کے بیٹے ہیں، ابنِ اسحٰق نے اسی کو اختیار کیا ہے، کتبِ تواریخ میں یہ بھی منقول ہے کہ حضرتِ الیسعؑ حضرتِ الیاسؑ کے چچازاد بھائی ہیں، اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں اُن کے نسب کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ حضرتِ یوسفؑ بن یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہیں اور نسب نامہ اِس طرح ہے:

الیسع بن عدی بن شوتم بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم (علیہم السلام) اور اگر توراۃ کے یسعیاہ نبی اور حضرتِ الیسعؑ ایک ہی شخصیت ہیں تو توراۃ نے ان کو عموص کا بیٹا بتایا ہے۔

بعثت حضرتِ الیسع علیہ السلام حضرتِ الیاس علیہ السلام کے نائب اور خلیفہ ہیں۔ اوائلِ عمر میں ان ہی کی رفاقت میں رہتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لئے حضرتِ الیسعؑ کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور انھوں نے حضرتِ الیاسؑ ہی کے طریقہ پر بنی اسرائیل کی راہنمائی فرمائی۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ حضرت الیسعؑ کی عمرِ مبارک کیا ہوئی اور بنی اسرائیل میں کتنے عرصہ تک انھوں نے حقِ تبلیغ ادا کیا۔

قرآن اور حضرتِ الیسعؑ قرآنِ عزیز نے اُن کے حالات پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی اور سورۂ انعام اور سورہ صٓ میں صرف ذکر پر اکتفا کیا ہے:

وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ	اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس
وَلُوْطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى	اور لوط اور ان سب کو ہم نے دنیا والوں
الْعٰلَمِيْنَ (انعام پ ع)	پر فضیلت عطا فرمائی۔
وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَ	اور ذکر کرو اسمٰعیل اور الیسع اور ذوالکفل کا
ذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ	اور ان میں سے ہر ایک نیک انسانوں
(ص پ ع)	میں سے تھے۔

موعظت | بنی اسرائیل کے اُن نبیوں اور پیغمبروں کے واقعات سے جو کہ جلیل القدر انبیاء علیہم السّلام کے شرفِ صحبت اور مخلصانہ اتباع میں خلافت کے بعد منصب نبوّت سے سرفراز ہوئے، یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحبتِ نیکاں حصولِ خیر کے لئے اکسیرِ اعظم ہے۔ رومی نے سچ کہا ہے:۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاء
بہتر از صد سال طاعت بے ریا

اگر ریاضات وطاعات کا سلسلہ ہزاروں سال بھی رہے مگر کسی کامل کی صحبت سے محرومی ہو تو بے شبہ یہ ایک بہت بڑی خامی ہے، جس کا مداوا صحبتِ کامل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔



حضرتِ شمویل علیہ السلام

• بنی اسرائیل کی گزشتہ تاریخ پر طائرانہ نظر • نام اور نسب • قوم میں دعوت و تبلیغ • قوم کا مطالبہ • حضرتِ شمویلؑ کی تنقید • بنی اسرائیل کا امیرِ حکومت • قرآنِ عزیز اور بنی اسرائیل • طالوت و جالوت • بصائر و حِکَم

بنی اسرائیل کی گزشتہ تاریخ پر طائرانہ نظر

حضرتِ یوشع (علیہ السلام) کے زمانہ میں بنی اسرائیل جب سرزمینِ فلسطین میں داخل ہو گئے تو انھوں نے خدا کے حکم سے اُن کے درمیان اس علاقہ کو تقسیم کر دیا تاکہ وہ امن و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں اور دینِ حق کے لئے سرگرمِ عمل رہیں۔ تورات یشوع باب ۲۳ میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ منقول ہے۔

حضرتِ یوشع (علیہ السلام) آخر عمر تک اُن کی نگرانی اور اصلاحِ حال میں مصروف رہے اور اُن کے معاملات اور باہمی مناقشات کے فیصلوں کے لئے "قاضیوں" کو مقرر کیا تاکہ وہ آئندہ بھی اسی طرح اپنا نظام قائم رکھیں۔

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی وفات سے تقریباً ساڑھے تین سو سال تک یہ نظام یوں ہی قائم رہا کہ خاندانوں اور قبیلوں میں "سردار" حکومت کرتے اور اُن کے مناقشات و معاملات کے فیصلے "قاضی" انجام دیتے تھے اور "نبی" ان تمام اُمور کی نگرانی کے ساتھ ساتھ دین کی دعوت و تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت کی خدمت سر انجام دیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بفضلِ ایزدی ان ہی میں سے کسی قاضی کو منصبِ نبوت عطا ہو جاتا اور اس تمام

عرصہ میں بنی اسرائیل کا نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ تمام قوم کا ایک حکمراں اور اسی لئے ہمسایہ قومیں اکثر اُن پر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں اور بنی اسرائیل اُن کا نشانہ بنتے رہتے تھے[1] کبھی عمالقہ چڑھ آتے اور کبھی فلسطینی، کبھی مدیانی حملہ آور ہوتے تو کبھی آرامی اور اُن میں سے اگر حملہ آور کو ہزیمت بھی ہو جاتی تو بھی وہ آئے دن چھاپے مارتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا کہ کبھی یہ فتح پا جاتے اور کبھی وہ غالب آجاتے۔

چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں عیلی کاہن کے زمانہ میں اشدود حوالی غزہ کی فلسطینی قوم نے اُن پر زبردست حملہ کیا اور شکست دے کر متبرک صندوق "تابوتِ سکینہ" بھی چھین کر لے گئے۔ اس متبرک صندوق میں تورات کا اصل نسخہ، حضرتِ موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کے عصا، اور پیرہن اور مَن کا مرتبان محفوظ تھے، فلسطینیوں نے اس کو اپنے مشہور مندر بیتِ دجون میں رکھ دیا۔ یہ مندر اُن کے سب سے بڑے دیوتا "دجون" کے نام سے موسوم تھا۔ دجون کا جسم انسانی چہرہ اور مچھلی کے دھڑ سے مرکب بنایا گیا تھا اور اسی مندر میں نصب تھا۔ نجار مصری کہتے ہیں کہ فلسطین کے مشہور رملہ کے قریب آج بھی ایک بستی بیتِ دجون کے نام سے پائی جاتی ہے، غالب گمان یہ ہے کہ تورات میں دجون کے جس مندر کا ذکر ہے وہ یہیں واقع ہوگا اور اسی نسبت سے بستی کا نام بھی بیتِ دجون رکھا گیا۔[2]

نام و نسب | عیلی کاہن کا زمانہ ختم ہو چکا تھا کہ قضاۃ میں سے ایک قاضی شمویل کو منجانب اللہ منصبِ نبوت عطا ہوا اور وہ بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لئے مامور ہوئے۔

بعض آثار میں مذکور ہے کہ جب حضرتِ الیسع (علیہ السلام) کی وفات ہو گئی تو مصر و فلسطین کے درمیان بحرِ روم پر آباد عمالقہ میں سے جالوت نامی جابر و ظالم حکمراں نے

---

[1] قضاۃ باب ۲ آیات ۶-۷ و قضاۃ باب ۲۱- آیات ۲۵ - [2] قصص الانبیاء۔

بنی اسرائیل کو مغلوب کر کے اُن کی آبادیوں پر قبضہ کر لیا اور اُن کے بہت سے سرداروں اور قبیلہ کے معزز لوگوں کو گرفتار کر کے ساتھ لے گیا اور باقی کو مقہور و مغلوب کر کے اُن پر خراج مقرر کر دیا اور تورات کو بھی فنا کر دیا۔ بنی اسرائیل کے لئے یہ ایسا نازک دور تھا کہ نہ کوئی نبی و رسول ان میں موجود تھا اور نہ سردار و امیر اور خاندانِ نبوّت میں ایک حاملہ عورت کے علاوہ کوئی باقی نہ تھا مگر اس نکبت و ادبار کی حالت میں خدائے تعالیٰ نے اُن پر فضل و کرم فرمایا اور اس عورت کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا اس کا نام شمویل رکھا گیا اور اس کی تربیت کا بار بنی اسرائیل کے ایک بزرگ نے اپنے ذمہ لیا۔ شمویلؑ نے اُن سے تورات حفظ کی اور دینی تعلیم کے مدارج طے کئے اور جب سنِ رُشد کو پہنچے تو تمام بنی اسرائیل میں ممتاز اور نمایاں نظر آنے لگے، آخر اللہ تعالیٰ نے اُن کو منصبِ نبوّت سے سرفراز فرمایا اور بنی اسرائیل کی رُشد و ہدایت پر مامور کیا۔[1]

مؤرخین کہتے ہیں کہ شمویلؑ حضرت ہارون (علیہ السلام) کی نسل سے ہیں۔[2] اور اُنکا نسب نامہ یہ ہے:۔

شمویل بن حنہ بن عاقر۔[3] عاقر سے اوپر کی کڑیاں مذکور نہیں ہیں اور مقاتل کی روایت کے مطابق یہ اضافہ ہے اشمویل بن بالی بن علقمہ بن یرخام بن یہو بن تہو بن صوف بن علقمہ بن ماحث بن عموص بن عزریا۔[4]

اشمویل عبرانی ہے اور عربی میں اس کا ترجمہ اسمٰعیل ہوتا ہے اور کثرتِ استعمال سے اشمویل شمویل رہ گیا۔

بہرحال جب شمویل (علیہ السلام) کے زمانہ میں بھی عمالقہ کی دست برد اور ظالمانہ شرارتیں اسی طرح جاری رہیں تو بنی اسرائیل نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہم پر ایک بادشاہ (حاکم) مقرر کر دیں جس کی قیادت میں ہم ظالموں کا مقابلہ کریں اور جہاد

---

[1] روح المعانی جلد ۲ ص ۱۴۲۔ [2] خازن جلد ۲۔ [3] روح المعانی جلد ۲ ص ۱۴۲۔ [4] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۵۔

فی سبیل اللہ کے ذریعہ دشمنوں کی لائی ہوئی مصیبت کا خاتمہ کردیں۔ تورات میں بنی اسرائیل کے اس مطالبہ کی کہ "ہم پر ایک سلطان مقرر کر دیجئے" وجہ یہ بیان کی ہے :

اور ایسا ہوا کہ جب سموئیل بوڑھا ہو گیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو مقرر کیا کہ اسرائیل کی عدالت کریں۔ اور اس کے پہلوٹے کا نام یوایل تھا اور اس کے دوسرے بیٹے کا نام ابیاہ۔ وہ دونوں بیرسبع میں قاضی تھے پر اس کے بیٹے اس کی راہ پر نہ چلے بلکہ نفع کی پیروی کرتے اور رشوت لیتے اور عدالت میں طرفداری کرتے تھے۔ تب سارے اسرائیلی بزرگ جمع ہو کے رامہ میں سموئیل کے پاس آئے اور اسے کہا دیکھ تو بوڑھا ہوا اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے، اب کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر جو ہم پر حکومت کیا کرے، جیسا کہ سب قوموں میں ہے۔[1]

اور آگے چل کر لکھا ہے کہ سموئیل کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور انھوں نے فرمایا کہ اگر تم پر بادشاہ مقرر ہو گیا تو وہ سب کو اپنا خادم اور غلام بنا لے گا۔ لیکن بنی اسرائیل کا اصرار بڑھتا ہی رہا اور آخر سموئیل نے خدا سے دعا مانگ کر بنیامین کی نسل میں سے ساؤل (طالوت) نامی ایک شخص کو بادشاہ مقرر کر دیا جو نہایت وجیہ و شکیل اور قوی ہیکل تھا۔

ثعلبی نے طالوت کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے: ساول بن قیش بن افیل بن صار بن تحورت بن افیح بن انیس بن بنیامین بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم[2]

لیکن قرآنِ عزیز نے بنی اسرائیل کے اس مطالبہ پر حضرتِ سموئیل (علیہ السلام) کا جو جواب نقل کیا ہے وہ اس سے جُدا اور بنی اسرائیل کی عادات و خصائل کے عین مطابق ہے۔

قرآنِ عزیز میں ہے کہ جب بنی اسرائیل نے حضرتِ سموئیل (علیہ السلام) سے بادشاہ کے تقرر کا مطالبہ کیا تو انھوں نے ارشاد فرمایا :

مجھے یہ خوف ہے کہ ایسا نہ ہو جب تم پر کوئی بادشاہ مقرر کر دیا جائے اور وہ تم کو دشمنوں کے مقابلہ کے لئے "جہاد" کا حکم دے تو تم بزدل ثابت ہو اور جہاد سے انکار کر جاؤ۔

---

[1] سموئیل باب ۸ آیات ۲۴-۶ و باب ۹۔ [2] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۶۔

بنی اسرائیل نے بڑی قوت کے ساتھ جواب دیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جہاد سے انکار کر دیں جبکہ ہم یہ خوب جانتے ہیں کہ ہم کو دشمنوں نے بہت زیادہ ذلیل کر دیا ہے انھوں نے ہم کو ہمارے گھروں سے نکالا اور ہماری اولاد کو قید کیا۔

جب حضرتِ سموئیل (علیہ السّلام) نے اتمامِ حجّت کر لیا تو اب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کیا۔ حق تعالیٰ نے اُن کو مطلع فرمایا کہ بنی اسرائیل کی درخواست منظور ہوئی اور ہم نے طالوت کو جو علمی اور جسمانی دونوں لحاظ سے تم میں نمایاں ہے، تم پر بادشاہ مقرر کر دیا۔ بنی اسرائیل نے جب یہ سُنا تو مُنہ بنانے لگے اور ناگواری سے کہنے لگے "یہ شخص تو غریب ہے مالدار تک نہیں ہے۔ یہ کس طرح ہمارا بادشاہ ہو سکتا ہے، اور در اصل بادشاہت کے لائق تو ہم ہیں، ہم میں سے کسی کو مقرر کیجئے۔"

مؤرخین کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک عرصہ سے نبوت کا سلسلہ سبط لاوی میں اور حکومت و سرداری کا سلسلہ سبطِ یہودا میں چلا آتا تھا تو اب جبکہ سموئیل (علیہ السّلام) کے ارشاد کے مطابق یہ شرف بنیامین کی نسل میں منتقل ہونے لگا تو بنی اسرائیل کے ان سرداروں کو حسد پیدا ہوا، اور وہ اُس کو برداشت نہ کر سکے۔

شروع میں کسی بات کے اقرار کر لینے اور وقت پر انکار کر دینے کی یہ ادا بنی اسرائیل کی زندگی کا طغرائے امتیاز بن چکی تھی، اس لئے یہاں بھی کارفرما رہی، کیونکہ وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ سموئیل (علیہ السّلام) کی نظرِ انتخاب بہرحال ہم ہی میں سے کسی پر پڑے گی۔ اس لئے جب انھوں نے خلافِ توقع بنیامین کے گھرانے میں سے ایک غریب مگر قوی اور عالم انسان کو اس منصب پر مامور دیکھا تو حسد کی آگ بھڑک اُٹھی اور رد و کد شروع کر دی۔

حضرتِ سموئیل نے بنی اسرائیل کے معترضین اور نکتہ چین سرداروں کی نکتہ چینی کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تمہاری پستی اور بزدلی تمہارے وقتی جوش اور ولولہ کو بھی

پائیدار اور مستقل نہیں رہنے دے گی اور وقت آنے پر تمہاری یہ گرم جوشی برف کی طرح سرد ہو کر رہ جائے گی، چنانچہ تم نے اب اسی لئے حیلہ جوئی شروع کر دی، تم کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حکمرانی کا جو معیار تم نے سمجھ لیا ہے یعنی وسعتِ مال اور کثرتِ دولت تو یہ قطعاً غلط اور سرتاسر باطل ہے۔

خدائے تعالیٰ کے نزدیک حکمراں کے ذاتی اوصاف میں قوتِ علم اور طاقتِ جسم ضروری ہیں، اس لئے کہ یہی ہر دو وصف حسنِ تدبیر صحتِ فکر اور جرأت و شجاعت کے کفیل ہیں اور ان اوصاف میں طالوت (ساؤل) تم سب میں ممتاز اور نمایاں ہے۔

قرآنِ عزیز کی آیاتِ ذیل اس تفصیل کی شاہدِ عدل ہیں:-

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْٓ	کیا تم کو بنی اسرائیل کی اس جماعت کا حال معلوم
اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ	نہیں، جس نے موسیٰؑ کے بعد اپنے زمانے کے
قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا	نبی سے درخواست کی تھی کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد
مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ	کریں گے، ہمارے لئے ایک حکمراں مقرر کر دیجئے
قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ	نبی نے کہا: کچھ بعید نہیں ہے کہ اگر تم کو لڑائی کا حکم
عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ	دیا گیا تو تم لڑنے سے انکار کر دو! سرداروں نے
قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ	کہا: ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا	نہ لڑیں جبکہ ہم اپنے گھروں سے جا چکے اور اپنی
مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا	اولاد سے علیحدہ کئے جا چکے ہیں؟ پھر جب
كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا	اُن کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو تھوڑے سے آدمیوں
اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ	کے سوا باقی سب نے پیٹھ دکھلا دی، اور اللہ
بِالظّٰلِمِیْنَ ۝ وَقَالَ لَهُمْ	بے انصافوں سے خوب واقف ہے۔ پھر
نَبِیُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ	ایسا ہوا کہ اُن کے نبی نے کہا: اللہ نے تمہارے لئے

لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا	طالوت کو مقرر کر دیا ہے، جب اُنھوں نے یہ بات سنی تو (اطاعت و
قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ	فرمانبرداری کی بجائے) کہنے لگے وہ ہم پر کیسے حکمراں بن سکتا ہے جبکہ
الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ	اُس سے کہیں زیادہ ہم حکمراں بننے کے حق دار ہیں، علاوہ بریں اُس کو
اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ	مال و دولت کی وسعت بھی حاصل نہیں ہے، نبی نے فرمایا (حکمراں
يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ	کا جو معیار تم نے بنایا ہے وہ غلط ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حکمرانی
قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ	کی قابلیت و استعداد میں تم پر اس کو برگزیدہ اور فائق کیا ہے اور
عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً	علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت دونوں میں اس کو وسعت عطا فرمائی
فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰهُ	ہے اور حکمرانی و قیادت تمہارے دینے سے نہیں ملتی بلکہ اللہ جس کو
يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ	چاہتا ہے اس کا اہل سمجھ کر اپنی زمین کی حکمرانی بخش دیتا ہے اور وہ (اپنے
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝	تصرف و قدرت میں) بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

ان آیات میں جس نبی کا ذکر ہے وہ یہی سموئیل (علیہ السلام) ہیں۔

تابوتِ سکینہ بنی اسرائیل کی اس ردوکد نے یہاں تک طول کھینچا کہ انھوں نے سموئیل (علیہ السلام) سے مطالبہ کیا کہ اگر طالوت کا تقرر منجانب اللہ ہے تو اس کے لئے خدا کا کوئی نشان دکھائیے۔ حضرت سموئیلؑ نے فرمایا کہ اگر تم کو خدا کے اس فیصلہ کی تصدیق مطلوب ہے تو اتمامِ حجت کے لئے وہ بھی تم کو عطا کی جا رہی ہے اور وہ یہ کہ جو متبرک صندوق (تابوتِ سکینہ) تمہارے ہاتھوں سے چھن گیا ہے اور جس میں "توراۃ" اور حضرت موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کے تبرکات محفوظ ہیں وہ طالوت کی بدولت تمہارے پاس واپس آجائے گا، اور حکمتِ الٰہی سے ایسا ہوگا کہ تمہاری دیکھتی آنکھوں فرشتے اُسے اُٹھا لائیں گے، اور وہ دوبارہ تمہارے قبضہ میں آجائے گا:۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ	اور اُن کے نبی نے اُن سے کہا: طالوت کی اہلیتِ حکومت
اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ	کی نشانی یہ ہے کہ وہ جو مقدس) تابوت (تم کھو چکے ہو) اور

التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ	دشمنوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے) تمہارے پاس واپس
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا	آجائے گا اور فرشتے اس کو اٹھا لائیں گے، اس تابوت میں
تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ	تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے لئے (فتح ونصرت)
تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ اِنَّ فِيْ	کی طمانیت ہے، اور موسیٰؑ وہارونؑ کے گھرانوں (کی مقدس
ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ	یادگاروں) کا بقیہ ہے، بے شبہ اس واقعہ میں تمہارے
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (بقرہ پ ۲ ع)	خدا کا بہت بڑا نشان ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

حضرتِ سموئیل (علیہ السلام) کی یہ بشارت آخر بروئے کار آئی اور بنی اسرائیل کے سامنے "ملائکۃ اللہ نے "تابوتِ سکینہ" طالوت کو پیش کر دیا اور اس طرح ان پر یہ ظاہر ہو لیا کہ اگر وہ حضرتِ سموئیلؑ کے اس الہامی فیصلہ کو قبول کر لیں تو کامیابی وکامرانی یقینی اور حتمی ہے۔

توراۃ میں "تابوتِ سکینہ" کی واپسی کی داستان جس پیرایہ میں بیان کی گئی ہے وہ بہت دلچسپ ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

سفرِ صموئیل میں ہے کہ جب سے "بیتِ دجون" میں "تابوتِ سکینہ" لا کر رکھا گیا اُس وقت سے فلسطینیوں نے روزانہ یہ منظر دیکھا کہ جب صبح کو وہ اپنے معبود "دجون" کی عبادت کے لئے جاتے ہیں تو اس کو مُنہ کے بل اوندھا پڑا پاتے ہیں اور صبح کو جب وہ اُس کو دوبارہ اپنی جگہ پر قائم کر دیتے ہیں تو شب گزرنے پر پھر اسی طرح اوندھا گرا ہوا پاتے ہیں، پھر ایک نئی بات یہ ہوئی کہ اس شہر میں اتنی کثرت سے چوہے پیدا ہو گئے کہ انہوں نے اُن کے تمام حاصلات کو خراب اور تباہ کر دیا۔ اور ایک خاص قسم کی گلٹیوں کی وبا نے وہاں گھر کر لیا۔ جس سے سخت نقصانِ جان ہونے لگا۔ فلسطینیوں نے جب کسی طرح اِن باتوں سے نجات نہ پائی تو غور وفکر کے بعد کہنے لگے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہم پر یہ تمام نحوست اس صندوق کی وجہ سے ہے، لہٰذا اس کو یہاں سے نکالو۔

یہ سوچ کر فلسطینیوں نے اپنے کاہنوں اور نجومیوں کو جمع کیا اور ان سے تمام واقعات بیان کر کے علاج کا مطالبہ کیا۔ کاہنوں اور نجومیوں نے کہا کہ اس کا صرف یہی علاج ہے کہ جس طرح ممکن ہو جلد اس تابوت کو یہاں سے خارج کر دو اور اس کی صورت یہ ہے کہ سونے کے سات چوہے بنائے جائیں اور سات گلٹیاں اور ان کو ایک گاڑی میں تابوت کے ساتھ رکھ دیا جائے، اور گاڑی میں ۲ دو ایسی گائیں جوڑی جائیں جو دودھ دے رہی ہوں اور ان کو بستی کے باہر لے جا کر سڑک پر چھوڑ دیا جائے کہ جس جانب اُن کا رُخ ہو اُس صندوق کو لے جائیں۔

چنانچہ فلسطینیوں نے ایسا ہی کیا۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ وہ گائیں خود بخود ایسے رُخ پر چل پڑیں کہ جو بنی اسرائیل کی بستیوں کی جانب تھا اور آخر چلتے چلتے ایک ایسے کھیت پر جا کھڑی ہوئیں جہاں اسرائیلی اپنا کھیت کاٹ رہے تھے، اسرائیلیوں نے جب صندوق کو دیکھا تو مسرت و خوشی سے مدہوش ہو گئے اور دوڑے دوڑے شہر بیتِ شمس میں جا کر خبر کی اور اُس کے بعد بیت یعریم کے یہودی آکر اُس کو بڑے احترام سے لے گئے اور ابینداب کے گھر میں جو ٹیلہ پر واقع تھا حفاظت کے ساتھ اس کو رکھا۔[۱]

عبدالوہاب نجار نے اس واقعہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ "تابوتِ سکینہ" کے متعلق قرآنِ عزیز میں جو یہ کہا گیا ہے کہ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ (اس کو فرشتے اٹھا لائیں گے) اس سے یہ مراد ہے کہ ملائکۃ اللہ کی راہنمائی میں اس طرح یہ گائیں صندوق کی گاڑی کو بغیر کسی قائد و سائق کے منزلِ مقصود پر لے آئیں گی۔ لیکن قرآن اور بائبل کے مضامین کی تطبیق میں یہ تاویل اگرچہ بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے تاہم تاویلِ باطل ہے اور نظمِ قرآنی اُس کا انکار کرتی ہے۔

اس لئے کہ قرآنِ عزیز کے بیان کا حاصل تو یہ ہے کہ تابوتِ سکینہ کی واپسی طالوت کی حکمرانی کے لئے خدا کا ایک نشان ہے جو سموئیل (علیہ السلام) کے ہاتھوں پر اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ ملائکۃ اللہ نے بنی اسرائیل کی آنکھوں دیکھتے اس کو لا کر طالوت کے

سامنے پیش کردیا۔ مگر توراۃ کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گاڑی میں جوتی گئی گائیں بیتِ شمس کی سڑک پر لے جاکر چھوڑی گئی تھیں، البتہ انھوں نے دائیں بائیں رُخ نہ کیا۔ اور سیدھی چلتی رہیں حتیٰ کہ بیتِ شمس کے سامنے کھیتوں میں جاکھڑی ہوئیں جو فلسطیوں کے حدود کے بعد پہلی سرحدی اسرائیلی بستی تھی، اور اس میں یہ بھی تصریح ہے کہ فلسطی اس گاڑی کے پیچھے پیچھے بیتِ شمس کی سرحد تک گئے اور جب گاڑی بیتِ شمس کے کھیتوں میں چلی گئی تب واپس ہوئے :۔

سو اُن گایوں نے بیتِ شمس کی سڑک کی سیدھی راہ لی اور اس شاہراہ پر چلیں اور چلتے ہوئے ڈکارتی تھیں اور داہنے یا بائیں ہاتھ نہ مڑیں اور فلسطی قطب ان کے پیچھے بیتِ شمس کے سوانے تک گئے اور بیتِ شمس کے لوگ وادی میں گیہوں کی فصل کاٹ رہے تھے انھوں نے جو آنکھیں اوپر کریں تو صندوق دیکھا۔[1]

اور "تابوت" کے حاصل ہونے کا یہ طریقہ بے شبہ "معجزہ" یا "نشان" کی حیثیت نہیں رکھتا خصوصاً جبکہ تورات میں یہ بھی تصریح ہے کہ "بیتِ دجون" کے کاہن اس کے پیچھے پیچھے اسرائیلی کھیتوں کے قریب تک آئے نیز قرآنِ عزیز ہرگز اس کے لئے یہ زوردار جملہ نہ کہتا :

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ بلاشبہ تمہارے لئے اس میں بہت بڑا نشان ہے

علاوہ ازیں قرآنِ عزیز کے طرزِ بیان اور اس کے نظمِ کلام سمجھنے کا جس کو معمولی سا بھی ذوق ہے وہ بہت آسانی کے ساتھ یہ جان سکتا ہے کہ اگر "تابوتِ سکینہ" بائبل کے بیان کردہ واقعہ کے مطابق حاصل ہوا تھا تو قرآنِ عزیز اس کو تحملہ الملٰئکۃ سے تعبیر نہ کرتا بلکہ تھدی بہ الملائکۃ یا اسی قسم کا کوئی ایسا جملہ کہتا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ "تابوتِ سکینہ" فرشتوں کی راہنمائی میں پہنچ جائے گا۔

اور اگر بالفرض توراۃ کی اس تفصیل کو صحیح مان لیا جائے تب بھی اس کا حاصل یہ نکلے گا کہ جبکہ بیتِ دجون میں صنمِ دجون تابوتِ سکینہ کی موجودگی میں روزانہ اوندھے منہ گر جاتا تھا،

[1] صموئیل ۱۔ باب ۶۔ آیت ۱۲۔

اور اس واقعہ کی بدولت تابوت کو سرزمین دجون سے نکالا گیا تو یہ بھی بہرحال اُسی قسم کا "معجزہ" اور "نشان" ہے جو ظاہری اسباب کے بغیر دجون کے مندر میں ظاہر ہوتا رہا۔ لہٰذا جو شخص اس واقعہ کی پوری تفصیل کو صحیح تسلیم کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے اس کو تحملہ الملٰئکۃ کے اس صاف اور سادہ معنی کے قبول کر لینے میں کیا اشکال ہو سکتا ہے کہ خدا کے فرشتے آنکھوں دیکھتے اُس کو اٹھا کر لے آئیں گے۔

طالوت و جالوت کی جنگ اور بنی اسرائیل کا امتحان

اس تمام ردوکد کے بعد بنی اسرائیل کو انکار کرنے کے لئے کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا اور حضرت سموئیلؑ کے الہامی فیصلہ پر طالوت کو بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا دیا گیا۔

اب طالوت نے بنی اسرائیل کو نفیرِ عام دیا کہ وہ دشمنوں (فلسطینیوں) کے مقابلہ کے لئے نکلیں۔ جب بنی اسرائیل طالوت کی سرکردگی میں روانہ ہوئے تو بنی اسرائیل کی آزمائش کا ایک اور مرحلہ پیش آیا، وہ یہ کہ طالوت نے یہ سوچا کہ جنگ کا معاملہ بیحد نازک ہے اور اس میں بعض مرتبہ ایک شخص کی بزدلی یا منافقانہ حرکت پورے لشکر کو تباہ کر دیا کرتی ہے اس لئے ازبس ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کے اس گروہ کو جہاد سے پہلے آزمایا جائے کہ کون شخص تعمیلِ حکم، ضبطِ نفس اور صداقت و اخلاص کا حامل ہے اور کس میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے اور وہ بزدل اور کمزور ہے تاکہ ادائے فرض سے پہلے ہی ایسے عناصر کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے، کیوں کہ یہاں صبر و ثباتِ قدمی اور اطاعت و انقیاد اصل ہے لہٰذا جو شخص معمولی پیاس میں ضبط و صبر پر قدرت نہیں رکھتا وہ جہاد جیسے نازک معاملہ میں کس طرح ثابت قدم رہ سکتا ہے۔

چنانچہ جب یہ گروہ ایک ندی کے کنارے پہنچا تو طالوت نے اعلان کیا اللہ تعالیٰ اس نہر کے ذریعہ تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے وہ یہ کہ کوئی شخص اس سے جی بھر کر پانی نہ پئے لہٰذا جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ خدا کی جماعت سے نکال دیا جائے گا

اور جو تعمیلِ ارشاد کرے گا وہ جماعت میں شامل رہے گا۔ البتہ سخت پیاس کی حالت میں گھونٹ بھر پانی پی کر حلق تر کر لینے کی اجازت ہے:-

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ	جب طالوت لشکریوں کو لے کر روانہ ہوا تو اس نے
إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن	کہا بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم کو نہر کے پانی کے ذریعہ آزمائیگا
شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن	پس جو شخص اس سے سیراب ہو کر پیے گا وہ میری جماعت
لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ	میں نہ رہے گا، اور جو ایک چلو پانی کے سوا اس سے سیر
اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا	ہو کر نہیں پیے گا وہ میری جماعت میں رہے گا، پھر تھوڑے
مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ۔ (بقرہ پ ۲ ع)	سے لوگوں کے علاوہ سب نے اس نہر سے سیراب ہو کر پی لیا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ واقعہ نہر اردن پر پیش آیا[1] بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ ہم اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے کہ اصحابِ بدر کی تعداد اصحابِ طالوت کے برابر ہے[2]۔

بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ جب لشکر ندی کے پار ہو گیا تو جن لوگوں نے خلاف ورزی کر کے پانی پی لیا تھا، وہ کہنے لگے کہ ہم میں جالوت جیسے قوی ہیکل اور اُس کی جماعت سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے، لیکن جن لوگوں نے ضبطِ نفس اور اطاعتِ امیر کا ثبوت دیا تھا انھوں نے بے خوف ہو کر یہ کہا کہ ہم ضرور دشمن کا مقابلہ کریں گے اس لئے کہ خدا کی قدرت کا یہ مظاہرہ اکثر ہوتا رہتا ہے کہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں، البتہ ایمان باللہ اور اخلاص و ثبات شرط ہے:-

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ	پھر جب طالوت اور اس کے ساتھ وہ لوگ جو (حکم الٰہی پر سچا)
آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ	ایمان رکھتے تھے، ندی کے پار اُترے تو اُن لوگوں نے (جنھوں
لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ	نے طالوت کے حکم کی نافرمانی کی تھی) کہا ہم میں یہ طاقت نہیں
قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم	کہ آج جالوت سے اور اس کی فوج سے مقابلہ کر سکیں

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۸۔ [2] بخاری باب ...

مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ	لیکن وہ لوگ جو سمجھتے تھے انہیں ایک دن اللہ کے حضور حاضر
قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً	ہونا ہے پکار اُٹھے (تم دشمنوں کی کثرت اور اپنی قلت سے ہراساں
بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ	کیوں ہوئے جاتے ہو؟) کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر
الصّٰبِرِيْنَ ۝ (بقرہ پ ۲ ع)	حکمِ الٰہی سے غالب آگئیں اور اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔

مجاہدین کا لشکر اب آگے بڑھا اور دشمن کی فوج کے مقابل صف آرا ہوا، دشمن کی فوج کا سردار جالوت نامی دیوہیکل شخص تھا اور اس کے لشکر کی تعداد بھی زیادہ تھی، مجاہدین نے اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں اخلاص وتضرع کے ساتھ دعا کی کہ دشمن کو شکست دے اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور اپنی فتح ونصرت سے شادکام بنا۔

تورات اور کتبِ سیر میں ہے کہ جالوت کی غیر معمولی شجاعت وبہادری نے بنی اسرائیل کو متاثر کر رکھا تھا اور اس کی مُبارِز طلبی کے جواب میں جھجک محسوس کرتے تھے۔

حضرتِ داؤدؑ کی شجاعت

بنی اسرائیل کے اس لشکر میں ایک نوجوان بھی تھا جو بظاہر کوئی نمایاں شخصیت نہیں رکھتا تھا اور نہ شجاعت وبہادری میں کوئی خاص شہرت کا مالک تھا، یہ داؤد (علیہ السلام) تھے، کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے والد کے سب سے چھوٹے لڑکے تھے، اور شرکتِ جنگ کے ارادہ سے بھی نہیں آئے تھے بلکہ باپ کی جانب سے بھائیوں اور دوسرے اسرائیلیوں کے حالات کی تحقیق کے لئے بھیجے گئے تھے مگر جب انہوں نے جالوت کی شجاعانہ مُبارِز طلبی اور اسرائیلیوں کی پس وپیش کو دیکھا تو ان سے نہ رہا گیا اور طالوت سے اجازت چاہی کہ جالوت کا جواب دینے کے لئے اُن کو موقع دیا جائے۔ طالوت نے کہا تم ابھی ناتجربہ کار لڑکے ہو اس لئے اس سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ مگر داؤدؑ کا اصرار بڑھتا ہی رہا اور آخر کار طالوت کو اجازت دینی پڑی،

داؤد (علیہ السلام) آگے بڑھے اور جالوت کو للکارا، جالوت نے ایک نوجوان کو مقابل پایا تو حقیر سمجھ کر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی مگر جب دونوں کے درمیان نبرد آزمائی

شروع ہوگئی تو اب جالوت کو داؤد کی بے پناہ شجاعت کا اندازہ ہوا۔ داؤد (علیہ السلام) نے لڑتے لڑتے اپنی گوپھن سنبھالی اور تاک کر پے بہ پے تین پتھر اس کے سر پر مارے اور جالوت کا سر پاش پاش کر دیا اور پھر آگے بڑھ کر اس کی گردن کاٹ لی۔ جالوت کے قتل کے بعد جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور بنی اسرائیل کی جنگِ مغلوبہ جارحانہ حملہ میں تبدیل ہوگئی اور طاغوتی طاقت کو شکست ہوئی اور بنی اسرائیل کامگار و کامراں واپس لوٹے۔ اس واقعہ نے حضرت داؤد کی شجاعت کا دوست و دشمن دونوں کے قلوب پر سکہ بٹھا دیا اور وہ بے حد ہر دل عزیز ہو گئے اور ان کی شخصیت بہت نمایاں اور ممتاز نظر آنے لگی۔

اگرچہ قرآن عزیز نے ان تفصیلات کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے یا حقیقتاً یہ تفصیلات خود اپنی جگہ پر صحیح نہیں ہیں لیکن اس بات پر قرآن اور توراۃ دونوں کا اتفاق ہے کہ جالوت کے قاتل حضرت داؤد (علیہ السلام) ہیں اور جالوت کے قتل سے ہی اسرائیلیوں کو فتح اور دشمن کو شکست نصیب ہوئی۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ	اور جب وہ (مجاہدین) جالوت اور اس کے لشکر کے
قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ	مقابل ہوئے تو کہنے لگے "اے پروردگار! ہم کو صبر دے اور
ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى	ہم کو ثابت قدم رکھ اور کافر قوم پر ہم کو فتح و نصرت عطا فرما۔
الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَهَزَمُوْهُمْ	بس اللہ کے حکم سے انھوں نے اُن (فلسطینیوں) کو
بِاِذْنِ اللّٰهِ ۛ وَقَتَلَ دَاوٗدُ	شکست دے دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا
جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ	اور اللہ نے داؤد کو حکومت اور حکمت عطا فرمائی اور
وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ	جو مناسب جانا وہ سب کچھ سکھایا۔

بعض اسرائیلی روایات میں یہ بھی ہے کہ جالوت کی زبردست طاقت اور بنی اسرائیل کے اس کے مقابل ہونے میں جھجک کو دیکھ کر طالوت نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص جالوت

کو قتل کرے گا میں اس سے اپنی بیٹی کی شادی کروں گا اور اس کو حکومت میں بھی حصہ دار بناؤں گا چنانچہ جب داؤد (علیہ السلام) نے جالوت کو قتل کر دیا تو طالوت نے وفاءِ عہد کے پیشِ نظر اس کے ساتھ اپنی لڑکی میکال کی شادی کر دی اور حکومت میں بھی حصہ دار بنا لیا۔[1]

ایک اسرائیلی روایت پر محاکمہ

تورات کے صحیفہ سموئیل میں طالوت اور داؤد کے متعلق ایک طویل داستان پائی جاتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ طالوت نے داؤد کے شجاعانہ کارناموں کی بناء پر حسب وعدہ ان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی مگر بنی اسرائیل کی اُن کے ساتھ والہانہ عقیدت اور اُن کی غیر معمولی شجاعت کو اس نے اچھی نظر سے نہ دیکھا اور اس کے دل میں اُن کی جانب سے آتشِ بغض و حسد بھڑک اٹھی مگر اُس نے اس کو پوشیدہ رکھا اور اندر ہی اندر ایسی ترکیبیں کرتا رہا کہ جس سے داؤد کا قصہ پاک ہو جائے۔

باپ کے خلاف طالوت کے لڑکے اور لڑکی داؤد کے رازدار اور ہمدرد رہے اور اس لئے ہر موقع پر طالوت کو ناکام ہونا پڑا۔ آخر زچ ہو کر اُس نے علی الاعلان داؤد کی مخالفت شروع کر دی اور داؤد یہ دیکھ کر اپنی بیوی اور سالے کو ہمراہ لے کر فرار ہو گئے اور فلسطینیوں کے ایک قصبہ میں طالوت کے دشمن کے یہاں پناہ لی۔ اسرائیلیوں کی اس باہمی آویزش سے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا اور انھوں نے فوج کشی کر کے اسرائیلیوں کو سخت ہزیمت دی۔

اب اس جگہ سے سُدّی کی روایت اور تورات کی روایت میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے تورات کہتی ہے کہ طالوت اس جنگ میں مارا گیا اور سُدّی کہتا ہے کہ شکست کا یہ منظر دیکھ کر ساؤل (طالوت) اپنے کیے پر پچھتایا اور نادم ہوا اور وقت کے بزرگوں اور کاہنوں سے دریافت کیا کہ میری توبہ قبول ہونے کی بھی کوئی صورت نکل سکتی ہے سب نے انکار کیا۔ مگر ایک عابدہ عورت "ہاں" کہہ کر اس کو الیسع نبی کی قبر پر لے گئی اور دعا کی، حضرت الیسع قبر سے اٹھے اور اس سے کہا کہ تیری توبہ کی صرف یہ ایک صورت ہے کہ تو حکومت

[1] سموئیل کی کتاب۔ البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۸-۹

داؤد کے حوالے کردے اور اپنے خاندان سمیت جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو کر شہید ہو جا
چنانچہ اس نے یہی کیا اور اس طرح حکومت داؤد کے ہاتھوں میں بلا شرکت غیرے آگئی اور
ساؤل (طالوت) نے مع خاندان کے جام شہادت پی لیا۔

یہ پوری داستان سموئیل کے صحیفہ سے ماخوذ ہے مگر سدی کے حوالے سے اصحاب سیر
نے بھی اس اسرائیلی داستان کو اسلامی روایات کی طرح بیان کیا ہے حتیٰ کہ حضرت داؤد
کی جو منقبت سورۂ بقرہ کی آیت میں مذکور ہے اس داستان کو اس کی تفسیر میں بیان
کر دیا گیا ہے۔ معلوم نہیں کہ گزشتہ دور میں اسرائیلیات کی نقل کا اس قدر ذوق کیوں پیدا
ہو گیا تھا کہ یہود نے جن داستانوں کو اپنی گمراہی اور غلط روی کی تائید کے لئے گڑھا تھا انکو بھی
اسلامیات میں شامل کرنے سے احتیاط نہیں برتی گئی اور تاریخ و سیرت تو کجا تفسیر قرآن جیسے
اہم مقام کو بھی اس خرافات سے محفوظ نہ رہنے دیا گیا چنانچہ یہاں بھی یہی صورت حال پیش آئی ہے
قرآن عزیز کی زبانی آپ سن چکے ہیں کہ جب اسموئیل علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے
مطالبہ پر طالوت (ساؤل) کو بادشاہ مقرر کر دیا تو بنی اسرائیل نے اتباع و انقیاد کا وعدہ
کرنے کے باوجود اس کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور انحراف کی راہ اختیار کی
تھی، مگر جب خدائی نشان نے ان کو لاجواب بنا دیا تب مجبور و مقہور ہو کر طالوت کو اپنا
اولوا الامر تسلیم کیا، چنانچہ علماء یہود اس بات کو محسوس کرتے رہے کہ ہماری مجرمانہ عادات و خصائل
کے اعداد و شمار میں یہ ایک مزید اضافہ ہے کہ ہم نے خدا کے مامور انسان طالوت کو نااہل بنا کر
شروع میں اس کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لہٰذا ایسی صورت پیدا کرنی چاہئے کہ
جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ طالوت (ساؤل) کے بارہ میں "نااہلیت امارت" کا جو دعوے
ہم نے کیا تھا وہ صحیح اور سچ ظاہر ہو جائے اور ہم کو دنیا کے سامنے یہ کہنے کا موقع ملے کہ یہی
وہ امور تھے جن کو ہم نے اپنی فطانت و فراست سے پہلے ہی بھانپ لیا تھا اور آخر کار طالوت
(ساؤل) کی نالائقی اور نااہلیت ثابت ہو کر رہی۔ جرم ہلکا کرنے اور اپنی مجرمانہ خصلت پر پردہ

ڈالنے کے لئے یہ وہ اقدام ہے جو اسموئیل کی کتاب میں طالوت (ساؤل) اور حضرت داؤد علیہ السلام کی باہمی آویزش سے متعلق داستان میں نظر آرہا ہے مگر وائے افسوس کہ ہمارے بعض ارباب سیر و راویان تفسیر نے بھی اس حقیقت تک پہنچے بغیر اپنی سادگی سے کتب سیر و تفسیر میں اس کو نقل کر دیا اور یہ توجہ نہ فرمائی کہ جس ہستی (طالوت) کو قرآن عزیز مامور من اللہ قرار دے رہا ہے اور جس کی برکت سے "تابوت سکینہ" بنی اسرائیل کو دوبارہ عطا ہو رہا ہے اور جسکو "زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ" کہہ کر اس کے علم و شجاعت کو پُر شوکت الفاظ میں سراہ رہا ہے، ہم بغیر کسی دلیل و برہان قویم کے کس طرح ایسے شخص کو قابل نفرت حرکات کا حامل قرار دے کر موردِ لعن و طعن بنا سکتے ہیں، قرآن عزیز سے یہ قطعاً بعید ہے کہ جس ہستی کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ معاصی میں گزر رہا ہو اور وہ جرائم کا مرتکب ہو رہا ہو اس کے مناقب و محامد کا تو ذکر کر دے اور اس کی زندگی کے دوسرے پہلو کو نمایاں نہ کرے پس جبکہ قرآن عزیز نے طالوت کے ثناء و منقبت کے علاوہ ایک لفظ بھی مذمت کا بیان نہیں کیا، بلکہ اس کی جانب اشارہ تک موجود نہیں ہے تو ایک مسلمان کے لئے کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ وہ تورات کی اس خرافی داستان کو صحیح تسلیم کرے، حاشا و کلّا!

یہی وجہ ہے کہ مشہور محقق ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد یہ فرمادیا:

وفی بعض هذا نظرٌ ونکارةٌ اور اس قصہ کے بعض حصے اوپری داستان اور قابل اعتراض ہیں۔

نیز یہ بھی فرمایا کہ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک عورت نے الیسع نبی کی قبر پر حاضر ہو کر ان کو موت سے جگایا، یہ خود اس واقعہ کے غلط ہونے کا عمدہ ثبوت ہے اس لئے کہ اس قسم کے معجزات کا ظہور انبیاء و رسل سے کبھی کبھی ہوتا ہے نہ کہ ایک زاہدہ و عابدہ عورت سے۔[1] چنانچہ اسی وجہ سے ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس واقعہ کی جانب مطلق توجہ نہیں فرمائی اور

[1] البدایۃ والنہایۃ ص ۹۔

بلاشبہ یہ ہرگز توجہ کے قابل نہیں ہے۔

اسی دوران میں حضرت سموئیل (علیہ السلام) کا انتقال ہوگیا۔

بصائر و حِکَم | سموئیل (علیہ السلام) طالوت اور داؤد (علیہ السلام) کے ذکر کردہ واقعات میں جو بصیرتیں اور حکمتیں پنہاں ہیں وہ اگرچہ بہت ہیں تاہم مختصر طور پر یہ چند قابلِ غور ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے قوموں اور امتوں کے مزاج میں یہ خاصیت ودیعت فرمائی ہے کہ جب اُن کی آزادی خطرہ میں پڑ جائے اور کوئی قوی ان کو غلام بنا لینے کے خیال سے ظلم پر اُتر آئے تو وہ اپنے اس حق کی حفاظت اور ظالم کے دفاع کے لئے تشتّت و افتراق کو چھوڑ کر وحدتِ مرکزی جانب دوڑتی اور اپنے لئے ایک صالح اور قابل زعیم اور رہنما تلاش کرنے لگتی ہیں تاکہ وہ ان کی اس پستی کو بلندی سے بدل ڈالے۔ چنانچہ بنو اسرائیل کا حضرت سموئیل (علیہ السلام) سے یہ مطالبہ کہ اُن کے لئے ایک آمر و سلطان منتخب کریں اسی فطری تقاضے کے پیشِ نظر تھا۔

(۲) آزادی اور حفاظتِ حقوق کا یہ شعور بدرجۂ کمال اقوام و امم کے خواص میں پہلے پیدا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ عوام تک پہنچتا ہے اور جس قوم اور جس اُمت میں ایسے خواص کثرت سے موجود ہوں گے اُس قوم اور اُس اُمت میں یہ جذبہ اسی قدر تیزی کے ساتھ پایا جائے گا۔

(۳) جب کسی قوم کے خواص میں اپنے استقلال اور دشمن کے مقابلہ میں حفاظت و دفاع کا شعور بہت زیادہ ترقی پا جاتا ہے تو وہ عوام اور خام کار افرادِ ملت و قوم کو متأثر کئے بغیر نہیں رہتا اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارا یہ شعور اور یہ جذبہ قومی عصبیت و حمیت میں خواص کے شعور سے کسی طرح کم نہیں ہے، مگر جب یہ فکر شعور سے گزر کر عمل و ظہور کی وادی میں آتا ہے تو اس وقت اُن پر اپنا عجز اور خامکاری ظاہر ہو کر رہتی ہے اور صادقین کاملین کے علاوہ اس وادیٔ پُرخار کا کوئی دوسرا رہ نورد نظر نہیں آتا چنانچہ یہی وہ حقیقت ہے

جس کو قرآنِ عزیز نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝

پھر جب اُن (بنی اسرائیل) پر جہاد فرض کر دیا گیا تو اُن میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا سب پیٹھ دکھا گئے اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے خبردار ہے۔

(۴) اقوام و اُمم کے مختلف جاہلی رسوم و اعتقادات میں سے ایک مہلک اعتقاد یہ بھی رہا ہے کہ قیادت و حکومت صرف اسی شخص کا حق ہے جو دولت و ثروت کا مالک اور سرمایہ داری میں نمایاں حیثیت رکھتا ہو اور حسب و نسب میں بھی بلند مرتبہ ہو، اقوامِ عالم کا یہ تخیل اس درجہ عام رہا ہے کہ جو قومیں تہذیب و تمدن اور عقل و دانش کی علمبردار رہی ہیں وہ بھی اس فاسد عقیدہ میں جہالت کے دوش بدوش نظر آتی ہیں بلکہ اس کو علمی اور عقلی رنگ دے کر جاہلی دور سے بھی زیادہ اس کی پابند ہیں۔ بنی اسرائیل کے نقوش بھی اس فاسد عقیدہ سے خالی نہ تھے، اسی بنا پر انھوں نے بھی طالوت کی امارت پر اعتراض کرتے ہوئے یہ کہہ دیا:

وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ

اور اُس کو وسعتِ دولت تو حاصل ہی نہیں اور ہم اُس کے مقابلہ میں زیادہ مستحقِ حکومت ہیں۔

(۵) مگر اسلام نے اس جاہلانہ عقیدہ کے خلاف یہ واضح کیا کہ خدا کے نزدیک حکومت و قیادت کا تعلق دولت و ثروت سے وابستہ نہیں ہے اور نہ حسب و نسب اس کیلئے مدار ہے بلکہ علم اور قوت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سلسلہ کی شرط قرار دیے جائیں اسلئے کہ حق و انصاف، حُسنِ تدبیر و اصابتِ رائے جو حکومت و زعامت کے لئے شرطِ اولیں ہیں وہ مال و دولت اور حسب و نسب سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ اُن کا مبدء صفت "علم" قرار پاتی ہے۔ اسی طرح شجاعت و بسالت اور جرأتِ حق جو حکومت و قیادت کے لئے از بس ضروری ہیں بیشتر بَسْطَةً فِي الْجِسْمِ کی رہینِ منت ہیں اس لئے کہ بَسْطَةً فِي الْجِسْمِ سے

یہ مراد نہیں کہ عمدہ غذائیں کھا کر وہ خوب فربہ ہوگیا ہو بلکہ جسم کی وہ طاقت و قوت مراد ہے جو میدانِ جہاد میں دشمن کے مقابلہ میں ہیبت و سطوت کا باعث اور قوتِ مدافعت اور جراَتِ قلب کے ساتھ متصف ہو۔

قرآنِ عزیز نے یہ بھی بتایا کہ قیادت وحکومت کے استحقاق کا یہ مسئلہ دینِ حق کے امتیازی مسائل میں سے ہے اور ہمیشہ وقت کے جاہلی دور کے مقابلہ میں انبیاء و رسل کی معرفت اقوام و امم کے سامنے دہرایا جاتا رہا ہے تاکہ جب وہ اس سلسلہ کی گمراہی میں مبتلا ہوں تو فوراً کسی نبی یا رسول یا اُن کے نائبین کے ذریعہ اُن کی گمراہی پر متنبہ کر کے ان کو ہدایت کی راہ دکھا دی جائے چنانچہ جب بنی اسرائیل نے حضرت سموئیل (علیہ السلام) کے سامنے طالوت کے خلاف متذکرہ بالا غلط استدلال پیش کیا تو حضرت سموئیل نے فوراً اُن کو یہ کہہ کر اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ	بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو فضیلت دی ہے
وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ	اس کو علم اور جسمانی قوت کی وسعت عطا فرمائی ہے

(۶) جب حق و باطل کا معرکہ پیش آتا ہے اور حق کی جانب سے مخلصینِ کاملین فداکارانہ جذبات کے ساتھ حمایتِ حق کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان میں خود اعتمادی اور توکل علی اللہ کی روح سرایت کر جاتی ہے تو پھر کامرانی و کامیابی کا مدار قلت و کثرت پر نہیں رہتا بلکہ قلت، کثرت پر بھاری ہو جاتی اور کثرت، قلت سے مغلوب ہو کر شکست کھا جاتی ہے یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار قرآنِ عزیز نے اس طرح کیا ہے:

وَكَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ	اور بارہا چھوٹی سی جماعت اللہ کے حکم سے
فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ پ ۲)	بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے۔



حضرتِ داؤد علیہ السلام

نسب نامہ، حلیۂ مبارک، قرآنِ عزیز میں ذکرِ مبارک، نبوت و رسالت، عظمتِ مملکت زبور، خصائصِ داؤدؑ، تسخیر و تسبیحِ طیور و جبال، حضرتِ داؤدؑ کے ہاتھ میں لوہے کا نرم ہوجانا، منطق الطیر، تلاوتِ زبور، حضرتِ داؤد اور دو اہم تفسیری مقام، مقامِ اول، مقامِ ثانی، بہتان طرازی کی مثال، تورات کا تضادِ بیان، آیات کی باطل تفسیر، آیات کی صحیح تفاسیر، عمرِ مبارک، بصائر۔

نسب نامہ گزشتہ واقعہ میں حضرت داؤد (علیہ السلام) کا مختصر ذکر آچکا اور یہ واضح ہوچکا کہ قتلِ جالوت میں بے نظیر شجاعت کے اظہار نے بنی اسرائیل کے قلوب پر داؤد علیہ السلام کی محبت و عظمت کا سکہ بٹھا دیا تھا اور اُن کی شخصیت ممتاز اور نمایاں ہوچکی تھی چنانچہ یہی داؤد آگے چل کر خدا کے برگزیدہ رسول اور پیغمبر بنے اور بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لئے رسول اور ان کے اجتماعی نظم و ضبط کے لئے "خلیفہ" مقرر ہوئے۔

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں حضرت داؤد کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:

داؤد بن ایشا (ایشی) بن عوبد بن عابر (یا عابز) بن سَلْمُون بن نحشون بن عونیاذب (یا عمی ناذب) بن ارم (یا رام) بن حصرون بن فارص بن یہوذا بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم (علیہ السلام) خطوط کے اندر جو نام درج ہیں وہ ابن جریر سے منقول ہیں اور ثعلبی نے عرائس البیان میں بعض ناموں کی جگہ دوسرے نام بیان کئے ہیں۔ مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ داؤد (علیہ السلام) اسرائیلی اسباط میں یہودا کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں[1]۔

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۹۔

توراۃ میں ہے کہ ایشایا ایشی کے بہت سے لڑکے تھے اور داؤد ان سب میں صغیر سن تھے۔[1]

حلیۂ مبارک | محمد بن اسحٰق نے وہب بن منبہ کے واسطہ سے حضرت داؤد کا حلیۂ مبارک اس طرح نقل کیا ہے: پستہ قد نیلگوں آنکھیں، جسم پر بال بہت کم تھے چہرہ اور بشرے سے طہارتِ قلب اور نفاستِ طبع جھلکتی تھی۔[2]

قرآن عزیز میں ذکرِ مبارک | قرآنِ عزیز میں حضرت داؤد کا ذکر سورۂ بقرہ، نساء، مائدہ، انعام، اسراء، انبیاء، نمل، سبا اور ص میں آیا ہے ان سورتوں میں سولہ جگہ نام مذکور ہے اور بعض سورتوں میں مختصر اور بعض میں تفصیلی طور پر اُن کے حالات و واقعات کا ذکر اور انکی رشد و ہدایت کا بیان ہے۔ ذیل کا نقشہ اس مطالعہ کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

سورہ	آیات	شمار	سورہ	آیات	شمار
بقرہ	۱۰۲ - ۲۵۱	۲	انبیاء	۷۸ تا ۸۲	۵
نساء	۱۶۲	۱	نمل	۱۵ تا ۴۴	۲۹
مائدہ	۷۸	۱	سبا	۱۰ - ۱۴	۲
انعام	۸۴ تا ۹۰	۷	ص	۱۷ تا ۲۶ - ۳۰ تا ۴۰	۱۹
اسراء	۵۵	۱	میزان		۶۷

نبوت و رسالت | حضرت داؤد کے ساتھ بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی محبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ طالوت کی موجودگی میں ہی یا اس کی موت کے بعد عنانِ حکومت حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں آگئی اور اس عرصہ میں ان پر خدا کا ایک اور زبردست انعام یہ ہوا کہ وہ منصبِ نبوت و رسالت سے بھی سرفراز کر دیے گئے۔

حضرت داؤد سے قبل بنی اسرائیل میں یہ سلسلہ قائم تھا کہ حکومت ایک سبط (خاندان) سے وابستہ تھی اور نبوت و رسالت دوسرے سبط سے، یہودا کے گھرانے میں نبوت چلی آتی تھی

---

[1] سموئیل کی کتاب [2] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۱۰۔

اور افراہیم کے خاندان میں حکومت و سلطنت[1]، داؤد علیہ السلام پہلے شخص ہیں جن کے اندر خدائے تعالیٰ نے یہ دونوں نعمتیں یکجا جمع کر دی تھیں وہ خدا کے پیغمبر اور رسول بھی تھے اور صاحبِ تاج و تخت بھی، چنانچہ قرآنِ عزیز نے حضرت داؤد کے اس شرف کا اس طرح ذکر کیا ہے:

اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ	اللہ نے ان کو حکومت بھی عطا کی اور حکمت (نبوت)
وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ (بقرہ پ ۲)	بھی اور اپنی مرضی سے جو چاہا سکھایا۔
يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً	اے داؤد! بے شک ہم نے تم کو زمین میں اپنا
فِى الْاَرْضِ (ص)	نائب بنایا ہے۔
وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا	اور ہم نے ہر ایک (داؤد و سلیمان) کو حکومت بخشی
(انبیاء)	اور علم عطا کیا۔

انبیاء و رسل میں سے حضرت آدم کے علاوہ صرف حضرت داؤد ہی وہ پیغمبر ہیں جن کو قرآنِ عزیز نے "خلیفہ" کے لقب سے پکارا ہے۔

تحقیق و کاوش کے بعد حضرت داؤد کی اس امتیازی خصوصیت کی دو حکمتیں سمجھ میں آتی ہیں، ایک صفحاتِ آئندہ میں اپنے موقع پر آئے گی اور دوسری حکمت یہ ہے کہ جبکہ بنی اسرائیل میں صدیوں سے قائم شدہ رسم کے خلاف حضرت داؤد میں نبوت و رسالت کے ساتھ حکومت و سلطنت بھی جمع کر دی گئی تو ضروری تھا کہ ان کو ایک ایسے لقب سے پکارا جائے جو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ علم و قدرت کا مظہرِ اتم ہونے پر صراحت کرتا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے شریعتِ حقہ کی اصطلاح میں "خلیفہ" سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں ہو سکتا تھا۔

الحاصل حضرت داؤد (علیہ السلام) بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کی خدمت بھی سرانجام دیتے اور ان کی اجتماعی حیات کی نگرانی کا فرض بھی ادا فرماتے رہے۔

عظمتِ مملکت | قرآنِ عزیز، تورات اور اسرائیلی تاریخ اس کے شاہد ہیں کہ حضرت داؤد

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۱۰۔

شجاعت وبسالت، اصابتِ رائے اور قوتِ فکر و تدبیر جیسے اوصاف کے پیشِ نظر کامل و مکمل انسان تھے اور فتح و نصرت اُن کے قدم چومتی تھی اور خدا کا فضل و کرم اس درجہ ان کے شاملِ حال تھا کہ دشمن کے مقابلہ میں ان کی جماعت کتنی ہی مختصر ہوتی کامیابی ہمیشہ ان ہی کے ہاتھ رہتی اس لئے بہت تھوڑے عرصہ میں شام، عراق، فلسطین اور شرقِ اردن کے تمام علاقوں پر اُن کا حکم نافذ، اور ایلہ (خلیج عقبہ) سے لے کر فرات کے تمام علاقوں اور دمشق تک تمام ملک اُن کے زیرِ نگیں تھا، اور اگر حجاز کے بھی اُن حصّوں کو شامل کرلیا جائے جو اُن کے قلمرو حکومت کا حصہ بن چکے تھے، تو یہ کہنا کسی طرح بیجانہ ہوگا کہ حضرت داؤد کی مملکت و حکومت بلا شرکت "سامی اقوام" کی واحد سلطنت تھی، جو جدید فلسفۂ تاریخِ اقوام کے مطابق "وحدتِ عرب" یا اس سے بھی زیادہ وسیع "وحدتِ اقوامِ سامیہ" کی حکومت کہی جاسکتی ہے، اور پھر کثرتِ لشکر اور وسعتِ حدود و رقبۂ مملکت کے ساتھ ساتھ "وحی الٰہی" کے شرف نے ان کی عظمت و شوکت اور صولت و ہیبت کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا تھا اور رعایا کو یہ یقین حاصل تھا کہ اگر حضرت داؤد (علیہ السلام) کے سامنے کوئی ایسا معاملہ رکھ دیا جائے یا ایسی کوئی مہم پیش کر دی جائے جو انتہائی پیچیدہ ہو یا کذب و افترا نے اس پر زیادہ سے زیادہ ملمع کر دیا ہو تب بھی "وحی الٰہی" کے ذریعہ ان پر حقیقتِ حال منکشف ہو جاتی ہے اس لئے جن و انس کسی کو بھی یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ انکے احکام کی خلاف ورزی کریں چنانچہ ابن جریر نے اپنی تاریخ میں حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمی ایک بیل کا مناقشہ لے کر داؤد (علیہ السلام) کی خدمت میں پیش ہوئے۔ ہر ایک یہ کہتا تھا کہ یہ میری ملک ہے اور دوسرا غاصب ہے۔ حضرت داؤد نے قضیہ کا فیصلہ دوسرے دن پر مؤخر کر دیا۔ دوسرے دن انھوں نے مدعی سے فرمایا کہ رات میں خدا نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تجھ کو قتل کر دیا جائے لہٰذا تو صحیح بات بیان کر؟ مدعی نے کہا: خدا کے سچے نبی! اس مقدمہ میں تو میرا بیان قطعاً حق اور سچ ہے لیکن اس واقعہ سے قبل میں نے اس (مدعیٰ علیہ) کے باپ کو دھوکا دے کر مار ڈالا تھا،

یہ سُن کر حضرت داؤدؑ نے اس کو قصاص میں قتل کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔[1]

اسی قسم کے واقعات ہوتے تھے جن کی وجہ سے حضرت داؤد کے حکم اور ان کی عظمت و شوکت کے سامنے سب پست اور فرمانبردار تھے۔ قرآنِ عزیز کی آیتِ ذیل میں حضرت داؤدؑ کی اسی عظمتِ مملکت اور موہبتِ حکمت و نبوت کا اظہار کیا گیا ہے۔

وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (ص) — اور ہم نے اُس کی حکومت کو مضبوط کیا اور اس کو حکمت (نبوت) عطا کی اور صحیح فیصلہ کی قوت بخشی

اس آیت اور گزشتہ آیات میں "حکمت" سے کیا مراد ہے؟ یہ سوال ہے جو مفسرین کے یہاں زیرِ بحث ہے۔ ہمارے نزدیک اقوالِ سلف کا خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ حکمت سے دو باتیں مراد ہیں، ایک نبوت اور دوسری عقل و دانش کا وہ مقام جس پر فائز ہو کر کوئی شخص راہِ راست کی بجائے کبھی کج روی اختیار نہیں کر سکتا۔ بعض علماء نے حکمت سے زبور مراد لی ہے، اسی طرح "فصلِ خطاب" سے بھی دو امور کی جانب اشارہ ہے:۔

(۱) وہ تقریر و خطابت کے فن میں کمال رکھتے تھے اور اس طرح بولتے تھے کہ لفظ لفظ اور فقرہ فقرہ جدا جدا فہم و ادراک میں آتا تھا اور اس سے کلام میں فصاحت و لطافت اور شوکتِ بیان پیدا ہو جاتی تھی۔

(۲) اُن کا حکم اور فیصلہ حق و باطل کے درمیان قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا تھا۔

زبور | بنی اسرائیل کی رُشد و ہدایت کے لئے "اصل اور اساس" توراۃ تھی لیکن حالات و واقعات اور زمانہ کے تغیرات کے پیشِ نظر حضرت داؤدؑ کو بھی خدا کی جانب سے زبور عطا ہوئی جو توراۃ کے قوانین و اصول کے اندر رہ کر اسرائیلی گروہ کی رُشد و ہدایت کے لئے بھیجی گئی تھی، چنانچہ حضرت داؤدؑ نے شریعتِ موسوی کو از سرِ نو زندہ کیا، اسرائیلیوں کو راہِ ہدایت دکھائی اور نورِ وحی سے مستفیض ہو کر تشنہ کامانِ معرفتِ الٰہی کو سیراب فرمایا۔

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۱۲۔

زبور خدا کی حمد کے نغموں سے معمور تھی اور حضرت داؤدؑ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا لہجہ اور سحر آگیں لحن عطا فرمایا تھا کہ جب زبور کی تلاوت فرماتے تو جن و انس حتیٰ کہ وحوش وطیور تک وجد میں آجاتے۔ اس لیے آج تک "لحنِ داؤدی" ضرب المثل ہے۔

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ابوموسیٰ اشعری کے حُسنِ صوت کو سنتے تو ارشاد فرماتے: "ابوموسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے لحنِ داؤد عطا فرمایا ہے"۔[1]

لُغت میں زبور کے معنی پارے اور ٹکڑے کے ہیں چونکہ یہ کتاب دراصل توراۃ کی تکمیل کے لئے نازل ہوئی تھی اسی لیے گویا اسی کا ایک حصہ اور ٹکڑا ہے۔

زبور ایسے قصائد اور مسبح کلمات کا مجموعہ تھا جس میں خدا کی حمد و ثنا اور انسانی عبدیت و عجز کے اعتراف اور پند و نصائح اور بصائر و حکم کے مضامین تھے۔ مُسند احمد میں ایک روایت منقول ہے کہ زبور کا نزول رمضان میں ہوا اور وہ مواعظ و حکم کا مجموعہ تھی[2] نیز بعض بشارات اور پیشین گوئیاں بھی منقول تھیں، چنانچہ بعض مفسرین نے یہ تصریح کی ہے کہ آیتِ مسطورہ ذیل میں زبور کے جس واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی بشارت سے متعلق ہے اور وہی اس کا مصداق ہیں۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ — اور بیشک ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ
أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ — کہہ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔
(انبیاء)

قرآنِ عزیز نے جگہ جگہ توراۃ، انجیل اور زبور کو خدا کی وحی فرمایا ہے اور مُنزّل من اللہ بتایا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے دیدہ و دانستہ خدا کی ان کتابوں کو بدل ڈالا اور جگہ جگہ اپنی مرضی کے مطابق ان میں تحریف کر دی حتیٰ کہ اب ان کے حقائق پر اس قدر پردہ پڑ گیا ہے کہ اصل اور جعل کے درمیان فرق کرنا سخت مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۱۱۔ [2] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۱۲

عَنِ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ — بعض یہود وہ ہیں جو (توراۃ وانجیل وزبور) کے کلمات
الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (بقرہ) — کو ان کی اصل حقیقت سے بدلتے اور پھیرتے ہیں۔

چنانچہ توراۃ وانجیل کے علاوہ خود زبور اُس کی زندہ شہادت موجود ہے موجودہ زبور میں اُن مختلف حصّوں کی تعداد جن کو اہلِ کتاب کی اصطلاح میں مزبور کہا جاتا ہے ایک سو پچاس ہے ان حصّوں پر جو نام درج ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ سب حصّے حضرت داؤدؑ کے "مزامیر" نہیں ہیں، کیونکہ بعض پر اگر حضرت داؤد کا نام ثبت ہے تو بعض پر مغنیوں کے استاذ قورح کا اور بعض پر شوشنیم کے سردوں پر آصف کا اور بعض پر گتیت کا اور بعض پر کسی کا نام نہیں ہے علاوہ ازیں بعض ایسے مزبور بھی ہیں جو حضرت داؤد علیہ السلام سے صدیوں بعد تصنیف کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ مزبور:

اے خدا قومیں تیری میراث میں گھس آئی ہیں، انھوں نے تیری مقدس ہیکل کو ناپاک کیا ہے انھوں نے یروشلم کو کھنڈر بنا دیا ہے[1]

اس مزبور میں اُس ہولناک واقعہ کا تذکرہ ہے جو بنوکدرزر (بخت نصر) کے ہاتھوں بنی اسرائیل کو پیش آیا اور ظاہر ہے کہ یہ واقعہ داؤد (علیہ السلام) کے صدیوں بعد پیش آیا ہے۔

بہرحال خدائے تعالیٰ نے حضرت داؤد (علیہ السلام) پر زبور نازل فرمائی، اور ان کے ذریعہ بنی اسرائیل کو رشد وہدایت کا پیغام سُنایا:۔

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى — اور بیشک ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت
بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (اسراء) — عطا فرمائی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور بخشی۔
وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (نساء) — اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔

بخاری کتاب الانبیاء میں ایک روایت منقول ہے کہ حضرت داؤد پوری زبور کو اتنے مختصر وقت میں تلاوت کر لیا کرتے کہ جب وہ گھوڑے پر زین کسنا شروع کرتے تو تلاوت بھی

[1] مزبور ۷۹ تا ۸۴ -

شروع کرتے اور جب کس کر فارغ ہوتے تو پوری زبور ختم کر چکے ہوتے۔

حضرت داؤدؑ اور قرآن و تورات اس مقام پر قرآنِ عزیز اور تورات کے درمیان سخت اختلاف ہے۔ قرآنِ عزیز تو حضرت داؤدؑ کو اگر صاحبِ شوکت و صولت بادشاہ مانتا ہے تو جلیل القدر پیغمبر اور رسول بھی تسلیم کرتا ہے۔ لیکن تورات اُن کو صرف "کنگ داؤد" (شاہ داؤد) ہی تسلیم کرتی ہے اور ان کی نبوت و رسالت کا اقرار نہیں کرتی۔ ظاہر ہے کہ تورات کا انکار تحکم اور بے سروپا بات ہے اور اسی قسم کے کذب و افترا پر مبنی ہے جس کا ثبوت بارہا ان ہی صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔

خصائصِ داؤد اللہ تعالیٰ نے یوں تو سب ہی پیغمبروں کو خصوصی شرف و امتیاز بخشا ہے اور اپنے نبیوں اور رسولوں کو بے شمار انعام و اکرام سے نوازا ہے تاہم شرف و خصوصیت کے درجات کے اعتبار سے اُن کے درمیان بھی فرقِ مراتب رکھا ہے اور یہی امتیازی درجات و مراتب اُن کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ م (بقرہ پ ۳ ع ۱) — یہ رسول! ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

چنانچہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے متعلق بھی قرآنِ عزیز نے چند خصائص و امتیازات کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس رسول کو کس درجہ بزرگی اور عظمت عطا فرمائی ہے لیکن یہ واضح رہے کہ قرآنِ عزیز کی بیان کردہ خصائصِ انبیاء و رُسل میں خاصہ کے وہ منطقی معنی مراد نہیں ہیں کہ کسی دوسرے شخص میں قطعاً اس کا وجود نہ پایا جائے اور وہ وصف صرف اسی کے اندر محدود ہو بلکہ اس مقام پر خاصہ سے وہ وصف مراد ہے جو اس ذات میں تمام و کمال درجہ پر پایا جاتا ہو اور اس کے ذکر سے ذہن فوراً اُس شخصیت کی جانب متوجہ ہو جاتا ہو اگرچہ بعض حالات میں اُس وصفِ خاص کا وجود دوسرے نبیوں میں بھی جلوہ گر نظر آتا ہو۔

(۱) تسخیرو تسبیحِ جبال وطیور

حضرت داؤد (علیہ السلام) خدائے تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس میں بہت زیادہ مصروف رہتے تھے اور اس قدر خوش الحان تھے کہ جب زبور پڑھتے یا خدا کی تسبیح و تہلیل میں مشغول ہوتے تو اُن کے وجد آفریں نغموں سے نہ صرف انسان بلکہ وحوش وطیور وجد میں آجاتے اور آپ کے ارد گرد جمع ہو کر حمدِ خدا کے ترانے گاتے اور سُریلی اور پُرکیف آوازوں سے تقدیس و تسبیح میں حضرت داؤد کی ہمنوائی کرتے اور صرف یہی نہیں بلکہ پہاڑ بھی خدا کی حمد میں گونج اُٹھتے۔ چنانچہ داؤد (علیہ السلام) کی اس فضیلت کا قرآن عزیز نے سورۂ انبیاء، سبا اور صٓ میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے:۔

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ٥ (انبیاء پ ع)	اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو تابع کر دیا ہے کہ وہ داؤد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ہم ہی میں ایسا کرنے کی قدرت ہے۔
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ (سبا پ ع)	اور بیشک ہم نے داؤد کو اپنی جانب سے فضیلت بخشی ہے (وہ یہ کہ ہم نے حکم دیا) اے پہاڑو اور پرندو تم داؤد کے ساتھ مل کر تسبیح اور پاکی بیان کرو۔
اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ٥ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً كُلٌّ لَّهٗ اَوَّابٌ ٥ (صٓ پ ع)	بیشک ہم نے داؤد کے لئے پہاڑوں کو مسخر کر دیا کہ اس کے ساتھ شام اور صبح تسبیح کرتے ہیں اور پرندوں کے پرے کے پرے جمع ہوتے اور سب مل کر حمدِ خدا کرتے ہیں۔

بعض مفسرین نے ان آیات کی تفسیر میں کہا ہے کہ چرند و پرند اور پہاڑوں کی تسبیح زبانِ حال سے تھی گویا کائنات کی ہر شے کا وجود اور اس کی ترکیب بلکہ اس کی حقیقت کا ذرہ ذرہ خدا کی خالقیت کا شاہد ہے اور یہی اس کی تسبیح و تحمید ہے۔

سیب اگرچہ زبانِ حال نہیں رکھتا اور نطق سے محروم ہے لیکن اس کی خوشبو اور اس کی لطافت، اس کا حسن اور اس کی نزاکت جدا جدا پکار کر کہہ رہے ہیں فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ٥

۲
۵

امام رازی نے یہی مسلک اختیار کیا ہے مگر بایں جلالتِ قدر اس مسلک کے ثبوت میں ایسی فلسفیانہ دلیل پیش کی ہے جو عقل ونقل دونوں اعتبار سے رکیک ہے بلکہ اس کو دلیل کہنا بھی غلط ہے۔[1]

ہم کو یہ حقیقت کبھی بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ قرآنِ عزیز کا طرزِ استدلال ان فلسفیانہ موشگافیوں کے تابع نہیں ہے جو محض ظن اور تخمین کی بنیادوں پر قائم ہیں خصوصاً یونانی فلسفہ کے مزعومہ اصول پر ایک بات کہی جائے اور پھر قرآنِ عزیز کے صاف اور سادہ مطلب کو اس کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے تو قرآنِ عزیز اس کو برداشت نہیں کرتا۔

اس خیال کے برعکس محققین کی یہ رائے ہے کہ حیوانات، نباتات اور جمادات حقیقۃً تسبیح کرتے ہیں اور ان کی تسبیح کے صرف یہی معنی نہیں ہیں کہ اُن کا وجود زبانِ حال سے صانعِ حکیم پر دلالت کرتا ہے اور یہی ان کی تسبیح ہے، اس لیئے کہ قرآنِ عزیز نے سورۂ بنی اسرائیل میں بصراحت یہ اعلان کیا ہے:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ	آسمان اور زمین خدا کی تسبیح کرتے ہیں اور کائنات
وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ	کی ہر شے خدا کی تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح
بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ	کا فہم و ادراک نہیں رکھتے۔

اس جگہ دو باتیں صاف صاف نظر آتی ہیں (۱) کائنات کی ہر شے تسبیح کرتی ہے۔ (۲) جن وانس اُن کی تسبیح سمجھنے کا ادراک وفہم نہیں رکھتے۔ تو اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین اور کائنات کی ہر شے حیوانات، نباتات اور جمادات کی جانب تسبیح کی نسبت فرمائی ہے تو یہ ضرور ہے کہ ان اشیاء میں تسبیح کا حقیقی وجود موجود ہو اور پھر دوسرے جملہ کا اس پر اطلاق کیا جائے کہ جن وانس اُن کی تسبیح کے فہم وادراک سے قاصر ہیں۔ اگر اس جگہ تسبیح کے حقیقی معنی

[1] اس بحث کے مطالعہ کے لیے ملاحظہ کیجئے تفسیر کبیر جلد ۵ سورۂ بنی اسرائیل۔

نہ لئے جائیں بلکہ "زبانِ حال سے تسبیح کرنا" اس معنی کو اختیار کیا جائے تو پھر قرآنِ عزیز کا یہ ارشاد کیسے صحیح ہوگا وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے اس لیے کہ اگر ایک دہری اس کو نہیں سمجھتا کہ کائنات کا ہر ذرہ خدائے واحد کی ہستی کا پتہ دے رہا ہے تو تمام اہلِ مذاہب خصوصاً ہر مسلمان تو بے شبہ اس کو سمجھتا ہے اور وہ جب کبھی وجودِ باری پر کچھ سوچتا ہے تو اس کا یقین کر کے سوچتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی ہستی کا اقرار کر رہا ہے اور ہر شے کا وجود ہی خود خالقِ کائنات کا پتہ دے رہا ہے۔ ابنِ حزم نے "الفصل" میں اس جگہ یہ شبہ پیش کیا ہے کہ اگر حیوانات، نباتات اور جمادات کی تسبیح کو حقیقۃً تسبیح پر محمول کیا جائے تو یہ اشکال لازم آئے گا کہ ایک دہری انسان بھی "شے" ہے مگر وہ خدا کی تسبیح کسی لمحہ بھی نہیں کرتا۔ لہٰذا آیت کا عموم کیسے صحیح باقی رہے گا۔

ابنِ حزم کا یہ اشکال بہت ہی سطحی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کے بیان کرتے وقت ان کی نظر قرآنِ عزیز کے اس مطلب و مراد سے غافل ہوگئی جو اس مقام پر اس کے پیشِ نظر ہے اور انھوں نے آیتِ زیرِ بحث کے سیاق و سباق پر غور نہیں فرمایا۔

قرآنِ عزیز اس آیت سے قبل مشرکین کا تذکرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو بتا رہا ہے کہ مشرکین اپنی ناسمجھی اور کج فہمی سے خدا کے ساتھ معبودانِ باطل کو شریک ٹھہراتے ہیں لیکن قرآن جب اس مسئلہ کے بطلان کو اُن پر واضح کرتا اور طرح طرح سے سمجھاتا ہے تو ان پر نصیحت کا اُلٹا اثر پڑتا ہے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ نفرت کرنے لگتے ہیں حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور برتر ہے اُن تمام باطل نسبتوں سے جو مشرکین اس کی جانب منسوب کرتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ یہ انسان ہی ہے جو اس قسم کی مشرکانہ گمراہی میں مبتلا ہو رہا ہے ورنہ ساتوں آسمان و زمین اور کائنات کی ہر شے خدا کی پاکی بیان کرتی اور شرک سے بیزاری کا اظہار کرتی ہے۔ مگر انسان اُن کی اس تسبیح کے فہم و ادراک سے قاصر ہے۔

بیشک اللہ بردبار ہے بخشنے والا۔

اس کے بعد مشرکین کے باطل عقیدہ کا ثمرہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھتے ہیں تو ہم اُن کے اور مشرکین کے درمیان ایک "حجاب" قائم کر دیتے ہیں، یعنی وہ جب قرآن کو خدا کا کلام نہیں مانتے تو وہ آپ کو رسول بھی تسلیم نہیں کرتے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ آپ کی نصیحت سے مُنہ موڑ کر آخرت کے انجام سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا، وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۚ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۚ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝

(بنی اسرائیل پ۱۵ ع۵)

اور ہم نے اس قرآن میں طرح طرح کی باتیں بیان کی ہیں تاکہ لوگ نصیحت پکڑیں مگر وہ اس سے اور بدک جاتے ہیں۔ کہدو کہ اگر خدا کے ساتھ اور معبود ہوتے جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو وہ ضرور (خدائے) مالک عرش کی طرف (لڑنے بھڑنے کیلئے) رستہ نکالتے وہ پاک ہے اور جو کچھ یہ کواس کرتے ہیں اُس سے (اس کا رتبہ) بہت عالی ہے۔ ساتوں آسمان اور زمین اور جو اُن میں ہیں اُسی کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اُس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم اُن کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ بیشک وہ بردبار اور غفار ہے۔

قرآن عزیز کی ان تفصیلات اور سیاق و سباق کی تصریحات کے بعد ابن حزم کے شبہ کیلئے کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، وہ تو صاف صاف یہ کہہ رہا ہے کہ خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی ناپاک جرأت "انسان" کو ہی ہوئی اس لئے کہ وہ متضاد اوصاف کا مجموعہ ہے، لیکن اس کے علاوہ کائنات کی ہر شے خدا کے سامنے حقیقت کے سوا اور کچھ کہنے کی جرأت نہیں

رکھتی اور اسی لیے وہ صرف پاکی ہی بیان کرتی ہے اور "تسبیح وتحمید" اس کا شیوہ ہے۔

شیخ بدرالدین عینی نے محققین کے اس مسلک کو اس حدیث کے تحت میں مختصر مگر مدلل بیان کیا ہے جس میں دو قبروں میں مردوں پر عذاب ہونے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درخت کی ایک سبز شاخ کو چیر کر دونوں قبروں پر لگاتے ہوئے یہ ارشاد فرمانے کا ذکر ہے کہ جب تک یہ شاخیں خشک نہ ہوں گی یہ دونوں عذاب سے محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

اہل علم آیۃ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ کے معنی بیان کرتے ہیں کہ ہر زندہ شے خدا کی حمد کرتی ہے اور ہر شے کو اس کے درجہ کے مناسب زندگی حاصل ہے اور لکڑی (نباتات) میں زندگی اُس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ سبز رہے اور خشک ہوجانا اُس کی موت کا اعلان ہے اور پتھر (جمادات) کی زندگی اس کے سالم رہنے سے وابستہ ہے اور اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہوجانا اس کی موت کا پیغام ہے اور محققین کا یہی مسلک ہے، کہ آیت (بغیر کسی تاویل کے) اپنے عموم پر ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ اشیاء کیا حقیقۃً تسبیح کرتی ہیں یا اپنے حال سے صانع اور خالق پر دلالت کرنا ہی اُن کی تسبیح ہے۔

تو اہلِ تحقیق کا مذہب یہ ہے کہ یہ اشیاء حقیقۃً تسبیح کرتی ہیں اور جبکہ "عقل" بھی اس کو محال نہیں سمجھتی اور "نص" بھی بصراحت اُس کا اظہار کرتی ہے تو ضروری ہے کہ اس کا مطلب وہی لیا جائے جو اہلِ تحقیق فرماتے ہیں[1]

نصِ قرآنی کی صراحت تو آپ کے سامنے ہے لیکن عقل کیوں اس کو محال نہیں سمجھتی تو اس کا فتویٰ عقل ہی سے لیجئے:

عقلاءِ دہر کا اس پر اتفاق ہے کہ گفتگو اور قول کے لئے "نطق" شرط نہیں ہے اور اگر کسی شے میں "حیات" اور "صوت" موجود ہیں تو اس کی جانب قول کی نسبت بے تردد صحیح ہے:

---

[1] عینی شرح بخاری ج ا ص ۸۷۴۔

چنانچہ فلاسفۂ یونان حیوانات کے اندر حیات کے ساتھ جزئیات کا حس بھی تسلیم کرتے رہے ہیں اور جدید سائنس کے دور میں تو یہ مشاہدہ ہو رہا ہے کہ نباتات کے اندر بھی "حیات" اور "احساس" دونوں چیزیں موجود ہیں حتیٰ کہ جزئیات کا تمیز بھی تجربہ میں آچکا ہے۔ چھوئی موئی کا درخت ہاتھ لگانے سے مرجھا جاتا ہے اور ہاتھ الگ ہونے سے پھر شاداب ہو جاتا ہے۔ "مردم خور درخت" انسان یا حیوان کے قریب ہونے پر اس کا احساس کرتا اور فوراً اپنی شاخیں دراز کر کے اس کو دبوچ کر اپنی گرفت میں کر لیتا ہے، یہ اب رات دن کے مشاہدے ہیں۔ کلکتہ میں مشہور ماہرِ علم النباتات سائنس داں کا ایک باغیچہ آج بھی موجود ہے جس میں مسٹر بوس خدا کی قدرت کے عجائبات دکھاتا ہے کہ درخت مریض بھی ہوتے ہیں اور صحتیاب بھی اور بعض درختوں کا بعض سے نفرت کرنا مشاہد ہوتا ہے اور بعض کا بعض کی جانب مائل ہونا بھی، حتیٰ کہ بعض سائنس دانوں کا اب یہ دعویٰ ہے کہ ایک نہایت ہی ضعیف اور غیر محسوس قسم کی حیات جمادات کے اندر بھی پائی جاتی ہے اور وہی اس کے نمو کی کفیل ہے۔

غرض نقل اور عقل دونوں اعتبار سے قرآنِ عزیز کا یہ ارشاد کہ "کائنات کی ہر شے خدا کی حمد و ثنا کرتی ہے" اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے ہے اور "دلالتِ حال" کے ساتھ اس کی تاویل کرنا فضول ہے۔ البتہ اُن کی یہ تسبیح و تحمید انسانوں کے عام فہم و ادراک سے بالاتر رکھی گئی ہے اور خدا کی مرضی اور مشیت کے ماتحت کبھی کبھی انبیاء و رُسُل کو اس کا فہم و ادراک عطا ہو جاتا ہے جو اُن کے لئے بطور نشان (معجزہ) کے ہوتا ہے چنانچہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کی خصوصیات میں سے ایک خصوصی شرف و امتیاز یہ تھا کہ جب وہ صبح و شام خدا کی حمد و ثناء کرتے اور اُس کی پاکی اور تقدیس میں مشغول ہوتے تو وحوش و طیور اور پہاڑ بھی اُن کے ساتھ بلند آواز سے خدا کی تسبیح و تحمید میں اُن کی ہم نوائی کرتے اور حضرت داؤد اور وہ سب ایک دوسرے کی تسبیح و تحمید کو سنتے، حضرت داؤد کی یہی وہ خصوصیت

ہے جس کا قرآن عزیز نے سورۂ انبیاء، سبا، اور ص میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

یہ واضح رہے کہ علماء حق میں سے جن علماء نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں جن وانس کے علاوہ اشیاء کی تسبیح کو "حال" پر محمول کیا ہے، انھوں نے بھی بلاخوف یہ تسلیم کیا ہے کہ حضرت داؤدؑ کا معاملہ اس عام حالت سے جدا معجزات سے تعلق رکھتا ہے اور ان مقامات میں حیوانات وجمادات کی تسبیح وتحمید حقیقی معنی ہی کے لحاظ سے ہے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان معجزات میں حقیقت ہی مُراد ہے جن میں کنکریوں کا کلمہ پڑھنا، اُستن خانہ کا گریہ کرنا اور حیوانات کا آپ سے ہم کلام ہونا ثابت ہے۔

حضرت داؤد کے ہاتھ میں لوہے کا نرم ہوجانا

شاہی اور شاہنشاہی کے باوجود حضرت داؤد (علیہ السلام) سلطنت ومملکت کے مالیہ سے ایک حبہ نہیں لیتے اور اپنا اور اہل وعیال کی معاش کا بار بیت المال پر نہیں ڈالتے تھے بلکہ اپنی محنت اور ہاتھ کی کمائی سے حلال روزی حاصل کرتے اور اسی کو ذریعۂ معاش بناتے تھے۔ چنانچہ حضرت داؤد کے اس وصف کو حدیث صحیح میں ان الفاظ کے ساتھ سراہا گیا ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کسی
ما اکل احد طعاماً قط خیراً من	انسان کا بہترین رزق اس کے اپنے ہاتھ کی
ان یاکل من عمل یدہ وان نبی اللہ	محنت سے کمایا ہوا رزق ہے اور بے شبہ اللہ کے
داؤد علیہ السلام کان یاکل من	پیغمبر داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے محنت
عمل یدہ۔ (بخاری کتاب التجارۃ)	سے روزی کماتے تھے۔

شیخ بدرالدین عینی فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) دعا مانگا کرتے تھے کہ خدایا ایسی صورت پیدا کردے کہ میرے لئے ہاتھ کی کمائی آسان ہوجائے کیونکہ میں بیت المال پر اپنی معاش کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ دراصل حضرت داؤد کا یہ پاک جذبہ اسی پیغمبرانہ امتیازات میں سے تھا جن کا ذکر قرآنِ عزیز نے تمام اولوالعزم پیغمبروں کی رشد وہدایت کے

سلسلہ میں کیا ہے کہ ہر نبی اپنی اُمت کو جب پیغامِ الٰہی سناتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا ہے:[1]

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًاۚ اِنْ	اور میں تم سے اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں چاہتا
اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ	میرا معاوضہ تو اللہ کے ذمہ ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ حدیث بخاری کا مقصد یہ ہے کہ خلیفۂ اسلام کو اگرچہ بیت المال سے بقدرِ کفاف وظیفہ لینا درست ہے لیکن افضل یہی ہے کہ اس پر بار نہ ڈالے چنانچہ حضرت صدیقِ اکبرؓ نے وفات کے وقت اس تمام رقم کو واپس کر دیا تھا جو انھوں نے زمانۂ خلافت میں بیت المال سے وظیفہ کی شکل میں لی تھی اسی طرح دوسری خدماتِ اسلامی پر معاوضہ لینے کا معاملہ ہے[2]۔ چنانچہ حضرت داؤد کی اس خواہش کو اللہ تعالیٰ نے اس فضیلت کے ساتھ قبول فرمایا کہ ان کے ہاتھ میں لوہے اور فولاد کو موم کی طرح نرم کر دیا کہ جب وہ زرہ بناتے تو سخت مشقت اور آلاتِ حدادی کے بغیر فولاد کو جس طرح چاہتے کام میں لاتے اور اُن کے ہاتھ میں موم کی طرح بآسانی ہر قسم کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔

قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کو سورۂ انبیاء اور سورۂ سبا میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَۙ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ	اور ہم نے اس (داؤد) کے لئے لوہا نرم کر دیا کہ
وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًاؕ اِنِّيْ	بنا زرہیں کشادہ اور اندازہ سے جوڑ کڑیاں
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (سبا پ ع)	اور تم جو کچھ کرتے ہو میں اس کو دیکھتا ہوں۔
وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ	اور ہم نے اس (داؤد) کو سکھایا ایک قسم کا لباس
مِّنْۢ بَاْسِكُمْۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ○	بنانا تاکہ تم کو لڑائی کے موقع پر اس سے بچاؤ
(انبیاء پ ع)	حاصل ہو، پس کیا تم شکر گزار بنتے ہو۔

توراۃ اور "لوہے کے استعمال کے زمانہ کی تاریخ" سے پتہ چلتا ہے کہ داؤد (علیہ السلام) سے پہلے لوہے کی صنعت نے اس حد تک تو ترقی کر لی تھی کہ فولاد کو پگھلا کر اُس سے سپاٹ

---

[1] عینی جلد ۷، ص ۲۲۰۔ [2] فتح الباری جلد ۴ ص ۲۴۳۔

ٹکڑے بناتے اور ان کو جوڑ کر زرہ بنایا کرتے تھے لیکن یہ زرہ بہت بھاری ہوتی تھی اور چند قوی ہیکل انسانوں کے علاوہ عام طریقہ سے ان کا استعمال مشکل اور دشوار سمجھا جاتا تھا اور میدانِ جنگ میں سُبک خرامی دشوار ہو جاتی تھی۔

حضرت داؤد پہلے شخص ہیں جن کو خدائے تعالیٰ نے یہ فضیلت بخشی کہ انھوں نے تعلیمِ وحی کے ذریعہ ایسی زرہیں ایجاد کیں جو باریک اور نازک زنجیروں کے حلقوں سے بنائی جاتی تھیں اور ہلکی اور نرم ہونے کی وجہ سے میدانِ جنگ کا سپاہی اس کو پہن کر بآسانی نقل و حرکت بھی کر سکتا تھا اور دشمن سے محفوظ رہنے کے لئے بھی بہت عمدہ ثابت ہوتی تھیں۔

سید محمود آلوسی نے روح المعانی میں حضرت قتادہ سے بھی اسی قسم کی روایت نقل کی ہے[1]

منطق الطیر | حضرت داؤد (علیہ السلام) اور اُن کے صاحبزادے حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو خدائے تعالیٰ کی جانب سے ایک شرف یہ عطا ہوا تھا کہ دونوں بزرگوں کو پرندوں کی بولیاں سمجھنے کا علم دیا گیا تھا، اور جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کی گفتگو سمجھتا ہے اسی طرح وہ پرندوں کی گفتگو سمجھتے تھے۔

نُطقِ طیر کی حقیقت کیا ہے اور حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کو نُطقِ طیر کے متعلق کس قسم کا علم تھا اس کی مفصل بحث حضرت سلیمان کے واقعات میں آئے گی لیکن یہ یقینی بات ہے کہ اُن کا یہ علم اس طریقہ کا نہ تھا جو علم الحیوانات کے ماہرین نے تخمینی اور ظنی طور پر ایجاد کیا ہے اور جو علمی اصطلاح میں زولوجی (ZOOLOGY) کی ایک شاخ شمار ہوتا ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک موہبت اور بخشش تھی جس سے ان دونوں پیغمبروں کو نوازا گیا تھا۔

---

[1] روح المعانی جلد ۱۷، ص ۷۱۔

تلاوتِ زبور گزشتہ سطور میں ذکر آچکا ہے کہ حضرت داؤد جب گھوڑے پر زین کسنا شروع کرتے تو اس سے فارغ ہونے تک مکمل زبور کی تلاوت کر لیا کرتے تھے تو حضرت داؤد کا یہ معجزہ "حرکتِ زبان" سے تعلق رکھتا ہے گویا خدائے تعالیٰ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے لیے زمانہ کو اس مدت میں ایسا سمیٹ دیتا تھا کہ عام حالت میں وہ گھنٹوں کی مقدار بن سکتا ہے یا حضرت داؤد کو سرعتِ ادا رالفاظ کی اس درجہ قوت عطا کر دی گئی تھی کہ دوسرا شخص جس کلام کو گھنٹوں میں ادا کرے، داؤد (علیہ السلام) اس کو بخاری کی نقل کردہ روایت کے مطابق مختصر وقت میں ادا کرنے پر قدرت رکھتے تھے اور یہ تو آج بھی مسلّم ہے کہ سرعتِ حرکت کے لئے کوئی حد معین نہیں کی جا سکتی۔

حضرت داؤد اور دو اہم تفسیری مقام حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں دو اہم مقام ایسے ہیں جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی اور مفسرین کے تفسیری مباحث کے لحاظ سے بھی اہم شمار ہوتے ہیں اور پہلا مقام اگرچہ اختلافی نہیں ہے مگر دوسرا مقام معرکۃ الآرا بن گیا ہے اور اہلِ علم کی موشگافیوں نے اُس کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اصل حقیقت کو آشکارا کیا جائے اور باطل اوہام و مزعومات کو دلائل و براہین کی روشنی میں رد کیا جائے۔

مقامِ اوّل

وَدَاوُدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِى الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۙ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا۔ (انبیاء پ ۱۷)	اور داؤد اور سلیمان (کا واقعہ) جب کہ وہ ایک کھیتی کے معاملہ کا فیصلہ کر رہے تھے جس کو ایک فریق کی بکریوں کے ریوڑ نے خراب کر ڈالا تھا اور ہم اُن کے فیصلہ کے وقت (اپنے علمِ محیط کے اعتبار سے) موجود تھے پھر ہم نے اس کے (بہترین) فیصلہ کی سمجھ سلیمان کو عطا کی اور داؤد و سلیمان کو ہم نے علم و حکمت عطا کیے۔

اس آیت کی تفسیر میں جمہور مفسرین نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ و حضرت عبداللہ بن عباسؓ یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کی خدمت میں دو شخص ایک مقدمہ لے کر حاضر ہوئے، مدعی نے دعوے کی روئداد یہ سنائی کہ مدعیٰ علیہ کی بکریوں کے گلّے نے اس کی تمام کھیتی تباہ و برباد کر ڈالی اور اس کو چر چک کر روند ڈالا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے علم و حکمت کے پیشِ نظر یہ فیصلہ دیا کہ مدعی کی کھیتی کا نقصان چونکہ مدعیٰ علیہ کے گلّہ کی قیمت کے قریب قریب متوازن ہے لہٰذا یہ پورا گلّہ مدعی کو تاوان میں دے دیا جائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر ابھی گیارہ سال کی تھی، وہ والد ماجد کے نزدیک ہی بیٹھے ہوئے تھے، کہنے لگے کہ اگرچہ آپ کا یہ فیصلہ صحیح ہے مگر اس سے بھی زیادہ مناسب شکل یہ ہے کہ مدعیٰ علیہ کا تمام ریوڑ مدعی کے سپرد کر دیا جائے کہ وہ اس کے دودھ اور اس کی اُون سے فائدہ اٹھائے اور مدعیٰ علیہ سے کہا جائے کہ وہ اس درمیان میں مدعی کے کھیت کی خدمت انجام دے اور جب کھیت کی پیداوار اپنی اصلی حالت پر واپس آجائے تو کھیت مدعی کے سپرد کر دے اور اپنا ریوڑ واپس لے لے۔ حضرت داؤد کو بیٹے کا یہ فیصلہ بہت پسند آیا۔

قرآنِ عزیز نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اس معاملہ میں سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ زیادہ مناسب رہا اور اس واقعہ خاص میں فہم داؤد پر فہم سلیمان گوئے سبقت لے گیا۔[۱] فقہی اصطلاح میں حضرت داؤد کے فیصلہ کو قیاسی کہیں گے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کو "استحسانی" مگر اس قسم کی جزئی فضیلت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بحیثیتِ مجموعی فضائل حضرت سلیمان (علیہ السلام) اپنے والد حضرت داؤد (علیہ السلام) پر فضیلت رکھتے تھے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مجموعۂ فضائل کے اعتبار سے حضرت داؤد کی جو منقبت فرمائی ہے وہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے حصہ میں نہیں آئی۔

---

[۱] ابن کثیر سورۂ انبیاء۔

مقامِ ثانی | توراۃ اور اسرائیلی روایات" کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی ذات قدسی صفات کی جانب ایسی مضحکہ خیز اور بے ہودہ حکایات و قصص منسوب کرتی ہیں کہ جن کو پڑھ کر ان مقدس ہستیوں کے متعلق نبی یا رسول ہونے کا تو کیا یقین ہو سکتا ہے یہ بھی باور نہیں ہوتا کہ وہ با اخلاق بزرگ ہستیاں ہیں۔

بہتان طرازی کی مثال | چنانچہ ان قصص و حکایات میں سے ایک خرافی روایت حضرت داؤد سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ تورات کے صحیفۂ سموئیل[۲] میں حضرت داؤد (علیہ السلام) کے متعلق ایک طویل داستان بیان کی گئی ہے جو مختصر الفاظ میں اسی کی زبانی سننے کے قابل ہے:۔

"اور شام کے وقت داؤد اپنے پلنگ پر سے اٹھ کر بادشاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگا اور چھت پر سے اس نے ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی، اور وہ عورت نہایت خوبصورت تھی۔ تب داؤد نے لوگ بھیج کر اس عورت کا حال دریافت کیا، اور کسی نے کہا کیا وہ العام کی بیٹی بنت سبع نہیں جو حتی اوریاہ کی بیوی ہے؟ اور داؤد نے لوگ بھیج کر اسے بلالیا وہ اس کے پاس آئی اور اس نے اس سے صحبت کی (کیونکہ وہ اپنی ناپاکی سے پاک ہو چکی تھی) پھر اپنے گھر کو چلی گئی، اور وہ عورت حاملہ ہو گئی۔ سو اس نے داؤد کے پاس خبر بھیجی کہ میں حاملہ ہوں...... صبح کو داؤد نے یوآب کے لئے ایک خط لکھا اور اسے اوریاہ کے ہاتھ بھیجا۔ اور اس نے خط میں یہ لکھا کہ اوریاہ کو گھمسان میں سب سے آگے رکھنا اور تم اس کے پاس سے ہٹ جانا تاکہ وہ مارا جائے ... ... اور اس شہر کے لوگ نکلے اور یوآب سے لڑے اور وہاں داؤد کے خادموں میں سے تھوڑے سے لوگ کام آئے اور حتی اوریاہ بھی مر گیا۔ تب یوآب نے آدمی بھیج کر جنگ کا سب حال داؤد کو بتایا... ... جب اوریاہ کی بیوی نے سنا کہ اس کا شوہر اوریاہ مر گیا تو وہ اپنے شوہر کے لیے ماتم کرنے لگی، اور جب سوگ کے دن گزر گئے تو داؤد نے اسے بلوا کر اس کو اپنے محل میں رکھ لیا اور وہ اس کی بیوی ہو گئی اور اس سے اس کے ایک لڑکا ہوا۔ پر اس کام سے جسے

داؤد نے کیا تھا خداوند ناراض ہوا[1]۔

اس داستان میں حضرت داؤد (علیہ السلام) کا جو اخلاقی نقشہ پیش کیا گیا ہے اس کے مطالعہ کے بعد ان کو نبی اور پیغمبر تو کجا ایک صحیح اخلاق کا انسان بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ دوسرے کی بیوی پر نظر بد ڈالنا، اس سے ناجائز طور پر ملوث ہونا اور پھر سازش کر کے اس کے شوہر کو ناحق قتل کروا دینا انسانی زندگی کے وہ ناپاک اعمال ہیں جن کے لیے علم اخلاق کی زبان میں "بدکاری" سے کم کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔

تورات کا تضادِ بیان لیکن اس سے قبل کہ ہم حضرت داؤد (علیہ السلام) کی معصوم ہستی پر لگائے ہوئے اس بہتان کی مدلل تردید کریں خود توراۃ ہی کی زبانی یہ سنانا چاہتے ہیں کہ دوسرے مقامات پر اس نے حضرت داؤد کی نسبت کیا کہا ہے اور ان کی پاک دامنی اور خدا رسی کا کس انداز میں ذکر کیا ہے؟

توراۃ کے صحیفہ "سموئیل (۲)" میں ہے:

"تب ناتن (نبی) نے بادشاہ (داؤد) سے کہا۔ جا جو کچھ تیرے دل میں ہے کر کیونکہ خداوند تیرے ساتھ ہے۔

اور اسی رات کو ایسا ہوا کہ خداوند کا کلام ناتن کو پہنچا۔ جا اور میرے بندہ داؤد سے کہہ خداوند یوں فرماتا ہے.....

سو اب تو میرے بندے داؤد سے کہہ کہ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ میں نے تجھے بھیڑ سالہ سے جہاں تو بھیڑ بکریوں کے پیچھے پیچھے پھرتا تھا، لیا تاکہ تو میری قوم اسرائیل کا پیشوا ہو[2]......

اس نے میرے زور آور دشمن اور میرے عداوت رکھنے والوں سے مجھے چھڑا لیا کیونکہ وہ میرے لئے نہایت زبردست تھے، وہ میری مصیبت کے دن مجھ پر آپڑے

---

[1] سموئیل (۲) باب ۱۱۔ آیات ۲-۲۷۔ [2] سموئیل (۲) باب ۷۔ آیات ۳-۸۔

پر خداوند میرا سہارا تھا۔ وہ مجھے کشادہ جگہ میں نکال لایا۔ اس نے مجھے چھڑایا اس لیے کہ وہ مجھ سے خوش تھا۔ خداوند نے میری راستی کے موافق مجھے جزادی اور میرے ہاتھوں کی پاکیزگی کے مطابق مجھے بدلہ دیا، کیونکہ میں خداوند کی راہوں پر چلتا رہا اور شرارت سے اپنے خداوند سے الگ نہ ہوا، کیونکہ اس کے سارے فیصلے میرے سامنے تھے اور میں اسکے آئین سے برگشتہ نہ ہوا۔ میں اس کے حضور کامل بھی رہا، اور اپنی بدکاری سے باز رہا، اسلئے خداوند نے مجھے میری راستی کے موافق بلکہ میری اس پاکیزگی کے مطابق جو اس کی نظر کے سامنے تھی بدلہ دیا۔[1]

داؤد بن یسّی کہتا ہے۔ یعنی یہ اس شخص کا کلام ہے جو سرفراز کیا گیا اور یعقوب کے خدا کا ممسوح اور اسرائیل کا شیریں نغمہ ساز ہے۔ خداوند کی روح نے میری معرفت کلام کیا اور اس کا سخن میری زبان پر تھا۔[2]......

سلیمان نے کہا تو نے اپنے خادم میرے باپ داؤد پر بڑا احسان کیا اس لیے کہ وہ تیرے حضور راستی اور صداقت اور تیرے ساتھ سیدھے دل سے چلتا رہا۔[3]........

سو اس (سلیمان) نے کہا خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے اپنے منہ سے میرے باپ داؤد سے کلام کیا...... اور داؤد کو چنا تاکہ وہ میری قوم اسرائیل پر حاکم ہو۔[4]

اب اے خداوند اسرائیل کے خدا اپنے بندے میرے باپ داؤد کے ساتھ اس قول کو بھی پورا کر جو تو نے اس سے کیا تھا کہ تیرے پاس میرے حضور اسرائیل کے تخت پر بیٹھنے کے لیے آدمی کی کمی نہ ہوگی، بشرطیکہ تیری اولاد جیسے تو میرے حضور چلتا ہے ویسے ہی میری شریعت پر عمل کرنے کے لیے اپنی راہ کی احتیاط رکھے۔[5].....

---

[1] صموئیل باب ۲۲ آیات ۱۸-۲۵ [2] ایضاً باب ۲۳ آیات ۱-۳ [3] سلاطین (۱) باب ۳ آیت [4] تاریخ (۲) باب ۶ آیات ۴ و ۷ [5] ایضاً باب ۶ آیت ۱۶۔

پھر بھی میں ساری سلطنت کو نہیں چھینوں گا بلکہ اپنے بندے داؤد کی خاطر اور یروشلم کی خاطر جسے میں نے چن لیا ہے ایک قبیلہ تیرے بیٹے کو دوں گا[1]۔۔۔۔۔

اور ایسا ہوگا کہ اگر تو ان سب باتوں کو جن کا میں تجھے حکم دوں سنے اور میری راہوں پر چلے اور جو کام میری نظر میں بھلا ہے اس کو کرے اور میرے آئین و احکام کو مانے جیسا میرے بندہ داؤد نے کیا تو میں تیرے ساتھ رہوں گا، اور تیرے لیے ایک پائدار گھر بناؤں گا جیسا میں نے داؤد کے لیے بنایا اور اسرائیل کو تجھے دوں گا[2]

یہ تمام عبارات بھی توراۃ ہی کی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد خدا کے مختار اور پسندیدہ بندے تھے، بلا واسطہ اس سے ہم کلام ہونے کا شرف رکھتے تھے، خدا کی شریعت کے کامل مطیع و فرماں بردار تھے، راستباز، پاکدامن اور باعفت بزرگ تھے، اور خدا کے دیے ہوئے ملک میں بنی اسرائیل کے امیر اور خلیفۃ اللہ تھے، ہر وقت خدا کی حفاظت و صیانت ان کی کفیل تھی، گویا برگزیدہ "پیغمبر" اور صاحب اقتدار "حکمراں" تھے۔ پس نہیں کہا جا سکتا کہ اہلِ کتاب توراۃ کے ان متضاد بیانات میں کس طرح تطبیق دیتے ہیں۔ اور حضرت داؤد کی شخصیت اُن کی نگاہ میں کیا وقعت رکھتی ہے؟ اگر داؤد "نبی" ہیں یا اخلاقِ حسنہ سے متصف "کنگ داؤد" ہیں تو حتی اوریاہ کی عورت سے متعلق داستان کا ان کے پاس کیا جواب ہے اور اگر اوریاہ کی بیوی کا واقعہ صحیح ہے تو اس مسطورہ بالا منقبت و مدحت کا استحقاق کس داؤد کو حاصل ہے؟

اس کے برعکس قرآنِ عزیز نے حضرت داؤد (علیہ السلام) کے متعلق تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے برگزیدہ رسول اور معصوم پیغمبر ہیں، خلیفۃ اللہ اور بنی اسرائیل کے امیر و حکمراں ہیں۔ وہ کہتا ہے:

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ اور بلاشبہ ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی اور

---

[1] سلاطین (۱) باب ۱۱ آیت ۱۳ [2] ایضاً باب ۱۱ آیت ۳۸۔

بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (اسراء) — اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ نِعْمَ — اور ہم نے داؤد کو سلیمان بخشا، داؤد اچھا بندہ ہے

الْعَبْدُ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ (ص) — بلاشبہ وہ خدا کی رحمت کی جانب رجوع ہونیوالا ہے

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا (سبا) — اور بلاشبہ ہم نے داؤد کو اپنی جانب سے فضیلت بخشی

وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ — اور ہم نے اس (داؤد) کو مضبوط ملک عطا کیا اور حکمت

الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (ص) — سے نوازا اور حق و باطل کے فیصلہ کی قوت عطا فرمائی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ — اور بلاشبہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو "علم" سے بہرہ ور کیا

عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ — اور ان دونوں نے کہا" اس اللہ کے لیے ہر طرح کی

الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ — حمد جس نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہم کو

مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ (نمل) — فضیلت اور برتری عطا فرمائی۔

ان تمام آیات میں حسبِ عادت قرآنِ عزیز نے کتبِ سابقہ کے ان خیالات کی تردید اور اصلاح فرمائی ہے جو اُن کے پیرودں کی تحریف و تبدیل کی بدولت اُن میں بطور معتقدات داخل ہو گئے ہیں۔ اس نے تاریخ کے اس تاریک پردہ کو چاک کر کے بتایا کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان بنی اسرائیل میں مقدس ہستیاں گزری ہیں۔ وہ خدا کے سچے نبی اور پیغمبر ہیں اور ہر قسم کے گناہ اور نافرمانیوں سے مقدس اور پاک ہیں۔

مگر افسوس اور صد ہزار افسوس کہ قرآنِ عزیز کے اس مقدس اعلان کے باوجود حتّی اور یاہ کی بیوی کی اس خرافی داستان کو توراۃ اور اسرائیلیات سے لے کر بعض مفسرین نے قرآنِ عزیز کی تفسیر میں نقل کر دیا اور اسرائیلی ہفوات کو بلا دلیل و سند اسلامی روایات کی حیثیت دیدی۔

ان سادہ لوح بزرگوں نے یہ مطلق خیال نہیں فرمایا کہ جن خرافی داستانوں کو آج وہ اسرائیلی روایت کی حیثیت سے قرآنِ عزیز کی تفسیر میں نقل کر رہے ہیں کل وہ آیاتِ قرآنی کی تفسیر و تشریح سمجھی جا کر امتِ مرحومہ کے لیے فتنہ سامانی کا باعث بنیں گی اور ان کی

گمراہی کا سبب ثابت ہوں گی۔ اور حیرت در صد حیرت ہے بعض ان جدید و قدیم متکلمین پر جنھوں نے اس قسم کی ہزلیات کو سختی کے ساتھ رد کر دینے اور ان بہتان طرازیوں کو مردود قرار دینے کی بجائے ان روایات کے نیک محمل تلاش کر کے ان کو قابلِ قبول بنانے کی سعیِ نامشکور فرمائی ہے، اور بے محل حسنِ ظن سے کام لے کر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ یہ تاویلات جو اس خرافی روایت کے بارہ میں کی جا رہی ہیں، ریت کی دیوار اور تارِ عنکبوت ہیں اور کسی نہ کسی اسلوب کے ساتھ اس کو تسلیم کرنے سے "عصمتِ انبیاءؑ" جیسے اہم اور بنیادی اسلامی عقیدہ پر ضربِ کاری لگتی ہے، اور یہ کہ انبیاء و رُسل کی جانب اس قسم کے انتساب سے جبکہ قرآنِ عزیز کا دامن پاک اور بے لوث ہے اور وہ اس قسم کی روایات کو بہتانِ عظیم سمجھتا ہے تو پھر کسی شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کی تفسیر میں اس قسم کی خرافات کا تذکرہ کرے۔

بہرحال ان مفسرین نے جن آیات کی تفسیر میں اس زہرِ ہلاہل کو ملایا ہے وہ سورۂ صٓ میں حضرت داؤدؑ کے اس واقعہ سے متعلق ہے:-

وَهَلْ أَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ إِذْ تَسَوَّرُوا	اور کیا تجھ کو ان دعوے والوں کی خبر پہنچی ہے جب
الْمِحْرَابَ ۝ إِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ	وہ دیوار کود کر عبادت خانہ میں گھس آئے داؤد کے پاس تو داؤد
فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ خَصْمٰنِ	اُن سے گھبرایا، وہ بولے گھبراؤ نہیں ہم دو جھگڑ رہے
بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ	ہیں۔ زیادتی کی ہے ایک نے دوسرے پر سو ہمارے
بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ	درمیان انصاف کے مطابق فیصلہ کر دے اور
إِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ۝ إِنَّ هٰذَآ أَخِيْ	ٹالنے والی بات نہ کرنا، اور ہم کو سیدھی راہ بتا۔ یہ میرا
لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ	بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دُنبیاں ہیں
نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفِلْنِيْهَا	اور میرے یہاں ایک دُنبی ہے، پس یہ کہتا ہے کہ وہ
وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ۝ قَالَ لَقَدْ	ایک بھی میرے حوالہ کر دے اور مجھ سے گفتگو میں بھی

ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ	تیز ہے، داؤد نے کہا وہ اپنی دنبیوں میں تیری
وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ	ایک دنبی کو ملانے کے لیے جو سوال کرتا ہے ظلم
بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ	کرتا ہے اور اکثر شریک ایک دوسرے پر زیادتی
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ	کرتے ہیں الا یہ کہ جو ایمان لائے اور عمل کیے
مَّا هُمْ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ	انھوں نے نیک اور ایسے بہت کم ہیں اور داؤد
فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّ	کے خیال میں گزرا کہ ہم نے اس کا امتحان لیا
اَنَابَ ۩ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ	پس مغفرت چاہنے لگا وہ اپنے رب سے اور گر پڑا
لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ۝	جھک کر اور رجوع ہوا (خدا کے سامنے) پھر ہم نے
يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى	اس کو وہ کام معاف کر دیا، اور اس کے لیے
الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ	ہمارے پاس (عزت کا) مرتبہ ہے اور اچھا ٹھکانا۔
بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ	اے داؤد ہم نے تجھ کو ملک میں (اپنا) نائب
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ	مقرر کیا ہے سو تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ
يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ	حکومت کر اور نفس کی خواہش پر نہ چل کر وہ تجھ کو
عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا	اللہ کی راہ سے بچلا دے جو لوگ اللہ کی راہ
يَوْمَ الْحِسَابِ ۝ (ص پ ۲۳ ع ۲)	سے بچلتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔

آیات کی باطل تفسیر اس جگہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے ایک امتحان کا ذکر ہے جو خدائے تعالیٰ کی جانب سے اُن کو پیش آیا حضرت داؤد نے اول اس کو نہیں سمجھا مگر یکایک دل میں یہ خیال آیا کہ یہ منجانب اللہ ایک آزمائش ہے لہٰذا فوراً ہی خدا کے برگزیدہ پیغمبروں کی طرح حق تعالیٰ کی جانب رجوع کیا، استغفار کیا اور درگاہِ الٰہی میں ان کا استغفار قبول ہو کر اُن کی عظمتِ شان اور تقربِ الی اللہ کا باعث بنا۔

معاملہ صرف اسی قدر تھا لیکن بعض مفسرین نے جب یہ دیکھا کہ قرآنِ عزیز نے اس آزمائش

کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی اور "توراۃ اور اسرائیلی روایات" میں اوریاہ کی بیوی کی ایک داستان موجود ہے جس میں حضرت داؤد سے خدا کی ناراضی کا بھی ذکر ہے تو بلا تامل اُس خرافات کو اس آیت کی تفسیر بنا کر آزمائش، استغفار اور قبولِ استغفار کو اس کے ساتھ چسپاں کر دیا۔

یہ دیکھ کر جلیل القدر مفسرین اور محققین سے ضبط نہ ہو سکا اور انھوں نے روشن دلائل وبراہین کے ساتھ یہ واضح کیا کہ اس خرافی روایت کا سورۂ صٓ کی ان آیات کی تفسیر سے دور کا بھی کوئی علاقہ نہیں ہے اور نہ صرف یہ بلکہ یہ پوری داستان از اوّل تا آخر یہودیوں کی من گھڑت اور پُراز بہتان روایتیں ہیں جن کے لیے اسلامیات میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

چنانچہ حافظ عماد الدین بن کثیر اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

قد ذکر المفسرون ھٰھنا قصۃ	اس جگہ مفسروں نے ایک ایسا قصہ بیان کیا ہے بلاشبہ
اکثرھا ماخوذ من الاسرائیلیات	جس کا اکثر حصہ اسرائیلیات سے لیا گیا ہے اور اس
ولم یثبت فیھا عن المعصوم	بارے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث
حدیث یجب اتباعہ [1]	بھی موجود نہیں ہے کہ جس کی پیروی ضروری ہو جائے۔

اور اپنی تاریخ البدایۃ والنہایۃ میں اس سے بھی زیادہ زور کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

وقد ذکر کثیر من المفسرین من	اور بہت سے اگلے اور پچھلے مفسرین نے اس مقام
السلف والخلف ھٰھنا قصصاً و	پر چند قصے اور حکایتیں نقل کی ہیں ان میں سے
اخباراً اکثرھا اسرائیلیات ومنھا	اکثر و بیشتر یہودیوں کی من گھڑت روایتیں ہیں اور
ماھو مکذوب لا محالۃ ترکنا	بعض ان میں سے یقینی طور پر جھوٹی اور باطل ہیں۔
ایرادھا فی کتابنا قصداً اکتفاء	ہم نے اس لیے اُن کو قصداً بیان نہیں کیا، اور قرآن
واقتصاراً علی مجرد تلاوۃ القصۃ	عظیم نے جس قدر واقعہ بیان کیا ہے صرف اسی قدر
من القرآن العظیم واللّٰہ یھدی	بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ صٓ۔

مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ[1] چاہتا ہے راہِ مستقیم پر چلاتا ہے۔

اور کتاب الفصل میں حافظ ابو محمد بن حزم ان آیات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وھذا قول صادق صحیح	اور قرآن کا یہ قول سچا اور صحیح ہے اور یہ کسی طرح بھی
لا یدل علی شیٔ مما قاله	اس روایت پر دلالت نہیں کرتا جس کو ان
المستھزئون الکاذبون	مسخروں کاذبوں نے بیان کیا ہے جو ایسی
المتعلقون بخرافات ولدھا	خرافات سے لپٹے رہتے ہیں جن کو یہود نے
الیھود[2]	ایجاد کیا ہے۔

اسی طرح نسیم الریاض میں خفاجی نے شفا میں قاضی عیاض نے بحر المحیط میں ابو حیان اندلسی نے تفسیر کبیر میں امام رازی نے اور دیگر محققین نے اس تمام خرافات کو مردود قرار دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ اس سلسلہ میں نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تفصیل منقول نہیں ہے۔

آیات کی صحیح تفاسیر پھر ان تمام خرافات سے الگ ہو کر ان محققین نے آیات کی جو تفسیریں کی ہیں وہ یا صحیح آثارِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہیں اور یا قرآنِ عزیز کے سیاق و سباق کو پیشِ نظر رکھ کر ذوقِ سلیم کے ذریعہ کی گئی ہیں۔ اس لیے یہی صحیح اور قابلِ توجہ ہیں۔

(۱) علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ دو شخص اچانک محرابِ داؤد میں داخل ہو گئے جہاں حضرت داؤد علیہ السلام عبادتِ الٰہی میں مشغول تھے اور چونکہ ان دونوں کا معاملہ حقیقی اور واقعی تھا اور اُن کو اس کے طے کرانے میں عجلت تھی اسلیے وہ دیوار پھاند کر چلے آئے، حضرت داؤد نے مدعی کا بیان سن کر تذکیر و وعظ کے پیشِ نظر اول زمانے کے فسادِ حال کا ذکر کیا اور فرمایا کہ زبردستوں پر اربابِ قوت کے مظالم کا ہمیشہ یہی

[1] جلد ۲ صفحہ ۱۳۔ [2] الفصل فی الملل والنحل جلد ۴ صفحہ ۱۴۔

حال رہا ہے کہ وہ اُن کی زندگی کو صرف اپنی راحت کا ایک آلہ سمجھتے رہے ہیں اور یہ بہت ہی بُری بات ہے۔ البتہ خدا کے مومن بندے جونکوکار بھی ہیں ایسے مظالم سے بچتے اور خدا کا خوف کرتے ہیں۔ مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

اس کے بعد حضرت داؤد نے انصاف پر مبنی فیصلہ کر کے قضیہ کو ختم کر دیا جب فریقین چلے گئے تو حضرت داؤد کے بلند احساسات نے ان کے قلب و دماغ کو اِدھر متوجہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم الشان حکومت اور بے نظیر سطوت جو ان کو بخشی ہے درحقیقت یہ اُن کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے اور امتحان ہے اس امر کا کہ ذاتِ واحد نے اپنی اس کثیر مخلوق پر مجھ کو جو عزت و بلندی عطا فرمائی ہے، اس سے متعلق عائد شدہ فریضہ کو میں کہاں تک صحیح طور پر انجام دیتا اور خدا کی اس نعمت کا اپنی عملی زندگی سے کس طرح شکر ادا کرتا ہوں ؟

چنانچہ حضرت داؤد پر اس وجدانی کیفیت کا اس قدر اثر پڑا کہ وہ فوراً درگاہِ الٰہی میں سربسجود ہو گئے اور طلبِ مغفرت کرتے ہوئے اعتراف کرنے لگے کہ خدایا! اِس عظیم المرتبت ذمہ داری سے سبکدوش ہونا بھی میری اپنی طاقت سے باہر ہے جب تک کہ تیری اعانت شاملِ حال نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو حضرت داؤد کا یہ عمل پسند آیا اور اس کی مغفرت نے اُن کو اپنی آغوش میں ڈھانپ لیا۔

ابن حزم اس تفسیر کے بعد فرماتے ہیں کہ "استغفار" خدا کی درگاہ میں ایسا محبوب عمل ہے کہ اس کے لیے ہرگز یہ ضروری نہیں کہ اُس سے پہلے گناہ اور معصیت وجود میں آئے اور پھر اس کے ردِ عمل کے طور پر طلبِ مغفرت کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ "استغفار" ملائکۃ اللہ سے بھی ثابت ہے حالانکہ قرآنِ عزیز نے تصریح کی ہے کہ ملائکۃ اللہ کی شان یہ ہے "لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ" (وہ خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو اُن کو حکم دیا جاتا ہے) چنانچہ قرآنِ عزیز نے فرشتوں کے استغفار کا اس طرح ذکر کیا ہے :-

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ	اور وہ فرشتے استغفار کرتے ہیں مومنوں کے لئے
اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ	(اور کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار تو ہر شے پر
رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ	اپنی رحمت اور اپنے علم سے چھایا ہوا ہے تو بخش دے
لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا	ان کو جو تیری جانب رجوع ہوتے ہیں اور تیری راہ
سَبِيْلَكَ	کی پیروی کرتے ہیں۔

ابن حزم کی اس تفسیر کی تائید میں ہم اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں کہ حضرت داؤد کے زیر بحث واقعہ میں قرآن عزیز نے اُن کے عصیان اور گناہ کا مطلق کوئی تذکرہ نہیں کیا بلکہ فَتَنّٰهُ کہہ کر صرف یہ بتایا ہے کہ اُن کو کسی آزمائش میں ڈال دیا گیا اور آزمائش کے لیے ہرگز یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی گناہ اور خطا سے ہی متعلق ہو جیسا کہ حضرت ایوب (علیہ السلام) کے ساتھ امتحان کا معاملہ پیش آیا۔ لہٰذا حضرت داؤد کا یہ معاملہ بھی کسی معصیت یا گناہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ پیغمبرانہ شان کے مطابق احساسِ فرض اور خدا کے حضور میں اپنی عبودیت و بیچارگی کا بہترین مظاہرہ تھا۔

قرآن عزیز کی زیر بحث آیات کے معانی و مطالب اگرچہ اس تفسیر کے متحمل ہیں اور اس سے حضرت داؤد کی پیغمبرانہ جلالتِ شان اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے تاہم یہ تفسیر اجتہادی ہے اس لیے کہ اس میں آزمائش کی جو صورت بیان کی گئی ہے وہ آیت یا کسی حدیث میں مذکور نہیں ہے صرف اجتہاد سے تعلق رکھتی ہے۔

(۲) ابو مسلم نے ان آیات کی تفسیر میں کہا ہے کہ داؤد علیہ السلام کے سامنے جب دو شخصوں نے بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ کے اپنا قضیہ پیش کیا تو حضرت داؤد (علیہ السلام) نے مدعا علیہ کو جواب دہی کا موقعہ دیے بغیر فقط مدعی کا بیان سن کر اپنی نصیحت میں اس قسم کی باتیں فرمائیں کہ جن سے فی الجملہ مدعی کی تائید ہوتی تھی اور چونکہ یہ طریق عام حالات میں انصاف کے خلاف تھا، اس لیے حضرت داؤد کا یہ ارشاد اگرچہ صرف ناصحانہ انداز میں تھا

اور ابھی قضیہ کے انفصال کی نوبت نہیں آئی تھی تاہم ان جیسے جلیل القدر پیغمبر کے شایانِ شان نہیں تھا، لہٰذا یہ تھا وہ "فتنہ" جس میں حضرت داؤدؑ پڑ گئے۔

مگر جب کہ اس قسم کی لغزشوں پر خدائے تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو فوراً متنبہ کر دیتا ہے تو حضرت داؤدؑ کو بھی معاً تنبہ ہوا کہ ان سے قضیہ زیرِ بحث میں لغزش ہو گئی اور ان کے لیے یہ ابتلا اور آزمائش ہے اس لیے وہ خدا کی درگاہ میں طالبِ مغفرت ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو شرفِ قبولیت سے نوازا بلکہ ان کے اس پسندیدہ عمل کی وجہ سے ان کی رفعتِ شان کو اور زیادہ بلند کر دیا۔[1]

ہم اس توجیہ پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو نصیحت فرمائی کہ داؤدؑ! تم دنیا کے عام حاکموں اور بادشاہوں کی طرح نہیں ہو جو اکثر و بیشتر حق و انصاف سے بے پروا ہو کر خدا کی مخلوق پر محض ہواءِ نفس اور ذاتی غرض کی تکمیل کے لیے حکومت کرتے ہیں، تم خدا کی زمین میں اس کی جانب سے نائب اور "خلیفہ" ہو اور خدمتِ خلق تمھاری حیاتِ طیبہ کا طغرائے امتیاز، اس لیے تمھارا فرض ہے کہ ہر لمحہ حق و انصاف کو پیشِ نظر رکھو اور اس معاملہ میں کسی قسم کی بھی لغزش نہ ہونے دو اور صراطِ مستقیم ہی کو اپنی شاہراہ سمجھو، لہٰذا قرآنِ عزیز نے اسی حقیقت کے اظہار کیلئے آیاتِ زیرِ بحث کے بعد اس آیت کو بیان کیا یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ (الآیۃ)

ان ہر دو توجیہات میں دونوں مفسروں نے تصریح کی ہے کہ یہ قضیہ فرضی نہ تھا بلکہ حقیقت پر مبنی تھا اور فریقین ملائکۃ اللہ نہیں تھے بلکہ انسان تھے کیونکہ قرآنِ عزیز کا تبادر یہی ظاہر کرتا ہے۔

آیاتِ زیرِ بحث کی یہ توجیہ بھی اگرچہ استنباط و اجتہادِ نظر سے تعلق رکھتی ہے تاہم آیات کے نظم و ربط کے ساتھ بہت زیادہ مطابق ہے اور اس لیے مفسرین کی نگاہ میں بہت

---

[1] روح المعانی جلد ۲۳ صفحہ ۱۶۸۔

زیادہ مقبول ہے۔

لیکن گزشتہ ہر دو توجیہات میں جُدا جُدا ایک خلش ہے جو قابلِ غور ہے، پہلی توجیہ میں ربطِ آیات کے پیشِ نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آیات کی بیان کردہ اس توجیہ کو تسلیم کر لیا جائے جو ابن حزم نے بیان کی ہے تو پھر اگلی آیت یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ (الآیہ) کا آیاتِ زیرِ بحث کے ساتھ کوئی تعلق اور ربط نظر نہیں آتا کہ اس موقع پر حضرت داؤد کی ایک ایسی اہم فضیلت کے ذکر کے کیا معنی ہیں جو قرآن عزیز میں حضرت آدم (علیہ السلام) کے بعد انبیاء و رُسل میں سے صرف ان ہی کے لیے بیان کی گئی۔

اور ابو مسلم کی توجیہ میں یہ خلش پیدا ہوتی ہے کہ جبکہ فصلِ مقدمات میں دنیوی حُکام اور بادشاہوں کے یہاں بھی یہ مسلّم ہے کہ ہمیشہ فیصلہ فریقین کے بیانات سننے کے بعد ہونا چاہیے بلکہ یوں کہیے کہ یہ طریقِ کار جبکہ ایک طے شدہ فطری مسئلہ ہے تو حضرت داؤد جیسے اولوا العزم پیغمبر کے متعلق یہ کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مدعیٰ علیہ کا بیان سُنے بغیر ہی مدعی کے حق میں فیصلہ دے دیا یا اپنے رجحانِ طبع کا اظہار کر دیا۔ یہ کوئی ایسی باریک و دقیق بات نہیں ہے کہ جو حسبِ اتفاق حضرت داؤد کے فہم و ادراک میں نہ آئی اور اس بارہ میں اُن سے لغزش ہو گئی۔

لٰہذا ان ہر دو توجیہات سے جدا ہمارے نزدیک آیات کی بہتر توجیہ و تفسیر وہ ہے جو نظمِ کلام، ربطِ آیات اور سیاق و سباق میں مطابقت کے لحاظ سے بھی صحیح ہے اور جس کی بنیاد حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے ایک "اثر" پر قائم ہے۔

(۳) حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ حضرت داؤد نے تقسیمِ کار کے پیشِ نظر اپنے معمولات کو چار دنوں پر اس طرح تقسیم کر دیا تھا۔ ایک دن خالص عبادتِ الٰہی کے لیے۔ ایک دن فصلِ مقدمات کے لیے۔ ایک دن خالص ذات کے لیے اور ایک دن بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے عام تھا۔[1]

[1] روح المعانی جلد ۲۳ صفحہ ۱۶۲۔

لیکن تقسیمِ ایام کی اس تفصیل میں اس حصّہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی جو عبادتِ الٰہی کے لیے مخصوص تھا اس لیے کہ یوں تو حضرت داؤد (علیہ السلام) کا کوئی دن بھی عبادتِ الٰہی سے خالی نہ تھا، مگر ایک دن کو انھوں نے صرف اسی کے لیے مخصوص کرلیا تھا اور اس میں دوسرا کوئی کام انجام نہیں دیتے تھے، چنانچہ قرآنِ عزیز اُن کے اس وصف کو "اِنَّهٗ اَوَّابٌ" کہہ کر نمایاں کرتا ہے۔

نیز قرآنِ عزیز اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت داؤد حجرہ بند کرکے عبادت اور تسبیح وتحمید کیا کرتے تھے تاکہ کوئی خلل انداز نہ ہوسکے۔ گویا تقسیمِ ایام میں صرف یہی ایک دن ایسا تھا جس میں حضرت داؤد تک کسی کا پہنچنا سخت دشوار تھا اور بنی اسرائیل سے اُن کا تعلق منقطع ہوجاتا تھا اور باقی ایام میں اگر کوئی خاص ہنگامی صورت پیش آجائے تو حضرت داؤد کے ساتھ واسطہ باقی رہتا تھا اور وہ اپنے معاملات کو اُن کی جانب رجوع کرسکتے تھے۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عبادتِ الٰہی اور خدا کی تسبیح وتہلیل ایک مسلمان کا مقصدِ حیات ہے تاہم خدائے تعالیٰ نے جن ہستیوں کو اپنی مخلوق کی رشد وہدایت اور خدمتِ خلق کے لیے چن لیا ہے اُن کے لیے "کثرتِ عبادت" کے مقابلہ میں "ادائیگیِ فرض میں انہماک" عند اللہ زیادہ محبوب اور پسندیدہ عمل ہے۔ بے شبہ ایک صوفی اور مُرتاض عابد وزاہد جس قدر بھی گوشہ گیر اور خلوت پذیر ہوکر عبادات میں مشغول رہتا ہے "منصبِ ولایت" کے درجات کو اسی قدر زیادہ حاصل کرتا رہتا ہے بخلاف "منصبِ نبوت" و "منصبِ خلافت" کے کہ خدائے تعالیٰ کی جانب سے اس کی موہبت وعطا کی غرض وغایت مخلوق کی رشد وہدایت اور ان کی خدمت وصیانت ہے، اس لیے اس کا کمال مخلوق کے ساتھ رشتہ وتعلق قائم کرکے احکامِ الٰہی کو سربلند کرنا ہے نہ کہ خلوت گزیں ہوکر "صوفی" بننا۔

لہٰذا حضرت داؤد کی یہ تقسیمِ ایام اگرچہ زندگی کے نظم اور تقسیمِ عمل کے لحاظ سے ہر طرح قابلِ ستائش

تھی، لیکن اس میں ایک دن کو عبادتِ الٰہی کے لیے اس طرح خاص کر لینا کہ اُن کا تعلق مخلوقِ خدا سے منقطع ہو جائے "منصبِ نبوت" اور "منصبِ خلافت" کے منافی تھا اور حضرت داؤد (علیہ السلام) جیسے اولوالعزم پیغمبر اور خلیفۃ اللہ کے لیے کسی طرح موزوں نہ تھا، اس لیے کہ حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ نے ایک گوشہ نشین عابد و زاہد اور مرتاض کی حیثیت سے نہیں نوازا تھا بلکہ اُن کو نبوت اور خلافت بخش کر مخلوق کی دینی و دنیوی ہر قسم کی خدمت و ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا تھا اور اس طرح ان کی حیاتِ طیبہ کا شاہکار "ہدایتِ خلق" اور "خدمتِ خلق" تھا نہ کہ "کثرتِ عبادت"۔ چنانچہ حضرت داؤد کی اس روش کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح آزمائش (فتنہ) میں مبتلا کر دیا کہ دو شخص جن کے درمیان ایک خاص مناقشہ تھا عبادت کے مخصوص دن میں حجرہ کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے۔

حضرت داؤد نے اچانک خلافِ عادت اس طرح دو انسانوں کو موجود پایا تو بہ تقاضائے بشری گھبرا گئے۔ دونوں نے صورتِ حال کا اندازہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ آپ خوف نہ کریں۔ ہمارے اچانک اس طرح داخل ہونے کی وجہ یہ قضیہ ہے اور ہم اس کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ تب حضرت داؤد نے واقعات کو سُنا اور مسطورۂ بالا نصیحت فرمائی۔

قرآنِ عزیز نے اس مقام پر قضیہ کے عام پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ وہ ہر فہم رسا میں خود بخود آ جاتے ہیں کہ داؤد (علیہ السلام) کا فیصلہ بلاشبہ حق کے مطابق ہی رہا ہوگا اور اس نے صرف اسی پہلو کو نمایاں کیا جس کا تعلق "رشد و ہدایت" سے تھا، یعنی زبردستوں کا زیردستوں کے ساتھ ظلم کرنا۔

غرض فریقین کا فیصلہ کرنے کے بعد حضرت داؤد (علیہ السلام) کو فوراً تنبہ ہوا کہ مجھ کو خدائے تعالیٰ نے اس آزمائش میں کس لیے ڈالا ہے اور وہ حقیقتِ حال کو سمجھ کر خدا کی درگاہ میں سربسجدہ ہوئے اور استغفار کیا، اور اللہ تعالیٰ نے استغفار کو شرفِ قبولیت عطا فرما کر ان کی عظمت کو اور دو بالا کر دیا اور پھر یہ نصیحت فرمائی کہ "اے داؤد! ہم نے تم کو زمین

میں اپنا "خلیفہ" بنا کر بھیجا ہے اس لیے تمھارا فرض ہے کہ خدا کی اس نیابت کا پورا پورا حق ادا کرو اور یہ خیال رکھو کہ اس راہ میں عدل و انصاف بنیادِ کار رہے اور صراطِ مستقیم سے ہٹ کر کبھی بھی افراط و تفریط کی راہ کو اختیار نہ کرو۔

(۴) قیاس و اجتہاد یا آثارِ صحابہ سے استنباط پر مبنی گزشتہ توجیہات سے جدا مشہور محدث حاکم نے مستدرک میں خود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اِن آیات کی تفسیر نقل کی ہے اور محدثین نے اس روایت کو صحیح اور حسن تسلیم کیا ہے لہٰذا بلا شبہ اس کو مسطورۂ بالا توجیہات پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) حضرت داؤد (علیہ السلام) کی آزمائش کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

ایک مرتبہ حضرت داؤد نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں ازراہِ فخر عرض کیا: بارالٰہا! دن اور رات میں ایک ساعت بھی ایسی نہیں گزرتی کہ داؤد یا آلِ داؤد میں سے کوئی شخص ایک لمحہ کے لیے بھی تیری تسبیح و تہلیل میں مشغول نہ رہتا ہو۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے مقرب پیغمبر داؤد علیہ السلام کا یہ فخریہ انداز پسند نہ آیا۔ وحی آئی، داؤد! یہ جو کچھ بھی ہے صرف ہماری اعانت اور ہمارے فضل و کرم کی وجہ سے ہے ورنہ تجھ میں اور تیری اولاد میں یہ قدرت کہاں کہ وہ اس نظم پر قائم رہ سکیں اور اب جبکہ تم نے یہ دعویٰ کیا ہے تو میں تم کو آزمائش میں ڈالوں گا۔ حضرت داؤد نے عرض کیا۔ خدایا جب ایسا ہو تو پہلے سے مجھ کو اطلاع دیدی جائے لیکن آزمائش کے معاملہ میں حضرت داؤد کی استدعا قبول نہیں ہوئی اور حضرت داؤد کو اس طرح فتنہ میں ڈال دیا گیا جو قرآنِ عزیز میں مذکور ہے۔[1]

یعنی حضرت داؤدؑ اس قضیہ کے فیصلہ دینے میں تسبیح و تحمید سے محروم ہو گئے اور حسبِ اتفاق

[1] مستدرک جلد ۲ صفحہ ۴۳۳۔

آلِ داؤد میں سے بھی اس وقت کوئی عبادتِ الٰہی میں مصروف نہ تھا۔

اس تفسیر کا بھی حاصل یہی نکلتا ہے کہ بمصداق "حسنات الابرار سیئات المقربین" نہ یہ کوئی گناہ کا معاملہ تھا اور نہ معصیت کا بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کے شایانِ شان نہیں تھا اس لیے اُن کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے متنبہ کر دیا گیا۔

غرض قرآنِ عزیز کی ان آیات کی تفاسیر میں علماء محققین نے جو کچھ کہا ہے یا وہ قابلِ تسلیم ہے اور یا ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس کی تفسیر حقیقی تفسیر ہے مگر یہودیوں کی خرافات اور سخوات کا ان آیات سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

عمر مبارک مشہور محدث حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں ایک روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے :-

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ عالمِ بالا میں جب حضرت آدمؑ کی صلب سے اُن کی ذریت کو نکال کر اُن کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے ایک خوبصورت چمکتی ہوئی پیشانی والے شخص کو دیکھ کر دریافت کیا پروردگار یہ کون شخص ہے؟ جواب ملا تمھاری ذریت میں سے بہت بعد میں آنے والی ہستی داؤد ہے۔ حضرت آدمؑ نے عرض کیا اس کی عمر کیا مقرر کی گئی ہے؟ ارشاد ہوا کہ ساٹھ سال۔ حضرت آدمؑ نے عرض کیا۔ الٰہی میں اپنی عمر کے چالیس سال اس نوجوان کو بخشتا ہوں، مگر جب حضرت آدم (علیہ السلام) کی وفات کا وقت آپہنچا تو آدم (علیہ السلام) نے ملک الموت سے کہا کہ ابھی تو میری عمر کے چالیس سال باقی ہیں۔ فرشتۂ موت نے کہا آپ بھول گئے، آپ نے اس قدر حصۂ عمر اپنے ایک بیٹے داؤد کو بخش دیا ہے[1]۔ الخ

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد کی عمر سو سال کی ہوئی اور تورات کے باب سلاطین اور تواریخ میں ہے کہ حضرت داؤد نے کہن سالی میں انتقال فرمایا، اور

[1] مستدرک جلد ۲ کتاب التاریخ۔

اسرائیلیوں پر چالیس سال حکومت کی۔

"اور داؤد بن یسّی نے سارے اسرائیلیوں پر سلطنت کی اور وہ عرصہ جس میں اُس نے اسرائیل پر سلطنت کی چالیس برس کا تھا۔ اس نے حبرون میں سات برس اور یروشلم میں پینتیس برس سلطنت کی اور اس نے بڑھاپے میں خوب عمر رسیدہ ہوکر اور دولت و عزت سے آسودہ ہوکر وفات پائی۔" [1]

اور جعفر بن محمد کہتے ہیں کہ حضرت داؤد نے ستر سال حکومت کی [2] اور حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد کا انتقال اچانک سبت کے دن ہوا۔ وہ سبت کے روز مقررہ عبادت میں مشغول تھے اور پرندوں کی ٹکڑیاں پرے باندھے ہوئے ان پر سایہ فگن تھیں کہ اچانک اسی حالت میں ان کا انتقال ہوگیا۔ [3]

مدفن تورات میں مذکور ہے:۔

اور داؤد اپنے باپ دادا کے ساتھ سوگیا، اور "داؤد کے شہر" صیہون میں دفن ہوا۔ [4]

بصائر حضرت داؤد (علیہ السلام) کی مقدس زندگی کے حالات و واقعات نے ہمارے لیے جن بصیرتوں اور عبرتوں کو پیش کیا ہے وہ اگرچہ بہت وسیع دائرہ رکھتی ہیں تاہم چند اہم حقائق اور بیش بہا نتائج خصوصیت کے ساتھ جاذبِ توجہ ہیں۔

(۱) جب خدائے تعالیٰ کسی ہستی کو اولوالعزم بناتا اور اُس کی شخصیت کو خاص فضائل سے سرفراز کرنا چاہتا ہے تو اُس کے فطری جوہروں کو شروع ہی سے چمکاتا ہے اور اس کی ناصیۂ قسمت ایک چمکتے ہوئے ستارے کی طرح روشن نظر آنے لگتی ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد کو جبکہ پیغمبر اور اولوالعزم رسول بنانا تھا تو زندگی کے ابتدائی دور ہی میں جالوت جیسے جابر و قاہر بادشاہ کو اُن کے ہاتھ سے قتل کرا کر ان کی ہمت و شجاعت اور اُن کے عزمِ راسخ

[1] تواریخ ۱ باب ۲۹- آیات ۲۶- ۲۸- [2] مستدرک، جلد ۲- کتاب التاریخ-
[3] فیض الباری جلد ۲ کتاب الانبیاء- [4] سلاطین (۱) باب ۲ آیت ۱۱-

اور ثبات قدمی کے جوہر اس طرح نمایاں کر دیے کہ تمام بنی اسرائیل اُن کو اپنا محبوب قائد اور مقبول رہنما تسلیم کرنے لگے۔

(۲) بسا اوقات ہم ایک چیز کو معمولی سمجھ لیتے ہیں لیکن حالات و واقعات بعد میں ظاہر کرتے ہیں کہ وہ "بے بہا شے" ہے، چنانچہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے بچپن کے حالات میں اور مجاہدانہ حمایتِ حق، اعتصام باللہ کے ساتھ دعوتِ حق اور سرفرازیِ نبوت کے حالات کے درمیان جو فرق ہے وہ خود اس دعوے کی شہادت ہے۔

(۳) ہمیشہ "خلیفۃ اللہ" اور "طاغوتی بادشاہ" کے درمیان یہ فرق نظر آئے گا کہ اول الذکر میں ہر قسم کی سطوت و شوکت کے باوجود فروتنی، تواضع اور خدمتِ خلق نمایاں خدوخال کے ساتھ پائے جائیں گے اور ثانی الذکر میں کبر، انانیت، جبر اور قہرمانیت کا غلبہ ہوگا اور وہ مخلوقِ خدا کو اپنی راحت اور عیش کا آلۂ کار سمجھے گا۔

(۴) قانونِ الٰہی ہے کہ جو ہستی عزت اور عروج پر پہنچنے کے بعد جس قدر خدا کا شکر اور اُس کے فضل و کرم کا اعتراف کرتی ہے اُسی قدر اُس کو بیش از بیش انعام و اکرام سے اور زیادہ نوازا جاتا ہے حضرت داؤد (علیہ السلام) کی پوری زندگی اس کی شاہدِ عدل ہے۔

(۵) مذہب اور دین اگرچہ روحانیت سے زیادہ تعلق رکھتا ہے لیکن مادی طاقت (خلافت) اُس کی بڑی پشت پناہ ہے۔ یعنی دین و ملت دینی و دنیوی اصلاحِ حال کا کفیل ہے اور خلافت و طاقت اس کے بتائے ہوئے نظامِ عدل کی محافظ، چنانچہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کا یہ قول بہت مشہور ہے:۔

ان اللّٰہ لیزع بالسلطان	بلاشبہ اللہ تعالیٰ صاحبِ طاقت (خلیفہ) کے ذریعہ
مالا یزع بالقرآن [1]	مدافعت کا وہ کام لیتا ہے جو قرآن کریم کے ذریعہ انجام نہیں پاتا۔

(۶) اللہ تعالیٰ نے عطاءِ ملک و حکومت کے لیے قرآنِ عزیز کی مختلف آیات میں جو

---

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ صفحہ ۱۰۔

ارشاد فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان کو یہ یقین پیدا کرنا چاہیئے کہ ملک اور حکومت کی عطا اور اس کا سلب صرف خدائے تعالیٰ کے یدِ قدرت میں ہے۔ چنانچہ دنیا کے بڑے بڑے شاہنشاہوں اور باجبروت سلاطین کی تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے کہ

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ	خدایا! شاہی اور جہانداری کے مالک! تو جسے
مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ	چاہے ملک بخش دے جس سے چاہے ملک لے لے،
تَشَاۗءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ	جسے چاہے عزت دیدے جسے چاہے ذلیل کرے،
مَنْ تَشَاۗءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ	تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے۔ بے شبہ تو
عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (آل عمران)	ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

لیکن اُس نے اس بخشش و عطاء اور سلب و نزع کا ایک قانون مقرر کر دیا ہے جس کو سنۃ اللہ سے تعبیر کرنا مناسب ہے۔

قانون یہ ہے کہ اقوام و اُمم کو حکومت و سلطنت دو طرح حاصل ہوتی ہے، ایک "وراثتِ الٰہی" کی معرفت اور دوسری "دنیوی اسباب و وسائل" کی معرفت، پہلی صورت میں کسی قوم کو جب حکومت عطا ہوتی ہے کہ اس کے عقائد و اعمال میں پوری طرح وراثتِ الٰہی کار فرما ہو یعنی خدائے تعالیٰ کے ساتھ اُس کا رشتۂ عقیدت بھی صحیح اور استوار ہو اور وہ انفرادی و اجتماعی اعمال میں بھی صلاح و خیر کے اس درجہ پر فائز ہو کہ قرآنِ عزیز کی اصطلاح میں اس کو "صالحین" میں شمار کیا جا سکے۔

یہ قوم بے شبہ اس کی مستحق ہے کہ وہ خدا کے اس انعام سے بہرہ ور ہو جس کا عنوان "خلافتِ الٰہیہ" ہے، اور جو درحقیقت دنیا میں خدائے تعالیٰ کی نیابت کا مظہر اور انبیاء و رسل کی پاک وراثت ہے۔ خدا کا وعدہ ہے کہ جو قوم بھی عقائد و اعمال میں انبیاء و رسل کی وراثت سے فیض یاب ہے وہ وراثتِ ارضی کی بھی مالک ہو گی اور اگر دنیوی اسباب و وسائل کے پہاڑ بھی اُس کے حصول کے درمیان حائل ہوں گے تو ان سب کو زیر و زبر کر کے

خدائے تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا، چنانچہ ارشاد ہے:-

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ	اور ہم نے بے شبہ زبور میں نصیحت کے بعد
الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ	یہ لکھ دیا کہ خدا کی زمین کے وارث میرے
الصّٰلِحُونَ ۝	نیک بندے ہوں گے۔

اور آیت:

إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ يُورِثُهَا	بے شک زمین اللہ کی ہی ملکیت ہے، وہ اپنے بندوں
مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ	میں سے جس کو چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے۔

میں اس کی مشیت کا یہی فیصلہ ہے کہ زمین کی وراثت اُن ہی کو نصیب ہوتی ہے جو اُس کے "صالح بندے" ہیں اور اگر کسی قوم یا اُمت میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے تو خواہ وہ مدعیِ اسلام ہی کیوں نہ ہو تو اس کو وراثتِ ارض نصیب نہیں ہو سکتی اور "خلافتِ الٰہیہ" اس کا حق نہیں بن سکتی ہے اور نہ اُس قوم کی عظمت و عزت کے لیے خدا کے پاس کوئی وعدہ ہے، البتہ خدا کی مشیت اپنی حکمت و مصلحت کے پیشِ نظر کائنات کے نظم و انصرام کی خاطر جس کو چاہتی ہے حکومت عطا کر دیتی ہے، اور جس سے چاہتی ہے سلب کر لیتی ہے اور اس عطاء و سلب میں اس کا قانونِ قدرت اسی طرح کارفرما رہتا ہے جس طرح اسباب کو مسببات کے ساتھ پیوند لگانے میں کارفرما ہے اور اس عطاء و نزع کے لیے اس قدر مختلف اور بیشمار مصالح ہوتے ہیں کہ انسان اُن کی حقیقت تک رسائی سے عاجز ہے اور اس سلسلہ کی سب سے بھیانک اور بدبخت صورت یہ ہے کہ مسلمان "غلام و محکوم" ہوں اور کفر و شرک کی حکومت اُن پر "بحیثیتِ حاکم اور صاحبِ اقتدار" ہو۔ گویا یہ خدا کا ایسا عقاب و عتاب ہے جو مسلمانوں کے لیے بداعمالیوں اور صلاح و خیر کی استعداد کے فقدان کی وجہ سے منصۂ شہود پر آتا ہے اور اس حالت میں مقامِ عبرت یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ تاج و تخت کو اس لیے حکومت نہیں دی جاتی کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہے بلکہ اس لیے عطا کی جاتی ہے کہ

زمین کی ملکیت کے حقیقی وارثوں نے اپنی بدکرداریوں کی وجہ سے استحقاقِ وراثت کو ہاتھ سے کھو دیا اور اب کائنات کے مصالحِ عامہ کے پیشِ نظر حکومت کے لیے نہ مسلم کی شرط ہے نہ کافر و مشرک کی۔

وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ — اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنا ملک بخش دیتا ہے

اور اگر مسلمان چشمِ عبرت وا کریں اور اپنی فاسد زندگی میں انقلاب برپا کر کے "صالحین" کا طغرائے امتیاز حاصل کرلیں تو خدا کا وعدہ بھی ان کو بشارت دینے کیلیے آگے بڑھتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	وعدہ کرلیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم
مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	میں ایمان والے ہیں اور کیے ہیں انھوں
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ	نے نیک کام البتہ بعد کو حاکم کردے گا اُن کو
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ	ملک میں، جیسا حاکم کیا تھا اُن کے اگلوں
قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ	کو اور جمادے گا ان کے لیے دین جو پسند
دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى	کرلیا اُن کے واسطے اور دے گا
لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ	ان کو ان کے خوف کے بدلے
بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ	امن۔



حضرتِ سُلیمانؑ علیہ السلام

نسب۔ قرآنِ عزیز اور ذکرِ سلیمان۔ بچپن۔ وراثتِ داؤد۔ نبوت۔ خصائص سلیمان۔ منطق الطیر۔ تسخیرِ ریاح۔ تسخیرِ جن و حیوانات۔ بیت المقدس کی تعمیر۔ تانبے کے چشمے۔ حضرت سلیمان اور جہاد کے گھوڑوں کا واقعہ۔ محاکمہ۔ حضرت سلیمان کی آزمائش کا واقعہ۔ محاکمہ۔ لشکرِ سلیمان اور وادیٔ نملہ۔ حضرت سلیمان اور ملکۂ سبا۔ چند قابلِ تحقیق مسائل۔ سبا کی تحقیق۔ ملکۂ سبا کا نام۔ ہدہد۔ ملکۂ سبا کا تخت۔ عندہ علم من الکتاب کی شخصیت۔ توراۃ میں ملکۂ سبا کا ذکر۔ ملکۂ سبا کا قبولِ اسلام۔ ملکۂ سبا کے ساتھ حضرت سلیمان کا نکاح۔ اسرائیلیات۔ حضرت سلیمان کے مکتوب کا اعجاز۔ حضرت سلیمان کے ساتھ بنی اسرائیل کا معاملہ۔ حضرت سلیمان کی وفات۔ بصائر۔

نسب حضرت سلیمان (علیہ السلام) حضرت داؤد (علیہ السلام) کے صاحبزادے ہیں اسلیے ان کا نسب بھی یہودا کے واسطہ سے حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

ان کی والدہ ماجدہ کا نام معلوم نہیں ہوسکا، تورات نے بنتِ سبع نام بتایا ہے لیکن اس طرح کہ وہ اوّل اوریاہ کی بیوی تھی اور پھر داؤد علیہ السلام کی بیوی بنی اور حضرت سلیمانؑ اس سے پیدا ہوئے۔ مگر اس قصہ کی لغویت گزشتہ صفحات میں واضح ہو چکی ہے اس لیے یہ نام بھی تاریخی حیثیت سے صحیح نہیں ہے۔

ابن ماجہ کی ایک حدیث میں صرف اس قدر منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سلیمان بن داؤد کی والدہ نے ایک دفعہ سلیمان (علیہ السلام) کو یہ نصیحت فرمائی: بیٹا رات بھر نہ سوتے رہا کرو اس لیے کہ رات کے اکثر حصہ کو نیند میں گزارنا انسان کو قیامت کے دن اعمالِ خیر سے محتاج بنا دیتا ہے۔

قرآنِ عزیز نے بھی صرف اسی قدر بتایا ہے کہ وہ حضرت یعقوب کے واسطہ سے

حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ	اور ہم نے اس (ابراہیم) کو بخشے اسحٰق ویعقوب،
كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا	ہم نے ہر ایک کو ہدایت دی اور نوح کو ہدایت دی
مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ	اس (ابراہیم) سے پہلے اور اس ابراہیم کی اولاد
وَسُلَيْمٰنَ ۔ (الانعام پ ۷ ع ۱)	میں سے داؤد اور سلیمان کو ہدایت دی۔
وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ (صٓ)	اور ہم نے داؤد کو سلیمان دیا۔

قرآنِ عزیز اور ذکرِ سلیمان قرآنِ عزیز میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا ذکر سولہ جگہ آیا ہے ان میں سے چند جگہ کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اور اکثر جگہ مختصر طور پر اُن انعامات اور فضل وکرم کا تذکرہ ہے جو خدا کی جانب سے اُن پر اور ان کے والد حضرت داؤد (علیہ السلام) پر نازل ہوتے رہے۔

ذیل کا نقشہ اس سلسلہ کے مطالعہ کے لیے مفید ہے :-

سورة	آیة	شمار	سورة	آیة	شمار
بقرہ	۱۰۲	۱	نمل	۱۵-۱۶-۱۷-۱۸-۲۰-۳۶-۴۴	۷
نساء	۱۶۳	۱	سباء	۱۲	۱
انعام	۸۵	۱	صٓ	۳۰-۳۴	۲
انبیاء	۷۸-۷۹-۸۱	۳			۱۶

بچپن اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) میں ذکاوت اور فصلِ مقدمات میں اصابتِ رائے کا کمال فطرت ہی سے ودیعت کر دیا تھا چنانچہ اُن کے بچپن کا وہ واقعہ اس کے لیے روشن بُرہان ہے جو حضرت داؤد کے واقعات کے ضمن میں قرآنِ عزیز سے نقل کیا جا چکا ہے۔[1]

[1] آیت "وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِى الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ (الآیۃ) کی جانب اشارہ ہے۔

حضرت داؤد نے اُن کے اس جوہر کو پہچان لیا تھا اس لیے بچپن ہی سے اُنکو امورِ مملکت میں شریک کار رکھتے تھے۔ خصوصًا فصلِ مقدمات میں ان سے ضرور مشورہ فرمالیا کرتے تھے۔

وراثتِ داؤدؑ | مورخین کہتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ سن رشد کو پہنچ چکے تھے کہ حضرت داؤدؑ کا انتقال ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو نبوت اور حکومت دونوں میں داؤد (علیہ السلام) کا جانشین بنادیا اور اس طرح فیضانِ نبوت کے ساتھ ساتھ اسرائیلی حکومت بھی انکے قبضہ میں آگئی۔ قرآنِ عزیز نے اسی جانشینی کو وراثتِ داؤد سے تعبیر کیا ہے:۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ (نمل) — اور سلیمان داؤد کا وارث ہوا۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہاں وراثت سے نبوت و سلطنت کی وراثت مراد ہے مالی وراثت مراد نہیں ہے ورنہ حضرت داؤد کی اور بھی بہت سی اولاد تھی وہ کیوں محروم رہتی نیز صحاح ستہ میں متعدد جلیل القدر صحابہ سے یہ روایت منقول ہے:۔

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ہم
قال نحن معشر الانبیاء لا نُورَثُ	جماعت انبیاء کی وراثتِ مالی کا سلسلہ نہیں چلتا
ماترکنا فهو صدقة (الحدیث)	اور ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوجاتا ہے۔

یہ روایت صراحت کرتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی وفات کے بعد اُن کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا بلکہ وہ مساکین اور فقراء کا حق ہے اور خدا کے نام پر صدقہ ہے۔

دراصل نبی کی فطرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ مال جیسی حقیر شے پر اُن کی وراثت کا انتساب ہو اس لیے کہ جن ہستیوں کا مقصدِ حیات تبلیغ وارشاد اور راہِ خدا کی دعوت ہو وہ کب یہ گوارا کرسکتی ہیں کہ علوم و فیوض نبوت کے علاوہ ایک ادنیٰ شے ان کی وراثت قرار پائے اس لیے بربناءِ بشریت بقاءِ حیات کے لیے وہ جو کچھ مال کی صورت میں رکھتے تھے پس مردن صرف خدا کی ملکیت ہوجانا چاہیے جو فقراء اور مساکین ہی کا حصہ ہوسکتا ہے نہ کہ اُس اولوالعزم ہستی کے نسل وخاندان کا۔

نبوتؐ | جن انبیاء ورُسل کی صحیح تاریخ منضبط ہے اُس سے اور قرآنِ عزیز کی بعض آیات کی

صراحت[1] سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس ہستی کو شرفِ نبوت سے سرفراز کرتا ہے اس کو یہ منصبِ جلیل سنِ رشد کے بعد عطا فرماتا ہے تاکہ وہ دنیوی اسباب کے لحاظ سے بھی عمرِ طبعی کا وہ حصہ طے کر لے جس میں عقل و تجربہ پختگی اختیار کر لیتے ہیں اور اس حد پر پہنچ کر استعداد کے مطابق انسانوں کے قوائے فکری و عملی میں استواری اور استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ سنت اللہ حضرت سلیمان کے حق میں بھی کارفرما رہی اور سنِ رشد کے بعد ان کو حکومت و خلافت کے ساتھ ساتھ "منصبِ نبوت" بھی منجانب اللہ عطا ہوا۔

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا	بیشک ہم (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تیری طرف وحی
إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ ۚ	بھیجی جس طرح ہم نے نوح کی جانب وحی بھیجی اور اس
وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ	کے بعد دوسرے پیغمبروں کی طرف وحی بھیجی اور ابراہیم
وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ	کی جانب اسمٰعیل کی اسحٰق کی یعقوب کی اور اس کی اولاد
وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ	کی جانب اور عیسیٰ کی اور ایوب کی اور یونس کی اور
وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ ۚ (نساء پ ۶)	ہارون کی اور سلیمان کی جانب وحی بھیجی۔

وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا (الانبیاء) اور (داؤد و سلیمان) ہر ایک کو ہم نے حکومت دی اور علم (نبوت) دیا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا (نمل) اور بیشک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم (نبوت کا علم) دیا۔

خصائصِ سلیمانؑ | پھر حضرت داؤد کی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو بھی بعض خصوصیات اور امتیازات سے نوازا اور اپنی نعمتوں میں سے بعض ایسی نعمتیں عطا فرمائیں جو ان کی زندگی مبارک کا طغرائے امتیاز بنیں۔

(۱) منطق الطیر | اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ دونوں کو یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ وہ چرند و پرند کی بولیاں سمجھ لیتے تھے اور دونوں بزرگوں کے لیے ان کی آوازیں ایک ناطق انسان کی گفتگو کی طرح تھیں۔

قرآنِ عزیز نے سلیمان (علیہ السلام) کے اس شرف کا اس طرح ذکر کیا ہے:۔

[1] آیت وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ (الانبیاء) کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًاۚ	اور بیشک ہم نے داؤد اور سلیمان کو "علم" دیا، اور
وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى	ان دونوں نے کہا: حمد اللہ کے لیے ہی زیبا ہے جس
كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَوَرِثَ	نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہم کو فضیلت
سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ	عطا فرمائی اور سلیمان داؤد کا وارث ہوا اور اس
عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ	نے کہا: اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولیوں کا علم
كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ	دیا گیا ہے اور ہم کو ہر چیز بخشی گئی ہے، بیشک یہ
الْمُبِيْنُ ۝ (نمل پ ۱۹ ع ۲)	(خدا کا) کھلا ہوا فضل ہے۔

اس مقام پر "منطق الطیر" کا جس اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اُس کو پیش نظر رکھ کر یہ بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ اپنے قیاس و تخمین کے ذریعہ ان کی مختلف قسم کی آوازوں سے صرف اُن کے مقصد اور مراد کو سمجھ لیتے تھے، اور اس سے زیادہ کچھ نہ تھا" اس لیے کہ قیاس و تخمین کا یہ درجہ تو بکثرت لوگوں کو حاصل ہے اور وہ پالتو جانوروں کی بھوک پیاس کے وقت کی آواز، خوشی اور مسرت کی آواز، مالک کو قریب دیکھ کر اظہارِ وفاداری کی آواز اور دشمن کو دیکھ کر خاص طرح سے پکارنے کی آواز کے درمیان بخوبی فرق سمجھتے اور اُن کے اُن مقاصد کو بآسانی ادراک کر لیتے ہیں۔ نیز "منطق الطیر" سے وہ علم بھی مراد نہیں ہو سکتا، جو جدید علمی دور میں ظن و تخمین کی راہ سے بعض جانوروں کی گفتگو کے سلسلہ میں ایجاد ہوا ہے اور جو زولوجی (ZOOLOGY) کا ایک شعبہ شمار کیا جاتا ہے اس لیے کہ یہ محض اٹکل کا تیر ہے جو مسطورۂ بالا تجربہ کے بعد گمانِ علم سے نکلا ہے اور اس کو علم بمرتبۂ یقین کہنا خود واضعینِ علم الحیوانات کے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے علاوہ ازیں وہ ایک اکتسابی فن ہے جو ہر شخص کو تھوڑی سی محنت کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت داؤد و سلیمان کے اس علم کیلیے قرآنِ عزیز کو اس قدر اہم پیرایۂ بیان کی ضرورت نہیں تھی۔

قرآنِ عزیز نے جس انداز میں اس کا ذکر کیا اور حضرت سلیمان کے شکریہ کے اندازِ بیان کو

نقل کیا ہے اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (علیہما السلام) کے لیے یہ ایسی عظیم الشان نعمت تھی جس کو نشان (معجزہ) کہا جاتا ہے اور وہ بے شبہ پرندوں کی بولیاں انسانِ ناطق کی گفتگو کی طرح سمجھتے تھے اور یقیناً ان کا یہ علم اسبابِ دنیوی سے بالاتر خاص قوانینِ قدرت کے فیضان کا نتیجہ تھا۔

لہٰذا عقل اس بارہ میں صرف یہیں تک جا سکتی ہے کہ اُس کے نزدیک یہ محال بات نہیں ہے کیونکہ لغت اور عقل دونوں کے لحاظ سے "نطق" کے لیے صرف صوت کا ہونا کافی ہے اور اس کے لیے انسانوں کی طرح کی گویائی ضروری نہیں ہے اور چرند و پرند کی بولیوں میں صوت اور صوت کا نشیب و فراز دونوں موجود ہیں پس منطق الطیر ایسی بخشش اور موہبت تھی جس کو خدا کا نشان کہنا چاہیئے اور جو اُن ہی جیسی پاک ہستیوں کے لیے مخصوص ہے، بیضاوی کے اور ہمارے درمیان "منطق الطیر" کی تفسیر سے متعلق اس پر تو اتفاق ہے کہ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد حیوانات کی بولیاں جس طریقے سے یقینی طور پر سمجھ لیا کرتے تھے وہ عام علمی تدوین سے جدا اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُن کو بطورِ نشان کے عطا ہوا تھا البتہ اُس کی تفصیل میں یہ فرق ہے کہ قاضی بیضاوی کے نزدیک حیوانات کی بولیاں مختلف کیفیات کی صورت میں تخیل کی مدد سے سمجھی جاتی ہیں اور اس کا یقینی درجہ کسب کے ذریعہ سے نہیں بلکہ موہبتِ الٰہی سے حاصل ہوتا ہے جو حضرت داؤد و سلیمان کو حاصل تھا اور ہمارے نزدیک دونوں اولوالعزم پیغمبر اُن کی بولیاں اس طرح سنتے تھے جس طرح انسان کی گفتگو خواہ اس لیے کہ یہ صرف معجزہ تھا جو ان کے ہاتھ پر دکھلایا گیا اور عام طور پر ان کی بولیاں محض مختلف کیفیاتِ صوت سے پہچانی جاتی ہیں[1] اور خواہ یہ ہو کہ حقیقۃً ان کی صوت بھی نُطق کا ایسا درجہ رکھتی ہے جس سے وہ صاف صاف ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھاتے اور سمجھتے ہیں لیکن وہ انسانی نطق سے بہت کمزور درجہ کا ہے، حضرت سلیمان اور ہُدہُد

---

[1] علماءِ علم الحیوانات کہتے ہیں کہ ٹیلی گراف کی صوتی حرکات کی طرح جانوروں کی بولیاں بھی باہم بولی اور سمجھی جاتی ہیں اور ان میں آواز کے زیر و بم کو بھی دخل ہے اور مکرر سہ کرر ادا کو بھی۔ بلکہ کہنا یوں چاہیئے کہ تار کے گٹ، گر کے ایجاد کا تخیل حیوانوں کی آواز سے ہی ماخوذ ہے۔

کے مکالمہ کو جس انداز میں قرآن نے بیان کیا ہے وہ میری توجیہ کی تائید کرتا ہے۔

۲۔ تسخیرِ ریاح | حضرت سلیمان کی نبوت حقہ کے خصوصی امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے "ہوا" کو ان کے حق میں مسخر کر دیا تھا اور وہ اُن کے زیرِ فرمان کر دی گئی تھی، چنانچہ حضرت سلیمان جب چاہتے تو صبح کو ایک مہینہ کی مسافت اور شام کو ایک مہینہ کی مسافت کی مقدار سفر کر لیتے تھے۔

قرآنِ عزیز نے حضرت سلیمان کے اس شرف کے متعلق تین باتیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ "ہوا" کو سلیمان کے حق میں مسخر کر دیا گیا۔ دوسری یہ کہ "ہوا" ان کے حکم کے اس طرح تابع تھی کہ شدید اور تیز و تند ہونے کے باوجود اُن کے حکم سے "نرم" اور آہستہ روی کے باعث "راحت رساں" ہو جاتی تھی۔ تیسری بات یہ کہ نرم رفتاری کے باوجود اس کی تیز روی کا یہ عالم تھا کہ حضرت سلیمان کا صبح و شام کا جدا جدا سفر ایک شہسوار کی مسلسل ایک ماہ کی رفتارِ مسافت کے مساوی ہوتا تھا، گویا تختِ سلیمان (علیہ السلام) انجن اور مشین جیسے اسباب ظاہر سے بالاتر صرف خدائے تعالیٰ کے حکم سے ایک بہت تیز رفتار ہوائی جہاز سے بھی زیادہ تیز مگر سُبک روی کے ساتھ ہوا کے کاندھے پر اُڑا چلا جاتا تھا۔

ایک فطرت پرست انسان کی نگاہ میں یہ بات بہت کھٹکتی ہے، مگر ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جبکہ عقل و فکر کے نزدیک یہ مسلمات میں سے ہے کہ انسان کے قوائے فکری و عملی کے درمیان اس درجہ تفاوت ہے کہ ایک شخص جس شے کو اپنی عقل سے کرتا اور اس کا کرنا آسان سمجھتا ہے دوسرا شخص اسی شے کو ناممکن اور محال یقین کرتا ہے تو اسی اصول پر ان کو یہ تسلیم کرنے میں کیوں انکار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عام قوانینِ قدرت کے پیشِ نظر کائنات کی اشیاء کو اسباب کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اسی طرح اس کے کچھ خاص قوانینِ قدرت اور نوامیسِ فطرت بھی ہیں جو ایسے امور کے لیے مخصوص ہیں جیسا کہ امرِ زیرِ بحث ہے اور نفوسِ قدسیہ (انبیاء علیہم السلام) کو ان کا اسی طرح یقینی علم حاصل ہوتا ہے جس طرح اسباب کے ذریعہ مسببات کے وجود کا علم عام عقلاء کو حاصل ہے اور موجودہ دنیوی علوم کی دسترس اس علم تک نہیں ہے لہٰذا جب

ایسے امور کے وقوع کی اطلاع علم الیقین (وحی الٰہی) کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے تو محض ظن و تخمین اور عقل کے استبعاد کی وجہ سے ایک حقیقتِ ثابتہ کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے اور اگر ہم کو ایک شے کا علم نہیں ہے تو یہ کیسے لازم آجاتا ہے کہ وہ شے حقیقۃً بھی موجود نہیں ہے۔ ؟

لہٰذا جادۂ مستقیم یہی ہے کہ واقعۂ تسخیرِ ریاح اور مسافتِ رفتار کو بغیر کسی تاویل کے صحیح تسلیم کیا جائے البتہ اس مقام پر تختِ سلیمان اور حضرت سلیمان کے صبح و شام سفر کے متعلق جو تفصیلات سیرت کی کتابوں اور تفسیروں میں منقول ہیں وہ سب اسرائیلیات کا ذخیرہ ہیں اور لاطائل تفصیلات ہیں اور تعجب ہے کہ ابن کثیرؒ جیسے محقق کہ اس جگہ وہ بھی ان روایات کو اس طرح نقل فرما رہے ہیں گویا ان کے نزدیک وہ مسلمات میں سے ہیں حالانکہ تاریخی اعتبار سے اُن پر بہت سے صحیح اشکالات وارد ہوتے ہیں، قرآن عزیز نے تو اس کے متعلق صرف اس قدر بیان کیا ہے:۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ	اور مسخر کردیا سلیمان کے لیے تیز و تند ہوا کو کہ اُس
بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ	کے حکم سے زمین پر چلتی تھی جس کو ہم نے برکت دی
وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ (انبیاء پ ۱۷)	تھی اور ہم ہر شے کے جاننے والے ہیں۔
وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ	اور سلیمان کے لیے مسخر کردیا ہوا کو کہ صبح کو ایک مہینہ کی مسافت
وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ (سبا پ ۲۲)	(طے کراتی) اور شام کو ایک مہینہ کی مسافت۔
فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ	اور مسخر کردیا ہم نے اُس (سلیمان) کے لیے ہوا کو کہ چلتی ہے
رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ۙ (ص پ ۲۳)	وہ اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ جہاں وہ پہنچنا چاہے۔

تسخیرِ جن و حیوانات

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی حکومت کا ایک بڑا امتیاز جو کائنات میں کسی کو نصیب نہیں ہوا یہ تھا کہ اُن کے زیرِ نگیں صرف انسان ہی نہیں تھے بلکہ جن اور حیوانات بھی تابعِ فرمان تھے اور یہ سب حضرت سلیمان کے حاکمانہ اقتدار کے تابع اور زیرِ حکم تھے۔

بعض ملاحدہ نے "انکارِ معجزہ" اور "انکارِ جن" کے شوق میں ان جیسے دیگر مقامات کی طرح یہاں

بھی عجیب مضحکہ خیز باتیں کہی ہیں، کہتے ہیں کہ جن سے مُراد ایک ایسی قوم ہے جو اس زمانہ میں بہت قوی ہیکل اور دیو پیکر تھی اور سلیمان کے علاوہ کسی کے قابو میں نہ آتی تھی اور تسخیر حیوانات کے متعلق کہتے ہیں کہ قرآن میں اس سلسلہ کا ذکر صرف ہُدہُد سے تعلق ہے اور یہاں ہُدہُد پرند مُراد نہیں ہے، بلکہ ایک شخص کا نام ہُدہُد تھا جو پانی کی تفتیش پر مقرر تھا اور زمانۂ طویل سے لوگوں میں رسم چلی آتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے نام اُن حیوانات کے نام پر رکھتے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے چنانچہ آج اس کو ایک مستقل علم کی حیثیت دیدی گئی ہے جو ٹوٹیزم (TOOTISM) کے نام سے موسوم ہے۔

اس قسم کی رکیک تاویل کرنے والے یا تو جذبۂ الحاد میں قصداً تحریف کے لیے جرأت بیجا کے مرتکب ہوتے ہیں اور یا قرآنِ عزیز کی تعلیم سے ناآشنا ہونے کے باوجود دعویٔ بے دلیل پر اصرار کرتے ہیں۔

قرآنِ عزیز نے "جن" کے متعلق جگہ جگہ بصراحت یہ اعلان کیا ہے کہ وہ بھی انسانوں سے جُدا خدا کی ایک مخلوق ہے، چنانچہ ہم تفصیل کے ساتھ قصص القرآن جلد اوّل میں اس پر بحث کر آئے ہیں اور یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کرتے ہیں جو اس بارہ میں قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہے:-

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ○ — اور ہم نے جن اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ خدا کے طاعت گذار ثابت ہوں۔

اس آیت میں جن کو انسان سے جُدا مخلوق ظاہر کر کے دونوں کی تخلیق کی حکمت بیان کی گئی ہے، لہٰذا اس آیت کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد یہ کہنا کہ "جن" انسانوں ہی میں سے ایک قوی ہیکل قوم کا نام ہے جہالت ہے علم نہیں ہے۔

اسی طرح جبکہ ہُدہُد کے واقعہ میں قرآنِ عزیز نے صاف صاف اس کو پرند کہا ہے تو کسی کو کیا حق ہے کہ اُس کے خلاف لچر تاویل کی پناہ لے۔ قرآنِ عزیز میں ہے:-

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ ○ (نمل پ ۱۹ ع ۲) — اور سلیمان نے پرندوں کا جائزہ لیا تو کہا: یہ کیا بات ہے کہ میں ہُدہُد کو نہیں دیکھتا، کیا وہ غائب ہے۔

غرض سلیمان کو اللہ تعالیٰ نے یہ بے مثل شرف عطا فرمایا کہ اُن کی حکومت انسانوں کے علاوہ جن، حیوانات اور ہوا پر بھی تھی اور یہ سب بحکمِ خدا اُن کے حکم کے تابع اور مطیع تھے اور یہ سب کچھ اس لیئے ہوا کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے ایک مرتبہ درگاہِ الٰہی میں یہ دعاء کی:۔

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَھَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا	اے پروردگار مجھ کو بخش دے اور میرے لیے
یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اِنَّکَ	ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کے لیے بھی
اَنْتَ الْوَھَّابُ ۝ (ص پ ۲۳ ع ۳)	میسر نہ ہو، بے شک تو بہت دینے والا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعاء کو قبول فرمایا اور ایک ایسی عجیب و غریب حکومت عطا فرمائی کہ نہ اُن سے پہلے کسی کو نصیب ہوئی اور نہ اُن کے بعد کسی کو میسر آئے گی۔

حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ارشاد فرمایا: گزشتہ شب ایک سرکش جن نے اچانک یہ کوشش کی کہ میری نماز میں خلل ڈالے مگر خدائے تعالیٰ نے مجھ کو اس پر قابو دے دیا اور میں نے اس کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ اُس کو مسجد کے ستون سے باندھ دوں تاکہ تم سب دن میں اس کو دیکھ سکو مگر اس وقت مجھ کو اپنے بھائی سلیمان (علیہ السلام) کی یہ دعاء یاد آگئی کہ انھوں نے خدائے تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا: "رَبِّ ھَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ" یہ یاد آتے ہی میں نے اُسکو ذلیل کر کے چھوڑ دیا[1]۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد: "فذکرت دعوۃ اخی سلیمٰن" کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ خدائے تعالیٰ نے مجھ میں کل انبیاء و رُسل کے خصائص و امتیازات جمع کر دیے ہیں اور اس لیے تسخیرِ قومِ جن پر بھی مجھ کو قدرت حاصل ہے لیکن جبکہ حضرت سلیمان نے اس اختصاص کو اپنا طغرائے امتیاز قرار دیا ہے تو میں نے اس سلسلہ کا مظاہرہ مناسب نہیں سمجھا۔

بیت المقدس کی تعمیر

حق تعالیٰ نے "جن" کو ایسی مخلوق بنایا ہے جو مشکل سے مشکل اور سخت سے سخت کام انجام دے سکتی ہے۔ اس لیے حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے یہ ارادہ فرمایا کہ مسجد (ہیکل) کے چہار جانب ایک عظیم الشان شہر آباد کیا جائے، اور مسجد کی تعمیر بھی از سرِ نو کی جائے،

[1] بخاری کتاب الانبیاء و [illegible] ص ۳۵۶۔

اُن کی خواہش یہ تھی کہ مسجد اور شہر کو بیش قیمت پتھروں سے بنوائیں اور اس کے لیے بعید سے بعید اطراف سے حسین اور بڑے بڑے پتھر منگوائیں۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے رسل و رسائل کے محدود اور مختصر وسائل سلیمان (علیہ السلام) کی خواہش کی تکمیل کے لیے کافی نہیں تھے اور یہ کام صرف "جن" ہی انجام دے سکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے "جن" ہی سے یہ خدمت لی، چنانچہ وہ دور دور سے خوبصورت اور بڑے بڑے پتھر جمع کر کے لاتے اور بیت المقدس کی تعمیر کا کام انجام دیتے تھے۔

عام طور سے یہ مشہور ہے کہ مسجدِ اقصٰی اور بیت المقدس کی تعمیر حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے زمانہ میں ہوئی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ بخاری اور مسلم کی صحیح مرفوع حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاری نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، یارسول اللہ دنیا میں سب سے پہلی مسجد کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا مسجدِ حرام، ابوذرؓ نے پھر دریافت کیا۔ اس کے بعد کون سی مسجد عالمِ وجود میں آئی؟ آپ نے فرمایا مسجدِ اقصٰی۔ ابوذرؓ نے تیسری مرتبہ سوال کیا کہ ان دونوں کی درمیانی مدت کس قدر ہے، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دونوں کے درمیان چالیس سال کی مدت ہے[1]۔ حالانکہ حضرت سلیمانؑ اور حضرت ابراہیمؑ بانیٔ مسجدِ حرام کے درمیان ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت کا فاصلہ ہے اس لیے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم نے مسجدِ حرام کی بنیاد رکھی اور وہ مکہ کی آبادی کا باعث بنی اسی طرح حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام نے مسجد بیت المقدس کی بنیاد ڈالی اور اس کی وجہ سے بیت المقدس کی آبادی وجود میں آئی پھر عرصۂ دراز کے بعد حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے حکم سے مسجد اور شہر کی تعمیر کی تجدید کی گئی اور جنوں کی تسخیر کی وجہ سے بے نظیر اور شاندار تعمیر عالمِ وجود میں آئی جو آج تک لوگوں کے لیے باعثِ حیرت ہے کہ ایسے دیو پیکر پتھر کہاں سے لائے گئے، کس طرح لائے گئے اور جرِ ثقیل کے وہ کون سے آلات تھے جن کے ذریعہ اُن کو ایسی بلندیوں پر پہنچا کر باہم اتصال پیدا کیا گیا۔

[1] بخاری کتاب الانبیاء۔

قومِ جن نے حضرت سلیمان کے لیے بیت المقدس کے علاوہ اور بھی تعمیرات کیں اور بعض ایسی چیزیں بنائیں جو اُس زمانہ کے لحاظ سے عجیب و غریب سمجھی جاتی تھیں۔ چنانچہ قرآنِ عزیز میں ہے:۔

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ	اور شیطانوں (سرکش جنوں) میں سے ہم نے مسخر کر دیئے وہ
يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ	جو اُس (سلیمان) کے لیے سمندروں میں غوطے مارتے (یعنی
عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا	بیش قیمت بحری اشیاء نکالتے) اور اس کے علاوہ اور بہت سے
لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝ (انبیاء پ ۱۷ ع ۶)	کام انجام دیتے اور ہم اُن کے لیے نگراں اور نگہبان تھے۔
وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ	اور جنوں میں سے وہ تھے جو اس کے سامنے خدمت انجام
يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَمَنْ	دیتے تھے اُس کے پروردگار کے حکم سے اور جو کوئی ان میں
يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ	سے ہمارے حکم کے خلاف کجروی کرے ہم اس کو دوزخ کا
مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝ يَعْمَلُوْنَ	عذاب چکھائیں گے وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ
لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ	چاہتا تھا قلعوں کی تعمیر، ہتھیار اور تھا دیر اور بڑے بڑے
تَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ	لگن جو حوضوں کی مانند تھے اور بڑی بڑی دیگیں جو اپنی بڑائی
قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ۭ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ	کی وجہ سے ایک جگہ جمی رہیں اے آلِ داؤد! شکرگزاری
دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ	کے کام کرو اور میرے بندوں میں سے بہت کم
عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝ (سبا پ ۲۲ ع ۲)	شکرگزار ہیں۔
وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ	اور اکٹھے کیے گئے سلیمان کے لیے اس کے لشکر جنوں
الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ	میں سے، انسانوں میں سے، جانوروں میں سے اور
يُوْزَعُوْنَ ۝ (نمل پ ۱۹ ع ۲)	وہ درجہ بدرجہ کھڑے کیے جاتے ہیں۔
وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ۝	اور مسخر کر دیے سلیمان کے لیے شیطان (سرکش جن) ہر قسم کے
وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝	کام کرنے والے، عمارت بنانے والے، دریا میں غوطہ

وَهٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ لگانے والے اور وہ (سرکش سے سرکش) جو جکڑے ہوئے ہیں
اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ زنجیروں میں۔ یہ ہماری بخشش و عطا ہے، چاہے اس کو بخش دو
(ص پ ۲۳ ع ۱۲) یا روکے رکھو تم سے اس کا کوئی مواخذہ نہیں۔

حضرت شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہٗ) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) پر ایسے عظیم الشان احسانات کیے اور پھر یہاں تک فرمایا کہ اس بے انتہا دولت و ثروت کے صرف و خرچ، داد و دہش اور روک کر رکھنے میں تم سے کوئی بازپرس بھی نہیں ہے مگر ان تمام باتوں کے باوجود حضرت سلیمان (علیہ السلام) اس دولت و حکومت کو مخلوقِ خدا کی خدمت کے لیے امانتِ الٰہی سمجھ کر ایک حبہ اپنی ذات پر صرف نہیں فرماتے بلکہ اپنی روزی ٹوکریاں بنا کر حاصل کرتے تھے۔

بیضاوی نے اس مقام پر یہ اسرائیلی روایت نقل کی ہے کہ قومِ جن نے تختِ سلیمان (علیہ السلام) کو اس کاریگری سے بنایا تھا کہ تخت کے نیچے دو زبردست اور خونخوار شیر کھڑے تھے اور دو گدھ (نسر) معلق تھے اور جب حضرت سلیمان تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہونے کے لیے تخت کے قریب تشریف لے جاتے تو دونوں شیر اپنے بازو پھیلا کر بیٹھ جاتے اور تخت نیچا ہو جاتا اور وہ بیٹھ جاتے تو شیر پھر کھڑے ہو جاتے اور فوراً ہیبتناک گدھ اپنے پروں کو پھیلا کر سرِ مبارک پر سایہ فگن ہو جاتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے پتھر سے بڑی اور بھاری دیگیں بنائی تھیں جو چولہوں پر قائم تھیں اور اپنی ضخامت کی وجہ سے حرکت میں نہیں آتی تھیں اور بڑے بڑے حوض پتھر تراش کر بنائے تھے اور شہر بیت المقدس اور ہیکل (مسجدِ اقصیٰ) اور ان سب اشیاء کی تعمیر اور کاریگری میں صرف سات سال لگے تھے[1]۔

تورات میں متعدد جگہ ان تعمیری خدمات کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے:۔

"اور یہی باعث ہے جس سے سلیمان بادشاہ نے لوگوں کی بیگار لی کہ خداوند کا گھر (مسجد) اور شہر یروشلم) اور اپنا قصر (قصرِ سلیمان) اور (شہر) ملو اور یروشلم کی شہر پناہ اور شہر (حاصور اور مجدو اور جاذر بھی بنائے ..... سو سلیمان نے جاذر اور بیت حوران اسفل کو پھر تعمیر کیا،

[1] بیضاوی سورۂ سبا۔

اور بعلات اور دشتِ تدمر کو مملکت کے درمیان ...... اور خزانے کے سارے شہر جو سلیمان کے تھے اور اس کی گاڑی کے شہر اور اس کے سرداروں کے شہر بنائے اور جو کچھ سلیمان کی تمنا تھی سو یروشلم میں اور لبنان میں اور اپنی مملکت کی ساری زمین میں بنائے[1]

اسی طرح توراۃ میں پتھر کے عظیم الشان حوض، بڑی اور بھاری دیگیں اور تصویروں اور اُن کے بنانے کے لیے بیش قیمت پتھروں کے متعلق طویل فہرست دی گئی ہے[2]

(۴) تانبے کے چشمے | حضرت سلیمان (علیہ السلام) چونکہ عظیم الشان عمارات، پُرشوکت و پُرہیبت قلعوں کی تعمیر کے بہت شائق تھے اور ایسی تعمیرات کے استحکام میں بہت دلچسپی رکھتے تھے اس لیے ضرورت تھی کہ گارے اور چونے کی بجائے پگھلی ہوئی دھات "گارے" کی طرح استعمال کی جائے لیکن اس قدر کثیر مقدار میں یہ کیسے میسر آئے، یہ سوال تھا جس کا حل حضرت سلیمان چاہتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کی اس مشکل کو اس طرح حل کر دیا کہ اُن کو پگھلے ہوئے تانبے کے چشمے مرحمت فرما دیے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حسب ضرورت سلیمان کے لیے تانبے کو پگھلا دیتا تھا اور یہ حضرت سلیمان کے لیے ایک "نشان" تھا اور اس سے قبل کوئی شخص دھات کا پگھلانا نہیں جانتا تھا۔

اور نجار کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) پر یہ انعام کیا کہ زمین کے جن حصوں میں ناری مادہ کی وجہ سے تانبا پانی کی طرح پگھل کر بہہ رہا تھا اُن چشموں کو حضرت سلیمان پر آشکارا کر دیا اور اُن سے قبل کوئی شخص زمین کے اندر دھات کے چشموں سے آگاہ نہ تھا[3]

چنانچہ ابن کثیر بروایتِ قتادہؓ ناقل ہیں کہ پگھلے ہوئے تانبے کے یہ چشمے یمن میں تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان پر ظاہر کر دیا تھا[4]

قرآنِ عزیز نے اس حقیقت کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی اور مسطورۂ بالا دونوں توجیہات

[1] سلاطین ۱۔ باب ۹ آیات ۲۰۔ ۱۵۔ [2] سلاطین ۱ باب ۷۔ [3] قصص الانبیاء عربی ص ۳۹۳۔ [4] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۲۹

آیت زیرِ بحث کا مصداق بن سکتی ہیں، اس لیے ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب صاحبِ مطالعہ کے اپنے ذوق پر ہے۔

توراۃ میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے اس خصوصی امتیاز کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

حضرت سلیمان اور جہاد کے گھوڑوں کا واقعہ

قرآنِ عزیز نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے متعلق ایک مختصر واقعہ کا اس طرح تذکرہ کیا ہے:

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ إِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصَّافِنَاتُ الْجِيَادُ فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّي حَتَّى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ رُدُّوهَا عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ ○ (ص پ ۲۳ ع ۳)	اور ہم نے داؤد کو سلیمان (فرزند) عطا کیا وہ اچھا بندہ تھا، بیشک وہ خدا کی جانب بہت رجوع ہونے والا تھا (اس کا واقعہ قابلِ ذکر ہے) جب اس کے سامنے شام کے وقت اصیل اور سبک رو گھوڑے پیش کیے گئے تو وہ کہنے لگا بیشک میری محبت مال (جہاد کے گھوڑوں کی محبت) پروردگار کے ذکر ہی میں سے ہے یہاں تک کہ وہ گھوڑے نظر سے اوجھل ہو گئے (حضرت سلیمان نے فرمایا) ان کو واپس لاؤ پھر وہ ان کی پنڈلیاں اور گردنیں چھونے اور تھپتھپانے لگا۔

ان آیات کی تفسیر میں صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے تین قول منقول ہیں ایک حضرت علی ابن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) سے اور دو حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے ان میں سے ایک حسن بصریؒ کی سند سے مذکور ہے اور دوسرا علی ابن ابی طلحہ کی سند سے۔

(۱) حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی تفسیر کے مطابق واقعہ کی حقیقت اس طرح ہے کہ حضرت سلیمان کو ایک مرتبہ جہاد کی مہم پیش آئی اور انھوں نے حکم دیا کہ اصطبل سے گھوڑوں کو لایا جائے گھوڑے پیش ہوئے تو ان کی دیکھ بھال میں عصر کی نماز کا وقت جاتا رہا اور سورج غروب ہو گیا۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو جب تنبہ ہوا تو فرمایا مجھے یہ اعتراف ہے کہ مال کی محبت یادِ خدا پر غالب آ گئی اور اس غم و غصہ میں گھوڑوں کو واپس منگایا اور یادِ خدا کی محبت کے جوش میں

ان سب کو ذبح کر ڈالا کہ وہی اس غفلت کا باعث بنے تھے۔

اس تفسیر کے مطابق آیت اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ کے معنی یہ ہوئے کہ بیشک میں پروردگار کے ذکر سے غافل ہو کر مال کی محبت میں لگ گیا اور آیت حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ میں تَوَارَتْ کی ضمیر آفتاب کی جانب راجع ہے جو عبارت میں محذوف ہے یعنی "توارت الشمس بالحجاب" اور آیت طَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ میں مسح کے معنی "ضرب" کے ہیں یعنی ان کی کونچیں اور گردنیں کاٹ ڈالیں۔

ابن کثیر نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ اکثر سلف کی بھی یہی رائے ہے اور حضرت سلیمان کا یہ عمل قصداً نہیں تھا بلکہ اسی قسم کا معاملہ تھا جیسا کہ غزوۂ خندق کے موقعہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا کہ عصر کی نماز فوت ہو گئی اور آپ نے مع صحابہ (رضی اللہ عنہم) غروبِ آفتاب کے بعد اس کی قضا کی[1] اور جب کہ حضرت سلیمان نے خدا کے ذکر کی محبت میں اپنے بہترین گھوڑوں کو ذبح کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ عظیم الشان انعام فرمایا کہ "ہوا" کو ان کے لیے مسخر کر دیا[2]۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس کی اس روایت کے مطابق جو حسن بصری کی سند سے منقول ہے حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ جہاد کی مہم کے سلسلہ میں جب حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے گھوڑوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا اور وہ پیش کیے گئے اور پھر وہ تمام صورت پیش آئی جو پہلی تفسیر میں ذکر ہو چکی تو حضرت سلیمان نے واپس منگا کر گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہلکے ہلکے مارا اور فرمایا کہ آئندہ تم ذکر اللہ سے غفلت کا باعث نہ بننا[3]۔

گویا اس روایت کے پیش نظر "مسح" کے معنی آہستہ آہستہ مارنے کے ہوئے اور مطلب یہ ہوا کہ اگرچہ جہاد کی مصروفیت ہی کی بنا پر غفلت کا یہ معاملہ پیش آیا تاہم حضرت سلیمان نے بظاہر اسباب گھوڑوں کو اس کا باعث سمجھ کر اُن کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جس سے فی الجملہ رنج کا اظہار بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حیوان سمجھ کر اُن کو اپنے غیظ و غضب

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۴ سورۂ ص و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۵۔ [2] ایضاً۔ [3] فتح الباری۔ ص ۲۵۶۔

کا شکار نہیں بنانا چاہتے بلکہ فی الجملہ اظہارِ رنج کرنا چاہتے ہیں۔

(۳) مسطورۂ بالا ہر دو تفاسیر سے جُدا حضرت عبداللہ بن عباس سے بہ طریقِ علی بن ابی طلحہ جو تفسیر منقول ہے اس میں نہ نماز فوت ہونے کا ذکر ہے اور نہ سورج غروب ہونے کا مسئلہ ہے اور نہ گھوڑوں کے ذبح کر دینے کا واقعہ زیرِ بحث آیا ہے بلکہ واقعہ کی صورت اس طرح ذکر کی گئی ہے کہ جہاد کی ایک مہم کے موقعہ پر ایک شام کو حضرت سلیمان نے جہاد کے گھوڑوں کو اصطبل سے لانے کا حکم دیا۔ جب وہ پیش کیے گئے تو آپ کو چونکہ گھوڑوں کی نسلوں اور اُن کے ذاتی اوصاف کے علم کا کمال حاصل تھا اس لیے آپ نے جب اُن سب کو اصیل، نیک رو، خوش رو اور پھر بہت بڑی تعداد میں پایا تو آپ پر مسرت و انبساط کی کیفیت طاری ہو گئی اور فرمانے لگے ان گھوڑوں سے میری یہ محبت ایسی مالی محبت میں شامل ہے جو پروردگار کے ذکر ہی کا ایک شعبہ ہے حضرت سلیمان کے اس غور و فکر کے درمیان گھوڑے اصطبل کو روانہ ہو گئے۔ چنانچہ جب انھوں نے نظر اوپر اُٹھائی تو وہ نگاہ سے اوجھل ہو چکے تھے آپ نے حکم دیا اُن کو واپس لاؤ۔ جب وہ واپس لائے گئے تو حضرت سلیمان نے محبت اور آلاتِ جہاد کی حیثیت سے عزت و توقیر کی خاطر اُن کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنا اور تھپتھپانا شروع کر دیا اور ایک ماہرِ فن کی طرح ان کو مانوس کرنے لگے۔

گویا اس تفسیر کے مطابق آیت اِنِّیۡۤ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَیۡرِ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّیۡ کا ترجمہ یہ ہوا "بے شبہ میری محبتِ مال (جہاد کے گھوڑوں کی محبت) ذکرِ خدا ہی میں سے ہے اور تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ" میں تَوَارَتۡ کی ضمیر صَافِنَاتُ الۡجِیَادُ ہی کی طرف ہے، یعنی جب گھوڑے آنکھ سے اوجھل ہو گئے اور اس طرح شمس کے محذوف ماننے کی ضرورت نہیں رہتی اور طَفِقَ مَسۡحًاۢ بِالسُّوۡقِ وَالۡاَعۡنَاقِ میں مسح کے "چھونے اور ہاتھ پھیرنے کے" وہی عام معنی ہیں جو لغت میں بہت مشہور ہیں [1]

ؔ فاحببت معناه اردت المحبة (البحر المحیط - ج - ۷ - ص ۳۹۶-

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۲۵۶ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۵۔

ابن جریر طبریؒ اور امام رازیؒ اسی تفسیر کو راجح اور قرینِ صواب سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب گھوڑوں کی تعداد ہزاروں تھی اور وہ بھی جہاد کے لیے تیار کیے گئے تھے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر حضرت سلیمان کی نماز فوت ہو گئی تھی تو اس میں ان حیوانوں کا کوئی قصور نہ تھا جو اُن کو عذاب دیا جائے پس اِن امور کے پیشِ نظر آیات کی وہ تفسیر صحیح نہیں ہو سکتی جس کی نسبت حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی جانب کی جاتی ہے۔

محاکمہ روایات اور اقوالِ مفسرین کے مطالعہ کے بعد ہمارے نزدیک ابن جریر اور امام رازی کا پسندیدہ قول ہی قابلِ ترجیح اور قرینِ صواب ہے اس لیے کہ نہ اس میں محذوف ماننے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ حضرت سلیمان کی طرف ایسے عمل کی نسبت ہوتی ہے جو عقلاً نامناسب معلوم ہوتا ہے اور ابن کثیر نے ابن جریر کے اعتراض کا جو جواب اس سلسلہ میں دیا ہے وہ بھی تاویلِ بعید سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ ایک اولوالعزم پیغمبر کے اس واقعہ میں کوئی ایسی وجہ وجیہ نہیں ہے کہ جس کے پیشِ نظر دس یا بیس ہزار[1] گھوڑوں کو اس طرح ذبح کر دیا جائے اور یہ کہہ دینا کہ شاید ان کی ملت میں اس قسم کا عمل راجح اور پسندیدہ سمجھا جاتا ہو بے دلیل بات ہے۔ اسی طرح ابن کثیر کا یہ قول کہ حضرت سلیمان نے جب اپنی غفلت کی مکافات میں ہزاروں بہترین گھوڑوں کو ذبح کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے عوض میں ہوا کو مسخر کر دیا۔ اگرچہ دلچسپ ضرور ہے لیکن قرآنِ عزیز کے بیان سے مطابقت نہیں رکھتا اس لیے کہ واقعہ زیرِ بحث ایک جدا واقعہ ہے جس کے ذیل میں قرآنِ عزیز نے معمولی سا بھی ایسا اشارہ نہیں کیا جس سے تسخیرِ ہوا کے معاملہ کا اس سے تعلق ظاہر ہوتا ہو۔ حالانکہ قرآنِ عزیز کے عام طرزِ بیان کے مطابق آیاتِ زیرِ بحث میں ہی یہ ذکر آنا چاہیے تھا کہ چونکہ حضرت سلیمان نے ہماری خوشنودی میں ایسا کیا اس لیے ہم نے اس کے عوض میں اتنا بڑا انعام دیا کہ ہوا کو مسخر کر دیا، مگر اس کے برعکس تسخیرِ ہوا کے مسئلہ کو ایک دوسرے واقعہ کے ساتھ متعلق کیا ہے جو حضرت سلیمان کی آزمائش سے تعلق رکھتا ہے یعنی جب

[1] ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ میں دس ہزار اور بیس ہزار کی تعداد روایت کی ہے۔

حضرت سلیمانؑ نے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کی تو ساتھ ہی یہ دعا بھی مانگی کہ ان کو ایسی حکومت عطا ہو جو اُن کے علاوہ پھر کسی کو نصیب نہ ہو اور یہ دعاء اللہ تعالیٰ نے اس طرح قبول فرمائی کہ جن، حیوانات اور ہوا کو اُن کے لیے مسخر کر دیا۔[1]

غرض صافنات الجیاد کے واقعہ کے بعد نہ حضرت سلیمانؑ کا گھوڑوں کی سواری کو ترک کر دینا اور میدانِ جہاد میں ان سے کام نہ لینا ثابت ہے اور نہ تسخیرِ جن و ہوا کا اس معاملہ سے کوئی تعلق ہے اور نہ آیت میں "شمس" کا کوئی تذکرہ ہے اور نہ اتنی کثیر تعداد میں عمدہ گھوڑوں کا بیک وقت ذبح کر ڈالنا کوئی خاص محبوب عمل ہے، اس لیے ان وجوہ کی بناء پر حضرت عبداللہ بن عباس ہی کا یہ قول راجح اور قرینِ صواب ہے۔[2]

حضرت سلیمان کی آزمائش کا واقعہ

سورۂ صٓ میں حضرت سلیمانؑ کی آزمائش اور خدائے تعالیٰ کی جانب سے ابتلاء کا ایک مجمل واقعہ اس طرح مذکور ہے:

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا	اور بیشک ہم نے سلیمانؑ کو آزمایا اور ڈال دیا ہم نے
عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ۝	اس کی کرسی پر ایک جسم، پھر وہ اللہ کی جانب رجوع ہوا۔
قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ	کہا اے پروردگار! مجھ کو بخش دے اور مجھ کو ایسی حکومت
مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ	عطا کر جو میرے بعد کسی کو میسر نہ آئے، بے شبہ
بَعْدِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝	تو ہی بخشنے والا ہے۔ تب ہم نے اس کے لیے ہوا
فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ	کو مسخر کر دیا کہ وہ اس کے حکم سے نرم رفتار سے چلتی
رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ۝ (صٓ پ ۲۳)	تھی جہاں وہ پہنچنا چاہتا۔

ان آیات میں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ حضرت سلیمانؑ کو جب آزمائش پیش آئی تو وہ کیا تھی صرف اس قدر اشارہ ہے کہ اُن کی کرسی پر ایک جسد ڈالا گیا نیز احادیث میں بھی اس سے متعلق کوئی تفصیل مذکور نہیں ہے لہٰذا ان آیات کی تفسیر میں مفسرین نے دو رائیں اختیار

---

[1] سورۂ صٓ۔ [2] اور ہمدانی کے قول کے مطابق اگر احببت کے معنی اردت المحبۃ لے جائیں تو پھر عن بمعنی من استعمال ہو سکتا ہے۔

کی ہیں:۔

ایک یہ کہ ہم کو قیاس اور ظن و تخمین سے کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے اور صرف اسی قدر یقین رکھنا چاہیے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو اس نے کسی آزمائش میں مبتلا کیا، جس کا تعلق تختِ سلیمان اور جسد کا تختِ سلیمان پر ڈالا جانا ان دو باتوں سے ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت نامعلوم ہے اور یہ کہ حضرت سلیمان نے اولوالعزم پیغمبروں کی طرح خدا کی درگاہ میں رجوع کیا۔ اوّل مغفرت طلب کی اور اس کے بعد ایسی حکومت کے لیے دعا مانگی جو بے نظیر اور بے مثال ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرمائی اور ان کی مقبولیت اور عظمتِ شان کو سراہا۔ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ۝ اور بے شبہ اس کے لیے ہمارے پاس تقرب ہے، اور عمدہ مقام۔

آیاتِ زیرِ بحث کی تفسیر میں یہ راہ حافظ عماد الدین بن کثیرؒ اور ابن حزمؒ اور بعض دوسرے جلیل القدر محدثین و مفسرین نے اختیار کی ہے۔

دوسری راہ یہ ہے کہ اس واقعہ کی تفصیل اور آیات کی تشریح کے لیے کوئی صورت پیدا کی جائے اور اس کے اجمال و ابہام کو حل کیا جائے۔

اس سلسلہ میں مفسّرین نے جو تفسیریں کی ہیں اُن میں سے صرف دو قابلِ ذکر ہیں ان میں سے ایک امام رازیؒ کی جانب منسوب ہے اور دوسری بعض محدثین کی جانب۔

امام رازی کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان ایک مرتبہ سخت علیل ہو گئے اور ان کی حالت اس درجہ نازک ہو گئی کہ جب تخت پر لا کر بٹھائے گئے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم ہے بے روح۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کو صحت عطا فرمائی جب وہ تندرست ہو گئے تو خدائے تعالیٰ کا شکر بجا لاتے ہوئے اوّل انھوں نے پیغمبرانہ شان کے مطابق مغفرت طلب کی اور اپنی بیچارگی کا اظہار کیا اور پھر دعا مانگی کہ خدایا مجھ کو لاثانی حکومت

عطا فرمائے[1]

رازی (رحمہ اللہ) کی اس تفسیر[2] کے مطابق آیۃ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ میں "فتنہ" سے مراد مرضِ شدید ہے، اور اَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا میں "القاءِ جسد" سے حضرت سلیمانؑ کا شدتِ مرض میں جسمِ بے روح کی طرح تخت پر پڑ جانا مقصود ہے اور "ثُمَّ اَنَابَ" سے صحت کی جانب رجوع ہو جانا اور تندرست ہو جانا مراد ہے گویا آزمائش کا مقصد یہ تھا کہ حضرت سلیمانؑ عین الیقین کے درجہ میں سمجھ لیں کہ اس حاکمانہ شان کے باوجود اُن کا نہ صرف اقتدار بلکہ جان تک اپنے قبضہ میں نہیں ہے تاکہ ایک اولوالعزم رسول کی طرح خدا کے سامنے جھک جائیں اور اظہارِ خشوع و خضوع اور طلبِ مغفرت کے ذریعہ درگاہِ الٰہی سے درجۂ رفیع اور مزید سربلندی حاصل کریں۔

بعض محدثین نے ان آیات کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے یہ سوچا کہ میں اس شب میں اپنے حرم کے ساتھ ازدواجی فریضہ ادا کروں تو میری ہر ایک بیوی سے لڑکا پیدا ہوگا اور وہ میدانِ جہاد کا مجاہد بنے گا، مگر اس خیال کے ساتھ "ان شاء اللہ" کہنا بھول گئے۔ خدائے تعالیٰ کو ایک اولوالعزم پیغمبر کا یہ طرز ناپسند ہوا، اور اس نے حضرت سلیمانؑ کے اس دعوے کو اس طرح غلط ثابت کر دیا کہ تمام ازواجِ مطہرات میں سے صرف ایک بیوی کے مُردہ بچہ پیدا ہوا جس کو کسی خادم نے ان کے سامنے اس وقت پیش کیا جبکہ وہ تخت پر متمکن تھے، حضرت سلیمانؑ کو تنبۂ ہوا کہ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ خدا کے سپرد کیے اور ان شاء اللہ کہے بغیر میں نے اپنی بات کو زوردار بنایا، چنانچہ فوراً ہی اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع کیا، مغفرت طلب کی اور وہ دعا مانگی جس کا ذکر قرآنِ عزیز میں بصراحت موجود ہے۔

محدثین اپنی اس تفسیر کی دلیل میں بخاری و مسلم کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں جو ذیل میں درج ہے اور اسی کو اپنی تفسیر کی سند بناتے ہیں۔ مفسر ابو السعودؒ اور سید محمودؒ آلوسی نے بھی

[1] تفسیر کبیر سورۂ ص۔ [2] ایضاً۔

یہی توجیہ اختیار کی ہے۔[1]

عن ابی ھریرۃ عن النبی	حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم قال قال	علیہ وسلم نے فرمایا، ایک مرتبہ سلیمان بن داؤد (علیہما
سلیمان بن داؤد لاطوفن	السلام) نے فرمایا، آج کی رات میں اپنی ستر بیویوں کے
اللیلۃ علی سبعین امرأۃ	پاس جاؤں گا تاکہ ان میں سے ہر ایک بیوی ایک
تحمل کل امرأۃ فارسا یجاھد	شہ زور لڑکا جنے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے، حضرت
فی سبیل اللہ فقال لہ	سلیمان کے وزیر نے ان سے کہا "ان شاء اللہ" مگر
صاحبہ ان شاء اللہ فلم	حضرت سلیمان نے اس جملہ کو ادا نہ کیا اور نتیجہ یہ
یقل ولم تحمل شیئاً الا	نکلا کہ کوئی بیوی بھی حاملہ نہ ہوئی البتہ ایک بیوی
واحدا ساقطاً احد شقیہ	کے ناقص بچہ پیدا ہوا جس کا ایک پہلو ندارد تھا
فقال النبی صلی اللہ علیہ	اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر
وسلم لو قالھا لجاھد وافی	حضرت سلیمان "ان شاء اللہ" کہہ دیتے تو ہر ایک
سبیل اللہ۔[2]	حرم کے بطن سے مجاہد پیدا ہوتا۔

محاکمہ مگر یہ دونوں تفسیریں محلِ نظر ہیں۔ پہلی توجیہ جس کو امام رازی نے پسند فرمایا ہے صرف قیاسی توجیہ ہے اور آیت کے جملوں کی ایسی تاویل ہے جو تاویلِ بعید کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تسلیم کہ مقربینِ بارگاہِ الٰہی کے لیے کبھی مرض بھی آزمائش بن جاتا ہے، لیکن کرسیِ سلیمان پر "القاءِ جسد" سے بحالتِ نقاہت حضرت سلیمان کا تخت پر بیٹھنا مراد لینا متبادر معنی کے خلاف ہے "آیت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تختِ سلیمان پر کوئی شے ڈالی گئی جس کا سلیمان کی آزمائش سے تعلق تھا نیز "اناب" (رجوع ہوا) کے معنی بھی قرآنِ عزیز میں جگہ جگہ طلبِ مغفرت اور اظہارِ عبودیت کے لیے رجوع ہونے کے آئے ہیں،

---

[1] روح المعانی جلد ۲۶۔ [2] بخاری کتاب الانبیاء۔

لہٰذا یہاں "صحت کی جانب ہونے" کے معنی لینا دل لگتی بات نہیں ہے۔

اسی طرح بعض محدثین نے جو تفسیر بیان فرمائی ہے اور جس کو ابوالسعود اور سید محمود آلوسی نے اختیار کیا ہے وہ بھی آیاتِ زیرِ بحث کی تفسیر نہیں ہے اس لیے کہ بخاری یا دوسری کتبِ حدیث میں جہاں جہاں یہ حدیث منقول ہے اس کے کسی ایک طریقہ میں بھی ایسا کوئی لفظ یا جملہ نہیں پایا جاتا جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت ابوہریرہ نے اس واقعہ کو آیاتِ زیرِ بحث کی تفسیر فرمایا ہو یا اس کی جانب اشارہ تک بھی کیا ہو بلکہ یہ حدیث حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے واقعات میں سے ایک مستقل واقعہ کا اسی طرح ذکر کرتی ہے جس طرح بخاری نے اسی باب میں بعض دوسرے واقعات کو بیان کیا ہے مثلاً یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت سلیمان کے زمانہ میں دو عورتیں ساتھ سفر کر رہی تھیں اور دونوں کے ساتھ ان کے شیرخوار بچے بھی تھے، راہ میں ایک عورت کے بچے کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا اور جو بچہ باقی رہا دونوں اس کے لیے آپس میں جھگڑا کرنے لگیں، دونوں کا دعویٰ تھا کہ یہ بچہ میرا ہے اور دوسری کا بچہ بھیڑیا لے گیا۔ جب حضرت داؤدؑ کے پاس یہ معاملہ پہنچا تو انھوں نے "فصلِ قضایا" کے اصول پر مقدمہ کی روئداد سن کر بڑی کے حق میں فیصلہ دیا اس لیے کہ بظاہر بچہ بڑی کے قبضہ میں تھا اور چھوٹی اس کے قبضہ کے خلاف گواہ نہ پیش کر سکی۔ جب عورتیں واپس ہو کر حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے پاس سے گزریں تو انھوں نے اُن کے قضیہ کی تفصیل دریافت فرمائی اور سن کر حکم دیا ایک چھری لائی جائے اور اس بچہ کے دو ٹکڑے کر کے ایک بڑی کو اور ایک چھوٹی کو دے دیا جائے، بڑی خاموش رہی مگر چھوٹی یہ فیصلہ سن کر شور و غوغا کرنے لگی کہ خدارا اس بچہ کے دو ٹکڑے نہ کیجیے، میں بڑی کے حق میں دستبردار ہوتی ہوں۔ تب سب کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ بچہ چھوٹی کا ہے، اور بڑی جھوٹا دعویٰ کرتی ہے۔ لہٰذا بچہ چھوٹی کے حوالہ کر دیا گیا[1]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح یہ واقعہ حضرت سلیمان کی دانش و عقل کی

[1] بخاری کتاب الانبیاء۔

برتری کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا، اسی طرح حضرت سلیمانؑ اور ان کی ازواجِ مطہرات کا واقعہ اس لیے سنایا کہ اُمت کو یہ موعظت حاصل ہو کہ اپنے کاموں میں اگر خیر و برکت چاہتی ہو تو ارادہ و عزم کے اظہار کے وقت "ان شاءاللہ" کہنا چاہیے، نیز شاید یہ بھی مقصد ہو کہ وہب بن منبہ جب یہ قصہ سنایا کرتے تھے تو حضرت سلیمانؑ کی ازواجِ مطہرات اور باندیوں کی تعداد ایک ہزار بتایا کرتے تھے۔ اس لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے اُس تعداد کو ساٹھ یا بعض روایات کے پیشِ نظر سو تک بتایا جن میں بعض ازواجِ مطہرات تھیں اور باقی جاریات (باندیاں) تھیں[1]

غرض روایتِ زیرِ بحث موعظت و عبرت کے سلسلہ میں مستقل حیثیت سے بیان ہوئی ہے۔ آیاتِ زیرِ بحث کی تفسیر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور خلاصۂ بحث یہ ہے کہ امام رازیؒ اور بعض محدثین کی اختیار کردہ تفسیریں حضرت سلیمانؑ کی آزمائش اور کرسیِ سلیمانؑ پر القاءِ جسد کے واقعات کو حل نہیں کرتیں اور آیات میں اگرچہ ان دونوں باتوں کا مجمل ذکر ہے، تاہم اس واقعہ سے متعلق موعظت اور عبرت کے پہلو کو بہت صاف اور نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے اور قرآنؔ کا واقعات کے تذکرے سے یہی مقصد ہوتا ہے، لہٰذا ہم کو بھی اُس کے موعظت کے پہلو کو سامانِ عبرت و نصیحت بناتے ہوئے واقعہ کے اجمال پر ہی ایمان رکھنا چاہیے، اور اگر کوئی شخص واقعہ کے اس اجمال پر قلب کو مطمئن نہیں پاتا تو پھر امام رازیؒ کی بیان کردہ تفسیر کو اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے۔

ان آیات کی تفسیر میں بیان کردہ تفاسیر کے علاوہ بہت سی ایسی روایات کُتبِ تفاسیر میں درج ہیں جن کا اسلامی روایات سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور بلاشبہ وہ تمام تر یہودی قصص اور اسرائیلی خرافات کا مجموعہ ہیں۔ اس لیے اُن کو روایات کہنا بھی روایت

---

[1] نجارؔ نے اس مقام کی تفسیر میں ایک تیسری راہ اختیار کی ہے مگر وہ ہمارے نزدیک اٹکل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اس کے لیے قصص الانبیاء۔ ص ۳۹۲ قابلِ مراجعت ہے۔

کی توہین کرنا ہے۔

ان روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کے تخت پر شیطان کو قابض کر دیا تھا اور اس کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان کی ایک بیوی جس کا نام امینہ تھا بت پرست تھی اور اپنے باپ کا مجسمہ بنا کر اس کی پرستش کیا کرتی تھی۔ لہٰذا خدائے تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو یہ سزا دی کہ جس مدت تک امینہ نے ان کے گھر میں بت پرستی کی تھی اس مدت تک کے لیے وہ تختِ سلطنت سے محروم کر دیے گئے اور ان کی انگشتری جس میں اسم اعظم کندہ تھا وہ ان کی باندی جرادہ کے ذریعہ شیطان کے ہاتھ پڑ گئی اور وہ بصورتِ سلیمان ان کے تخت پر بیٹھ کر حکومت کرنے لگا اور پھر مدت ختم ہونے کے بعد انگشتری شیطان کے ہاتھ سے دریا میں گر گئی اور مچھلی اس کو نگل گئی اور وہ مچھلی حضرت سلیمان کے پاس شکار ہو کر آئی اور اس طرح اس کے پیٹ میں سے انگشتری نکال کر انھوں نے اپنا ملک واپس لے لیا۔

تورات سلاطین ا باب ۱۱ میں بھی اس روایت سے ملتا جلتا ایک قصہ مذکور ہے اور اس میں بیویوں کی خاطر حضرت سلیمان کا بت پرستی کرنا تک موجود ہے (العیاذ باللہ)

اس روایت میں ایک اولوالعزم پیغمبر کی جانب جس قدر خرافات اور ذلیل واقعات کی نسبت کی گئی ہے ایک عامی بھی بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسی روایات کا اسلام کی تعلیم سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے محدث ابن کثیرؒ نے ان روایات کے متعلق یہ فیصلہ دیا ہے:۔

ذکر ابن جریر و ابن ابی حاتم	ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور ان دونوں کے علاوہ
وغیرھما من المفسرین ھھنا	دوسرے مفسرین نے اس مقام پر جماعتِ سلف
آثاراً کثیرۃ عن جماعۃ من السلف	سے بہت سے آثار کا ذکر کیا ہے اور ان میں سے اکثر
واکثرھا اوکلھا متلقاۃ من	یا سب کے سب اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں،

الاسرائیلیات وفی کثیر منہا	اور ان میں سے اکثر آثار میں سخت ناروا باتیں مذکور
نکارۃ شدیدۃ وقد نبہنا علی	ہیں اور ہم نے اپنی تفسیر میں اس پر تنبیہ کردی ہے
ذلک فی کتابنا التفسیر واقتصرنا	اور اس جگہ صرف قرآن میں بیان کردہ واقعہ کو
ھھنا علی مجرد التلاوۃ [1]	تلاوت کرنے پر اکتفا کیا ہے۔
ولکن الظاھر انہ انما تلقاہ ابن	لیکن ظاہر یہ ہے کہ اگر اس روایت کی نسبت حضرت
عباس رضی اللہ عنہما ان صح	عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی جانب صحیح بھی
عنہ من اھل الکتاب وفیھم	ثابت ہوجائے تب بھی یہ اہل کتاب سے انھوں نے
طائفۃ لا یعتقدون نبوۃ سلیمان	لی ہے اور ان میں ایک گروہ حضرت سلیمان علیہ السلام
علیہ الصلوٰۃ والسلام فالظاھر	کو نبی نہیں مانتا تو یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ حضرت سلیمان
انھم یکذبون علیہ ولھذا کان	پر جھوٹ تراشتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس روایت
فی ھذا السیاق منکرات [2]	کے بیان میں ناروا باتیں پائی جاتی ہیں۔
وقد رویت ھذہ القصۃ مطولۃ	اور یہ طویل طویل قصہ سلف کی ایک جماعت کی
عن جماعۃ من السلف رضی اللہ	نسبت کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ مثلاً سعید
عنھم کسعید بن المسیب وزید	بن مسیب اور زید بن اسلم رضی اللہ عنہم اور ان کے
بن اسلم وجماعۃ آخرین وکلھا	علاوہ ایک جماعت سے منقول ہے اور یہ پورا
متلقاۃ من قصص اھل	قصہ از اول تا آخر اہل کتاب کی کہانیوں سے
الکتاب [3]	لیا گیا ہے۔

ابن کثیرؒ کے علاوہ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں، ابن حزمؒ نے الفصل میں، قاضی عیاضؒ نے شفا میں، شیخ بدرالدین عینیؒ نے شرح بخاری میں، ابن حبانؒ نے اپنی تفسیر میں اور دوسرے جلیل القدر محققین، محدثین، اور مفسرین نے اس قصہ سے متعلق روایات کو خرافات اور

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۲۶ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۳۶ [3] ایضاً ج ۴ ص ۳۶۔

اہلِ کتاب کی ہزلیات ظاہر کر کے اسلامی روایات کے دامن کو اس نجاست سے پاک کیا ہے۔

لشکر سلیمان اور وادی نملہ

گزشتہ صفحات میں "منطق الطیر" کی بحث میں یہ مسئلہ واضح ہو چکا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو اللہ تعالیٰ نے حیوانات کی بولیاں سمجھنے کا علم عطا فرمایا تھا چنانچہ اسی سلسلہ کا ایک واقعہ قرآنِ عزیز میں وادیٔ نملہ (چیونٹیوں کی بستی) سے متعلق اس طرح مذکور ہے۔

ایک مرتبہ حضرت سلیمانؑ جن وانس اور حیوانات کے عظیم الشان لشکر کے جلو میں کسی جگہ تشریف لے جا رہے تھے لشکر کی کثرت کے باوجود کسی طبقہ کے افراد کی بھی یہ مجال نہ تھی کہ وہ اپنے درجہ اور رتبہ کے خلاف آگے پیچھے ہونے کی بے ترتیبی کا مرتکب ہو سکے۔ سب فرمانبردار لشکریوں کی طرح حضرت سلیمانؑ کی ہیبت سے اپنے اپنے قرینہ سے فوج در فوج چل رہے تھے کہ لشکر چلتے چلتے ایک ایسی وادی میں پہنچا جہاں چیونٹیاں بیشمار تھیں اور پوری وادی ان کا مسکن بنی ہوئی تھی، چیونٹیوں کے بادشاہ نے لشکر کے اس کثیر انبوہ کو دیکھ کر اپنی اُمت سے کہا کہ تم فوراً اپنے بلوں میں گھس جاؤ، سلیمانؑ اور سلیمانؑ کے لشکر کو کیا معلوم کہ تم اس کثرت کے ساتھ وادی کی زمین پر رینگ رہی ہو نہ معلوم اُن کے گھوڑوں اور پیادوں کے نیچے تم میں سے کتنی تعداد بے خبری میں روندی جائے۔

حضرت سلیمانؑ نے چیونٹیوں کے پادشاہ کی یہ باتیں سنیں تو اُن کو ہنسی آگئی اور اس کے عاقلانہ حکم کی داد دینے لگے۔ اب اس واقعہ کو خود قرآنِ عزیز سے سُنیئے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ	اور بیشک ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو علم (علم نبوت)
وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا	بخشا اور ان دونوں نے کہا تعریف ہے اللہ کے لیے
عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝	جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت
وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوُدَ وَقَالَ	دی۔ اور داؤدؑ کا وارث سلیمانؑ ہوا اس نے کہا:
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ	اے لوگو! ہم کو پرندوں (حیوانات) کی بولیوں کا

وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا
لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝ وَحُشِرَ
لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَ
الْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝
حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰي وَادِ النَّمْلِ ۙ
قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا
مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ
وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝
فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ
رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ
الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَ
اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ
بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

علم دیا گیا ہے اور ہمارے لیے ہر شے مہیا کر دی
گئی ہے۔ بے شک یہ (خدا کا) کھلا ہوا فضل ہے
اور جمع ہوا لشکر سلیمان کے لیے جن' انسان اور
پرندوں (حیوانات) سے اور وہ درجہ بدرجہ قرینہ
کے ساتھ آگے پیچھے چل رہے تھے حتیٰ کہ وہ وادیٔ نملہ
پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! اپنے
گھروں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں سلیمان اور اس
کا لشکر تم کو پیس ڈالے، چیونٹی کی یہ بات سن کر سلیمان
ہنس پڑا اور کہنے لگا: اے پروردگار! مجھ کو یہ توفیق
دے کہ میں تیرا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے
والدین پر انعام کیا ہے اور یہ کہ میں وہ نیک عمل
کروں جو تجھ کو پسند آئے اور مجھ کو اپنی رحمت
سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔

ہم نے حکم دینے والی چیونٹی کو چیونٹیوں کا پادشاہ کہا ہے اور یہ صرف اس لیے کہ قدیم و جدید عقلاء زمانہ کا اس پر اتفاق ہے کہ حیوانات میں شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں کا اسقدر بہترین نظام ہے کہ اس کو "نظامِ حکومت" کہنا مبالغہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ بعض عقلاءِ دہر نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ انسان نے بھی اپنا نظام ان ہی دو نظاموں کو دیکھ کر مرتب کیا ہے یہ دعویٰ اپنی جگہ کتنا ہی محلِ نظر کیوں نہ ہو مگر اس سے ان دونوں کے نظام کی خوبی بہرحال مسلّم ہو جاتی ہے، اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکم دینے والا نملہ وادیٔ نملہ کا پادشاہ یا سردار ہی ہوگا۔

وادیٔ نملہ کس جگہ واقع ہے؟ اس سوال کے جواب میں اگرچہ بہت سے مقامات کا

نام لیا گیا ہے مگر مؤرخین کی زیادہ رائے اس طرف ہے کہ عسقلان کے قریب ہے جیسا کہ ابن بطوطہ نے بیان کیا ہے یا بیت جبرون و عسقلان کے درمیان، جیسا کہ یاقوت سے منقول ہے، عام مفسرین شام میں بتلاتے ہیں۔

اس سوال کے علاوہ اس مقام پر اور بھی چند سوالات پیدا کیے گئے ہیں۔ مثلاً حکم دینے والی چیونٹی کا نام کیا تھا؟ وہ چیونٹیوں کے قبائل میں سے کس قبیلہ سے تھی؟ ان کی جسامت کس قدر تھی؟ وغیرہ وغیرہ اور پھر اسرائیلی داستانوں اور یہودی خرافات سے ان کے جوابات دینے کی سعی کی گئی ہے۔ مگر یہ سب بحثیں دور از کار، بے سند بلکہ لاطائل ہیں اور قرآنِ عزیز اور احادیث رسول اس قسم کی لغویات سے مُبرا ہیں۔

مثلاً نوف بکالی کہتا ہے کہ ان چیونٹیوں کا قد بھیڑیے کی برابر تھا، حالانکہ قرآنِ عزیز نے واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ وہ اس قدر حقیر جسم رکھتی تھیں کہ نملہ کو یہ کہنا پڑا: ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کا لشکر تم کو پیس ڈالے اور اُن کو خبر بھی نہ ہو۔ کیونکہ یہ بات جب ہی صحیح ہو سکتی ہے کہ وہ چیونٹیاں اپنی ہم جنسوں کی طرح حقیر جسم رکھتی ہوں کہ پیر سے روندنے والے کو ان کا علم بھی نہ ہو سکے۔

اِس واقعہ کے ذکر سے قرآنِ عزیز کا مقصد یہ ہے کہ جب آیتِ بالا سے قبل اس نے یہ بیان کیا کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کو اللہ تعالیٰ نے "علم منطق الطیر" عطا فرمایا اور یہ انکی عظمتِ شان کا ایک نشان ہے تو اُس نے مناسب سمجھا کہ ایک دو واقعات اس سلسلہ کے ایسے بیان کر دیے جائیں کہ جس سے مخاطب کو اس مسئلہ میں کسی قسم کا تردد اور شک باقی نہ رہے اور اس کو علم الیقین حاصل ہو جائے کہ قرآنِ عزیز نے جس حیثیت سے اس کا ذکر کیا ہے اس کے پیشِ نظر یہ علم عام دنیوی علوم کی طرح کا علم نہیں تھا بلکہ خدائے تعالیٰ کی جانب سے ان دونوں عظیم المرتبت پیغمبروں کے لیے خاص موہبت (عطا و بخشش) اور نشان (معجزہ) تھا، چنانچہ اس ہی کے متصل پہلا واقعہ وادیِ نملہ کا بیان کیا کہ کس طرح حضرت سلیمان

لہ تاریخ ابن کثیر۔ ج ۲ ص ۲۱۔

نے ایک حقیر جسم کے حیوان کی باتوں کو اس طرح سن لیا جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کی گفتگو بے تکلف سُن لیتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا کہ جب اس حیرت زا علم کے متعلق حضرت سلیمانؑ کو عین الیقین اور حق الیقین کا درجہ حاصل ہو گیا تو انہوں نے ایک اولوالعزم پیغمبر کی شان کے مناسب خدا کے اس عطا کردہ نشان پر اظہارِ تشکر و امتنان کیا۔

اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس سورۃ میں اس کا ذکر موجود ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ہی "سورۂ نمل" رکھا ہے۔

احمد زکی پاشا مصری نے اپنے ایک مقالہ میں آیتِ زیرِ بحث کے متعلق یہ کہا ہے کہ اس جگہ نملہ سے انسانوں کا انبوہِ کثیر مراد ہے یعنی وہ وادی میں چیونٹیوں کی طرح بیشمار تھے اور خوف تھا کہ کہیں سلیمان علیہ السلام کا لشکر ان کو نہ روند ڈالے، مگر زکی پاشا کی یہ تفسیر آیت کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس کی مُراد کی تحریف ہے اس لیے کہ آیت میں جبکہ حضرت سلیمانؑ اور اُن کے لشکر کے متعلق یہ مقولہ منقول ہے وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ یعنی ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو پیس ڈالیں اور ان کو یہ خبر بھی نہ ہو کہ تمہاری جانوں پر کیا حادثہ گزر گیا، تو نملہ سے کس طرح انسانوں کا کثیر گروہ مراد لیا جا سکتا ہے۔ نیز قرآنِ عزیز کا سیاق و سباق اس تاویل کو مردود قرار دیتا ہے کیونکہ اس صورت میں آیت کا تعلق نہ اس علم سے رہتا ہے جس کا پہلی آیت میں بڑی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور نہ انسانوں کے اس تحفظِ خود اختیاری کے مقولہ میں کوئی ایسی بات نظر آتی ہے جو حضرت سلیمانؑ کی متعجبانہ ہنسی کا سبب بن سکے، اور نہ یہ کوئی ایسا اہم واقعہ تھا جس کے متعلق حضرت سلیمانؑ کے اس احساسِ شکر گزاری کی اہمیت کو واضح کیا جاتا جس کو بعد کی آیت میں واضح کیا گیا ہے، اور پھر ان تمام باتوں کے علاوہ اگر یہ معاملہ انسانوں کے انبوہِ کثیر سے متعلق ہوتا تو قرآنِ عزیز کو ایسے صاف اور سادہ معاملہ کو ایسے پیچیدہ کنایہ اور اشارہ میں بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ جس کی مراد سمجھنے میں خواہ مخواہ مغالطہ پیدا ہو اس لیے کہ اگر کہیں بے شمار انسانوں اور حیوانوں کا مثلاً اجتماع

ہو تو مختلف زبانوں کے محاورہ میں یہ تو بیشک کہا جاتا ہے کہ چیونٹیوں کی طرح بیشمار تھے مگر جس مقام پر نہ کسی انسانی جماعت کا پہلے سے کوئی ذکر ہو رہا ہو اور نہ اُن کی کثرت وقلت کی کوئی بحث ہو رہی ہو اس جگہ کلام کی ابتدا، اگر یوں کی جائے کہ جب لشکر وادیٔ نملہ پر پہنچا تو نملہ نے کہا، تو کسی زبان کے محاورہ میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے انسانوں کا انبوہِ کثیر مراد ہے۔

آج کے علمی دور میں جبکہ "ماہرینِ علم اَلسِنۂ حیوانات" کی تحقیق اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ یدِ قدرت نے حیوانات میں بھی نفسِ ناطقہ اور اس کے لیے لغاتِ مخصوصہ ودیعت کیے ہیں اگرچہ وہ "نفوس" انسان کے نفسِ ناطقہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ضعیف اور کمزور ہیں اور جبکہ حیوانات کی فہم و فراست پر فلسفیانہ مباحث مہیا کیے جا رہے ہیں اور ان کی بولیوں اور زبانوں کی اقسام اور ان کی جدا جدا ابجد کو حقائقِ ثابتہ کی طرح نمایاں کیا جا رہا ہے[1]۔ ایسے دور میں اگر "وحیِ الٰہی" کے ذریعہ یہ یقین دلایا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک خاص بندے (پیغمبر) کو دنیوی اسباب سے بالاتر ہو کر حیوانات کی بول چال کا علم عطا فرمایا تو سخت حیرت ہے کہ اس کو کیوں عقلاً محال سمجھا جاتا اور اس میں رکیک تاویل بلکہ تحریف کی سعی کی جاتی ہے۔

بعض روایات میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان کے زمانہ میں بارش نہیں ہوئی، قحط کی حالت دیکھ کر حضرت سلیمان اپنی اُمت کے ساتھ استسقاء کے لیے میدان میں نکلے، راہ میں دیکھا کہ ایک چیونٹی اگلے قدم اٹھائے آسمان کی جانب نظر کیے یہ دعا مانگ رہی ہے: "خدایا ہم بھی تیری مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں اور تیرے فضل کے محتاج ہم کو بارش سے محروم رکھ کر ہلاک نہ کر" حضرت سلیمان نے قوم سے فرمایا: واپس چلو ایک حیوان کی دعا نے ہمارا کام کر دیا، اب تمھاری طلب کے بغیر ہی بارش ہوگی۔

---

[1] دائرۃ المعارف للبستانی جلد ۷ ص ۲۸۷ - ۲۸۸۔

یہ روایت موقوف اور مرفوع دونوں طریقوں سے ابن عساکر اور ابن ابی حاتم نے روایت کی ہے[1] لیکن محدثین کے نزدیک اس روایت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب نسبت کرنا محلِ نظر ہے۔ البتہ چیونٹی کے بارہ میں صحیح مسلم میں ایک مرفوع حدیث یہ ضرور موجود ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ کسی "نبی" کے ایک چیونٹی نے کاٹ کھایا، پیغمبر نے غصہ میں اس سوراخ کو جلا دینے کا حکم دے دیا جس میں سے اس چیونٹی نے نکل کر اُن کے کاٹا تھا۔ فوراً ان پر خدا کی وحی نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک چیونٹی کے کاٹنے پر گھر کو جلا دینے کا حکم تم نے کیوں دیا، تم کو کیا معلوم کہ اس میں کس قدر بے خطا چیونٹیاں موجود تھیں۔ صرف اس ایک چیونٹی ہی کو ہلاک کر دینے پر کیوں اکتفا نہیں کیا؟[2]

آیتِ زیرِ بحث میں حضرت سلیمانؑ کا یہ مقولہ مذکور ہے "وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ" (ہم کو سب کچھ دیا گیا ہے) اس کے معنی صاف اور متبادر یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہم کو ایسا نوازا ہے کہ اپنی نعمتوں کی ہم پر بارش کر دی ہے اور یہ کہ گویا کائنات کی ہر چیز ہم کو میسر ہے۔

حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا

قرآنِ عزیز نے سورۂ نمل میں حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کا ایک واقعہ قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے، جو اپنے تفصیلی اور جزئی واقعات کے لحاظ سے بہت دلچسپ اور پیدا شدہ نتائج و بصائر کے پیشِ نظر بہت اہم تاریخی واقعہ ہے۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے عظیم الشان اور بے مثال دربار میں انسانوں کے علاوہ جن اور حیوانات بھی درباری خدمات کے لیے فوج در فوج حاضر رہتے تھے اور اپنے اپنے مراتب اور مُفوَّضہ خدمات پر بغیر چون و چرا تابعِ فرمان۔ ایک مرتبہ دربارِ سلیمانی اپنے پورے جاہ و حشم کے ساتھ منعقد تھا، حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے جائزہ لیا تو ہُدہُد کو اپنی جگہ پر غیر حاضر پایا۔ ارشاد فرمایا میں ہُدہُد کو موجود نہیں پاتا، اگر واقعی وہ غیر حاضر

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۔ و تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۳۵۹۔ [2] مسلم کتاب الانبیاء۔

2
9

ہے تو اس کی یہ بے وجہ غیر حاضری سخت قابلِ سزا ہے، اس لیے میں اس کو یا تو سخت عذاب دوں گا، یا ذبح کر ڈالوں گا، ورنہ یا پھر وہ اپنی غیر حاضری کی معقول وجہ بتائے۔ ابھی زیادہ وقفہ نہیں ہوا تھا کہ ہُدہُد حاضر ہوگیا اور حضرت سلیمانؑ کی باز پُرس پر کہنے لگا کہ میں ایک ایسی یقینی اطلاع لایا ہوں جس کی خبر آپ کو پہلے سے نہیں ہے، وہ یہ کہ یمن کے علاقہ میں سبا کی ایک ملکہ رہتی ہے اور خدا نے اس کو سب کچھ دے رکھا ہے اور اس کا تختِ سلطنت اپنی خاص خوبیوں کے اعتبار سے عظیم الشان ہے۔

ملکہ اور اس کی قوم آفتاب پرست ہے اور شیطان نے اُن کو گمراہ کر رکھا ہے اور وہ مالکِ کائنات، پروردگارِ عالم، وحدہٗ لاشریک لہٗ کی پرستش نہیں کرتے۔

حضرت سلیمانؑ نے فرمایا: اچھا تیرے سچ جھوٹ کا امتحان ابھی ہو جائیگا تو اگر سچا ہے تو میرا یہ خط لیجا اور اس کو اُن تک پہنچا دے اور انتظار کر کہ وہ اس کے متعلق کیا گفتگو کرتے ہیں۔

ملکہ کی گود میں جب خط گرا تو اُس نے اس کو پڑھا اور پھر اپنے درباریوں سے کہنے لگی کہ ابھی میرے پاس ایک معزز مکتوب آیا ہے جس میں یہ درج ہے:-

"یہ خط سلیمان کی جانب سے اور اللہ کے نام سے شروع ہے جو بڑا مہربان، رحم والا ہے، تم کو ہم پر سرکشی اور سربلندی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے اور تم میرے پاس خدا کے فرمانبردار (مسلم) ہو کر آؤ۔"

ملکۂ سبا نے خط کی عبارت پڑھ کر کہا: اے میرے ارکانِ دولت! تم جانتے ہو کہ میں اہم معاملات میں تمہارے مشورے کے بغیر کبھی کوئی اقدام نہیں کرتی اس لیے اب تم مشورہ دو کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟ ارکانِ دولت نے کہا کہ جہاں تک مرعوب ہونے کا تعلق ہے تو اس کی قطعاً ضرورت نہیں کیونکہ ہم زبردست طاقت اور جنگی قوت کے مالک ہیں، رہا مشورہ کا معاملہ تو فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے جو مناسب ہو اس کے لیے حکم کیجیے۔

ملکہ نے کہا۔ بیشک ہم طاقتور اور صاحبِ شوکت ضرور ہیں، لیکن سلیمانؑ کے معاملہ میں ہم کو عجلت نہیں کرنی چاہیے، پہلے ہم کو اس کی قوت و طاقت کا اندازہ کرنا ضروری ہے کیونکہ جس عجیب طریقہ سے ہم تک یہ پیغام پہنچا ہے وہ اس کا سبق دیتا ہے کہ سلیمانؑ کے معاملہ میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا مناسب ہے۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ چند قاصد روانہ کروں اور وہ سلیمانؑ کے لیے عمدہ اور بیش بہا تحائف لیجائیں اس بہانہ سے وہ اس کی شوکت و عظمت کا اندازہ لگا سکیں گے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے، اگر واقعی وہ زبردست قوت و شوکت کا مالک اور شاہنشاہ ہے تو پھر اس سے ہمارا لڑنا فضول ہے اس لیے کہ صاحبِ طاقت و شوکت بادشاہوں کا یہ دستور ہے کہ جب وہ کسی بستی میں فاتحانہ غلبہ کے ساتھ داخل ہوتے ہیں تو اس شہر کو برباد اور باعزت شہریوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں اس لیے بے وجہ بربادی مول لینی کیا ضرور۔

جب ملکۂ سبا کے قاصد تحائف لے کر حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے فرمایا: تم نے اور تمھاری ملکہ نے میرے پیغام کا مقصد غلط سمجھا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ان ہدایا کے ذریعہ جن کو تم بیش بہا سمجھ کر بہت مسرور ہو" مجھ کو پھسلاؤ، حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ خدائے تعالیٰ نے مجھ کو جو کچھ مرحمت فرمایا ہے اس کے مقابلہ میں تمھاری یہ بیش بہا دولت قطعاً ہیچ ہے لہٰذا تم اپنے ہدایا واپس لے جاؤ اور اپنی ملکہ سے کہو کہ اگر اس نے میرے پیغام کی تعمیل نہیں کی تو میں ایسے عظیم الشان لشکر کے ساتھ سبا والوں تک پہنچوں گا کہ تم اس کی مدافعت اور مقابلہ سے عاجز رہوگے اور پھر میں تم کو ذلیل و رسوا کر کے شہر بدر کر دوں گا۔

قاصدوں نے واپس جا کر ملکۂ سبا کے سامنے تمام روداد سنائی اور حضرت سلیمانؑ کی شوکت و عظمت کا جو کچھ مشاہدہ کیا تھا وہ حرف بحرف کہہ سنایا اور بتایا کہ اس کی حکومت صرف انسانوں ہی پر نہیں ہے بلکہ جن اور حیوانات بھی اُن کے تابعِ فرمان اور مسخر ہیں۔

ملکۂ سبا نے جب یہ سُنا تو طے کرلیا کہ حضرت سلیمانؑ سے لڑنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے بہتر یہی ہے کہ اس کی دعوت پر لبیک کہا جائے۔

حضرت سلیمانؑ کے مکتوبِ گرامی میں یہ جملہ بھی تھا "وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ" چونکہ ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کے دین و مذہب سے ناواقف تھی اس لیے اُس نے لفظِ مُسلم کو لغوی معنی پر محمول کرتے ہوئے یہ سمجھا کہ قاہر بادشاہوں کی طرح سلیمانؑ کا مقصد بھی یہ ہے کہ میں اس کی فرمانبرداری اور شانِ حکومت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے ماتحت ہوجانا قبول کرلوں۔ لہٰذا اُس نے یہ طے کرکے سفر شروع کردیا اور حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں روانہ ہوگئی۔

حضرت سلیمانؑ کو "وحی" کے ذریعہ معلوم ہوگیا کہ ملکۂ سبا حاضرِ خدمت ہورہی ہے، تب آپ نے اپنے درباریوں کو مخاطب کرکے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ ملکۂ سبا کے یہاں پہنچنے سے پہلے اُس کا تختِ شاہی اٹھاکر یہاں لے آیا جائے۔ تم میں سے کون اس خدمت کو انجام دے سکتا ہے؟ یہ سُن کر ایک دیو پیکر جن نے کہا کہ آپ کے دربار برخاست کرنے سے پہلے میں تخت کو لاسکتا ہوں، مجھ کو یہ طاقت حاصل ہے اور یہ کہ میں اُس کے بیش بہا سامان کے لیے امین ہوں، ہرگز خیانت نہیں کروں گا۔

دیو پیکر جن کا یہ دعویٰ سُن کر حضرت سلیمانؑ کے وزیر نے کہا کہ میں آنکھ جھپکتے اس کو آپ کی خدمت میں پیش کرسکتا ہوں۔ حضرت سلیمانؑ نے رُخ پھیر کر دیکھا تو ملکۂ سبا کا تخت موجود پایا۔ فرمانے لگے: یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے، وہ مجھ کو آزماتا ہے کہ میں اس کا شکرگزار بنتا ہوں یا نافرمان اور حقیقت تو یہ ہے کہ جو شخص اس کا شکرگزار ہوتا ہے وہ دراصل اپنی ذات ہی کو نفع پہنچاتا ہے اور جو نافرمانی کرتا ہے تو خدا اُس کی نافرمانی سے بے پروا اور بزرگتر ہے اور اس کا وبال خود نافرمانی کرنے والے ہی پر پڑتا ہے۔

خدائے تعالیٰ کے ادائے شکر کے بعد حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا کہ اس تخت کی ہیئت میں

کچھ تبدیلی کر دی جائے، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ملکۂ سبا یہ دیکھ کر حقیقت کی طرف راہ یاب ہوتی ہے یا نہیں۔

کچھ عرصے کے بعد ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں پہنچ گئی اور جب دربار میں حاضر ہوئی تو اس سے دریافت کیا گیا: کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ عقلمند ملکہ نے جواب دیا: "ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہی ہے" یعنی تخت کی ساخت اور مجموعی حیثیت تو یہ بتا رہی ہے کہ یہ میرا ہی تخت ہے اور قدرے ہیئت کی تبدیلی اس یقین میں تردد پیدا کر رہی ہے اس لیے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ یقیناً میرا ہی تخت ہے۔

ملکۂ سبا نے ساتھ ہی یہ بھی کہا: مجھ کو آپ کی بے نظیر اور عدیم المثال قوت و طاقت کا پہلے سے علم ہو چکا ہے اسی لیے میں مطیع اور فرمانبردار بن کر حاضرِ خدمت ہوئی ہوں اور اب تخت کا یہ محیر العقول معاملہ تو آپ کی لاثانی طاقت کا تازہ مظاہرہ ہے اور ہماری اطاعت و انقیاد کے لیے مزید تازیانہ، اس لیے ہم پھر ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں اظہارِ وفاداری و فرمانبرداری کرتے ہیں۔

ملکہ نے یقین کر لیا کہ "کُنَّا مُسْلِمِیْنَ" (ہم فرمانبردار ہیں) کہہ کر ہم نے سلیمانؑ کے پیغام کی تعمیل کر دی اور اس کے مقصد کو پورا کر دیا اور ملکہ کی مشرکانہ زندگی اور آفتاب پرستی مانع آئی کہ وہ حضرت سلیمانؑ کے پیغام کی حقیقت سمجھ سکے اور ہدایت کی جانب راہ یاب ہو سکے، اس لیے اب حضرت سلیمانؑ نے اظہارِ مقصد کے لیے دوسرا لطیف طریقہ اختیار فرمایا اور اس کی ذکاوت و فطانت کو مہمیز کیا وہ یہ کہ انھوں نے جنوں کی مدد سے ایک عالیشان شیش محل تیار کرایا تھا جو آبگینہ کی چمک، قصر کی رفعت اور عجیب و غریب صنعت کاری کے لحاظ سے بے نظیر تھا اور اس میں داخل ہونے کے لیے سامنے جو صحن پڑتا تھا اس میں بہت بڑا حوض کھدوا کر پانی سے لبریز کر دیا تھا اور پھر شفاف آبگینوں اور بلور کے ٹکڑوں سے ایسا نفیس فرش بنایا گیا تھا کہ دیکھنے والے کی نگاہ دھوکا کھا کر یہ یقین کر لیتی تھی کہ صحن میں صاف و

شفاف پانی بہہ رہا ہے۔

ملکۂ سبا سے کہا گیا کہ قصرِ شاہی میں قیام کرے، ملکہ محل کے سامنے پہنچی تو شفاف پانی بہتا ہوا پایا، یہ دیکھ کر ملکہ نے پانی میں اُترنے کے لیے کپڑوں کو ساق سے اوپر چڑھایا تو حضرت سلیمانؑ نے فرمایا اس کی ضرورت نہیں یہ پانی نہیں ہے، سارے کا سارا محل اور اس کا خوبصورت صحن چمکتے ہوئے آبگینہ کا ہے۔

ملکہ کی ذکاوت و فطانت پر یہ سخت چوٹ تھی جس نے حقیقتِ حال سمجھنے کے لیے اس کے قوائے عقلی کو بیدار کر دیا اور اس نے اب سمجھا کہ اس وقت تک یہ جو کچھ ہوتا رہا ہے، ایک زبردست بادشاہ کی قاہرانہ طاقتوں کا مظاہرہ نہیں ہے بلکہ مجھ پر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ سلیمانؑ کو یہ بے نظیر طاقت اور یہ معجزانہ قدرت کسی ایسی ہستی کی عطا کردہ ہے جو شمس و قمر بلکہ کل کائنات کا تنہا مالک ہے اور اس لیے سلیمانؑ مجھ سے اپنی تابعداری اور فرمانبرداری کا طالب نہیں بلکہ اُسی "یکتا ذات" کی اطاعت و انقیاد کی دعوت دینا اس کا مقصد ہے۔

ملکہ کے دماغ میں یہ خیال آنا تھا کہ اس نے فوراً حضرت سلیمانؑ کے سامنے ایک شرمسار اور نادم انسان کی طرح درگاہِ الٰہی میں یہ اقرار کیا "پروردگار! آج تک ماسوی اللہ کی پرستش کر کے میں نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا، مگر اب میں سلیمانؑ کے ساتھ ہو کر صرف ایک خدا ہی پر ایمان لاتی ہوں جو تمام کائنات کا پروردگار ہے" اور اس طرح حضرت سلیمانؑ کے پیغام "وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ" کی حقیقی مراد تک پہنچ کر اس نے دینِ اسلام اختیار کر لیا۔

قرآنِ عزیز نے ملکۂ سبا کے اس واقعہ کو ایسے معجزانہ اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ واقعہ کے بیان کرنے سے جو حقیقی مقصد ہے یعنی "تذکیر" وہ بھی نمایاں رہے اور واقعہ کے اہم اور ضروری حصے بھی ذکر میں آجائیں اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جائے کہ حضرت سلیمانؑ کو علم "منطق الطیر" عطا ہونے کا جو پہلی آیات میں ذکر ہے اس کی شہادت کے لیے یہ دوسرا

واقعہ ہے جو ہُدہُد (پرند) اور حضرت سلیمانؑ کے مکالمے سے شروع ہوتا ہے:-

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ
أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ
الْغَآئِبِيْنَ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا
شَدِيْدًا أَوْ لَاَاذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّيْ
بِسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ فَمَكَثَ غَيْرَ
بَعِيْدٍ فَقَالَ أَحَطتُّ بِمَا لَمْ
تُحِطْ بِهِ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ
بِنَبَإٍ يَّقِيْنٍ إِنِّيْ وَجَدْتُّ
امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوْتِيَتْ
مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ
عَظِيْمٌ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا
يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ
السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ
أَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ
الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ
وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ
اَللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ
الْعَظِيْمِ قَالَ سَنَنْظُرُ

اور پرندوں کا جائزہ لیا تو کہنے لگا: کیا وجہ ہے میں ہُدہُد کو نہیں پاتا، کیا واقعی وہ غائب ہے؟ ایسا ہے تو ضرور میں اس کو سخت عذاب میں ڈالوں گا یا ضرور اس کو ذبح کردوں گا اور یا میرے پاس غیر حاضری کی معقول وجہ بیان کرے۔ بہت دیر نہیں لگی کہ (ہُدہُد نے حاضر ہوکر) کہا: میں ایسی خبر لایا ہوں جس کا آپ کو پہلے سے علم نہیں تھا۔ میں سبا کی ایک یقینی خبر لے کر آپ کے پاس حاضر آیا ہوں، میں نے ایک عورت کو ملکہ دیکھا جو اہلِ سبا پر حکومت کرتی ہے اور اس کے پاس سب کچھ مہیا ہے اور اس کا ایک عظیم الشان تخت ہے۔ میں نے اس کو اس حال میں پایا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے سوا آفتاب کی پرستش کرتی اور ان کے سامنے سربسجدہ ہوتی ہے اور شیطان نے انکے ان کاموں کو بھلا اور اچھا دکھا رکھا اور راہِ مستقیم سے ہٹا رکھا ہے، لہٰذا وہ راہ یاب نہیں ہوتے (تعجب ہے کہ وہ کیوں اس اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جو نکالتا ہے آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں، اور جو تم ظاہر کرکے کرتے اور جو چھپا کر کرتے ہو، ان سب کا جاننے والا ہے۔ اللہ ہے اس کے ماسوا کوئی خدا نہیں، وہ پروردگار ہے عرشِ عظیم کا۔ سلیمان نے کہا:

أَصَدَقْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ — ہم اب دیکھتے ہیں کہ تو اپنے قول میں سچا ہے یا جھوٹا

اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ — ہے۔ لے یہ میرا خط لیجا اور ان کی طرف ڈال دے پھر

اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ — اُن کے پاس سے ہٹ کر دیکھ وہ کیا جواب دیتے ہیں

مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ۝ قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا — (ملکہ) کہنے لگی: اے درباریو! میرے پاس ایک معزز

الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ — خط ڈالا گیا ہے (اس میں تحریر ہے) "یہ خط ہے سلیمان

كَرِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ — کی طرف سے اور وہ یہ ہے کہ اس اللہ کے نام سے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ — شروع جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے، تم کو

اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝ — چاہیے کہ مجھ پر برتری کا اظہار نہ کرو اور میرے مقابلے میں

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ — قوت کا مظاہرہ نہ کرو اور چلے آؤ میرے پاس مسلمان

فِيْٓ اَمْرِيْ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً — ہو کر" کہنے لگی اے میری جماعت! مجھ کو میرے معاملہ میں

اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ۝ قَالُوْا — مشورہ دو (کیونکہ) میں تمہارے بغیر مشورہ کوئی فیصلہ نہیں

نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ — کرتی۔ انھوں نے جواب دیا: ہم بہت قوت والے اور

شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ — سخت جنگجو ہیں آگے تیرے اختیار میں ہے تو غور کرلے

فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ۝ — کہ تیرا کیا حکم ہے (ملکہ نے) کہا: "بادشاہ جب (فاتحانہ)

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا — کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو خراب کرتے اور

قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا — وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں،

اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ — اور یہ واقعہ ہے کہ سلاطین ایسا ہی کرتے ہیں" اور میں

يَفْعَلُوْنَ ۝ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ — اُن کی جانب کچھ ہدایا بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں کہ قاصد

اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ — کیا جواب لے کر واپس آتے ہیں۔ قاصد جب

يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَ — سلیمان کے پاس پہنچا تو سلیمان نے کہا کیا تم

سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ — میری مالی اعانت کرنا چاہتے ہو (جو یہ پیش بہا ہدایا

بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰنِ ۦَ اللّٰہُ خَیْرٌ
مِّمَّآ اٰتٰکُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِھَدِیَّتِکُمْ
تَفْرَحُوْنَ ۝ اِرْجِعْ اِلَیْھِمْ
فَلَنَاْتِیَنَّھُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَھُمْ
بِھَا وَلَنُخْرِجَنَّھُمْ مِّنْھَآ اَذِلَّۃً وَّ
ھُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ قَالَ یٰٓاَیُّھَا
الْمَلَؤُا اَیُّکُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِھَا
قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ۝
قَالَ عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِیْکَ
بِہٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِکَ
وَاِنِّیْ عَلَیْہِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ ۝
قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ
الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ
اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ
فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ قَالَ
ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِیَبْلُوَنِیْٓ
ءَاَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ وَمَنْ شَکَرَ
فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ وَمَنْ کَفَرَ
فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ ۝ قَالَ
نَکِّرُوْا لَھَا عَرْشَھَا نَنْظُرْ اَتَھْتَدِیْٓ
اَمْ تَکُوْنُ مِنَ الَّذِیْنَ

لے کر آئے ہو) مجھے نہیں چاہئیں تم ہی اپنے ان
تحفوں سے خوش رہو۔ تو واپس جا (اگر میرے پیغام
کا یہی جواب ہے) تو ہم ان پر آپہنچتے ہیں، ایسا لشکر
لے کر جن کا مقابلہ ان سے نہ ہو سکے اور ہم ان کو ذلیل
کرکے ان بستیوں سے نکال دیں گے (قاصد نے
جواب سنایا تو ملکہ نے فوراً ارادہ کرلیا کہ سلیمان تک
پہنچے۔ حضرت سلیمان کو یہ معلوم ہوا تو) سلیمان نے
کہا: اے درباریو! تم میں کوئی ایسا ہے جو اس کا تخت
لے آئے قبل اس کے کہ وہ فرمانبردار ہو کر آپہنچے۔ ان میں
سے ایک دیوپیکر جن نے کہا: میں اس کو آپ کی مجلس
برخاست ہونے سے پہلے لا سکتا ہوں اور مجھ کو یہ قدرت
حاصل ہے اور میں اس کے بارے میں امین ہوں اور جس
کے پاس کتاب (الٰہی) کا علم تھا اس نے کہا: میں تیری
پلک جھپکنے سے پہلے اس کو حاضر کر سکتا ہوں۔ پھر جب سلیمان نے
(پلک جھپکتے ہی) اس کو اپنے پاس موجود پایا تو کہا: یہ میرے
پروردگار کا فضل ہے میری آزمائش کے لیے کہ میں شکر کرتا ہوں
یا ناشکری اور جو شکر کرتا ہے وہ اپنے نفس کیلئے شکر کرتا
ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو میرا پروردگار بے پروا
ہے کرم والا ہے۔ سلیمان نے کہا اس تخت
کی ہیئت بدل کر اس کو عورت کے سامنے پیش
کرو ہم دیکھیں گے کہ وہ سمجھ پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے

تَرْتَدُّوْنَ ○ فَلَمَّا جَآءَتْ	جن کو کچھ نہیں، جب وہ آپہنچی تو اس سے کہا گیا: کیا
قِيْلَ أَهٰكَذَا عَرْشُكِ قَالَتْ	ایسا ہی ہے تیرا تخت ؟ اُس نے کہا: گویا یہ وہی ہے اور
كَأَنَّهُ هُوَ وَأُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ	ہم کو (سلیمان کی بے نظیر طاقت کا) پہلے سے علم ہو چکا
قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ○ وَصَدَّهَا	ہے اور ہم اس کے فرمانبردار ہیں اور اس کو (ایمان لانے
مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	سے) روکے رکھا اُس چیز نے جس کو وہ خدا کے ماسوا پوجتی
إِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ○	تھی، بے شبہ وہ قوم کافرین میں سے تھی (اب) اس سے
قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ	کہا گیا، محل میں چلو، اس نے محل (کی ساخت) کو دیکھا
فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ	تو سمجھی کہ گہرا پانی بہہ رہا ہے اور سوچ کر پار ہونے
كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا قَالَ إِنَّهٗ	کے لیے) اپنی پنڈلیاں کھولیں (کسی نے کہا) یہ تو
صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ	ایک محل ہے جس میں جڑے گئے ہیں آبگینے کہنے لگی:
قَالَتْ رَبِّ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ	اے پروردگار! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور میں
وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ	اب سلیمان کے ساتھ ایمان لاتی ہوں اس اللہ پر
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (نمل ع ۳)	جو پروردگار ہے جہانوں کا۔

چند قابلِ تحقیق مسائل حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کے واقعہ سے متعلق چند مسائل قابلِ تحقیق ہیں۔ جن کا حل ہونا ازبس ضروری ہے۔ اور وہ ترتیب وار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :-

سبا کی تحقیق سبا کے متعلق مفصل تحقیق تو "سیلِ عرم" کی بحث میں آئے گی، یہاں صرف اس قدر معلوم ہو جانا کافی ہے کہ قحطانی نسل کی ایک مشہور شاخ سبا ہے، یہ اپنے قبیلہ کا جدِ اعلیٰ تھا اور اس کا نام عمر یا عبد شمس تھا اور سبا اُس کا لقب، یہ عرب مؤرخین اور جدید مؤرخین کی تحقیق ہے اور توراۃ کا بیان ہے کہ اس کا نام ہی سبا تھا۔ یہ شخص بہت جری اور صاحبِ ہمت تھا اور اس نے زبردست فتوحات کے ذریعہ حکومتِ سبا کی بنیاد ڈالی۔ سبا کا

زمانۂ عروج محققین کے نزدیک تقریباً ۱۱۰۰ ق م سمجھا جاتا ہے اس لیے کہ تقریباً ۱۰۰۰ ق م اس کی حکومت وطاقت اور عروج کا ذکر داؤد (علیہ السلام) کی زبور میں موجود ہے — وہ فرماتے ہیں:۔

"اے خدا بادشاہ کو اپنی عدالتیں عطا کر اور بادشاہ کے بیٹے کو اپنی صداقت دے۔ وہ تیرے لوگوں میں صداقت سے حکم کرے گا...... ترسیس اور جزیروں کے سلاطین نذریں دینگے اور سبا اور سبا کے بادشاہ ہدیے گزرانیں گے..... وہ جیتا رہے گا اور سبا کا سونا اُسے دیا جائے گا اس کے حق میں سدا دعا ہوگی۔[1]

چنانچہ حضرت داؤدؑ کی یہ دعا قبول ہوئی اور تقریباً ۹۵۰ ق م میں ملکۂ سبا نے حاضر ہو کر سبا کا سونا اور جواہرات نذر گزرانے بلکہ مسلمان ہو کر حکومتِ سبا کو ہی حضرت سلیمانؑ کے زیر فرمان کر دیا۔

سبا کی حکومت کا اصل مرکز عرب کے جنوبی حصۂ یمن کے مشرقی علاقہ میں تھا اور دارالحکومت کا نام مآرب تھا، اس کو شہر سبا بھی کہتے تھے اور آہستہ آہستہ اس کا دائرہ وسیع ہو کر مغرب میں حضرموت تک وسیع ہوگیا تھا اور دوسری جانب افریقہ تک بھی اس کا اثر پہنچ چکا تھا چنانچہ حبشہ میں اذینہ کا علاقہ سبا کے ماتحت تھا جس پر معافر ایک سبائی گورنر حکومت کرتا تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ معین کی حکومت زوال پذیر تھی اور سبا نے یمن اور اطراف یمن میں اپنے مشہور قلعے تعمیر کر لیے تھے اور معین کے قلعے کھنڈر کی صورت میں بدلتے جا رہے تھے۔

سبا کی مختلف شاخیں تھیں اور عرصۂ دراز کے بعد ان میں سے متعدد شاخوں نے یمن کو مرکزِ حکومت بنا کر عظیم الشان تمدن اور حکومت کی بنیادیں قائم کر لی تھیں ان میں سے حمیر اور تبابعہ مشہور حکمراں شاخیں ہیں اور اُن سے قبل کے سبا کے حکمراں ملوکِ سبا کے لقب سے مشہور ہیں اور ملوکِ سبا کا آخری دورِ حکومت ۱۱۵ ق م بتایا جاتا ہے۔[2]

---

[1] زبور ۷۲ (سلیمان کا زبور) [2] معجم البلدان و دائرۃ المعارف ذکرِ سبا۔

ملکۂ سبا کا نام | قرآنِ عزیز نے حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کے واقعہ میں نہ یہ بتایا کہ اس ملکہ کا نام کیا تھا اور نہ یہ تعیین کی کہ وہ سبا کے دائرۂ حکومت کے تین مرکز یمن، حبشہ، شمالی عرب میں سے کس حصہ سے آئی تھی۔ کیونکہ اُس کے مقصد کے لیے یہ دونوں باتیں غیر ضروری ہیں مگر عرب یہود کی اسرائیلی داستانوں میں اس کا نام بلقیس مذکور ہے اور اہلِ حبشہ "جن کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ ملکۂ سبا اور حضرت سلیمانؑ کی نسل سے ہیں" اپنی زبان میں ملکہ کا نام ماکدہ بیان کرتے ہیں۔

جہت کے متعلق ترگوم[1] میں ہے کہ اس کا ملک فلسطین سے مشرق میں ہے اور انجیل[2] میں ہے کہ فلسطین کے جنوب میں ہے۔ یوسیفوس[3] کی تاریخ میں ہے کہ وہ مصر و حبشہ کی ملکہ تھی اور اہلِ حبش اس کو حبشی نژاد سمجھتے اور شاہانِ حبش آج تک فخریہ یہ کہتے ہیں کہ وہ ملکۂ سبا (بلقیس) کی نسل سے ہیں۔

ان روایات میں اہلِ تحقیق یوسیفوس کی روایت کو غلط کہتے ہیں اور باقی دونوں روایتوں کا حاصل ایک ہی ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ دونوں حصے یمن ہی کی حکومت کے حصے تھے اور انجیل کے بیان کو زیادہ صحیح مانتے ہیں۔ ماہرینِ اثریات (Archaeologists) کہتے ہیں کہ خاص یمن کے علاقہ میں کتبات اور دیگر حفریات سے کسی عورت کا حکمراں ہونا ثابت نہیں ہوتا، البتہ شمالی عرب متصل عراق میں چار قدیم حکمراں عورتوں کے نام ضرور ملتے ہیں، لہٰذا زیادہ امکان یہ ہے کہ ملکۂ سبا اسی حصہ سے حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں پہنچی ہے۔

ھُدھُد | قرآنِ عزیز نے بہت صاف اور واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا قاصد ہُدہُد پرندہ تھا، لیکن قانونِ قدرت اور نیچر کا نام لے کر آج کل کے بعض اہلِ علم اس قسم کے اعجاز نما واقعات سے بھڑکتے اور اُن کو خلافِ عقل کہہ کر آیاتِ

---

[1] جیوئش انسائیکلوپیڈیا "سبا" [2] متی باب ۱۲، آیت ۴۲۔ لوقا باب ۱۱ آیت ۳۱۔ [3] ارض القرآن۔ ماخوذ از تاریخ یوسیفوس۔ ج ۱۔ ذکر سلیمان۔

قرآنی کے انکار پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اگر مذہب پر بہت احسان فرماتے ہیں تو آیات کی معنوی تحریف کر کے رکیک تاویلات اور قرآن کی مراد کے خلاف خود ساختہ توجیہات بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر بھی یہی پیش آیا کہ اوّل پرندہ کا بات چیت کرنا خلافِ عقل قرار دیا گیا اور پھر واقعۂ زیرِ بحث سے متعلق آیات کے معنی بیان کیے گئے اور کہا گیا کہ پہلے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ مشرکین اکثر اپنی اولاد کے نام دیوتاؤں اور دیویوں کے نام پر رکھ لیا کرتے تھے، جن میں حیوانات کے نام بھی ہوتے تھے۔ لہٰذا اس جگہ بھی ہُدہُد سے پرندہ مراد نہیں ہے بلکہ حضرت سلیمانؑ کا قاصد "انسان" مراد ہے جس کا نام غالباً ہُدہُد ہوگا۔ لیکن جب اُن پر یہ اعتراض وارد ہوا کہ قرآنِ عزیز نے جبکہ صاف الفاظ میں یہ کہا ہے وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ (اور پرندوں کا جائزہ لیا) تو ہُدہُد کو انسان کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ تب مولوی چراغ علی نے اس کی یہ توجیہ بیان کی کہ اس جگہ طیر کے معنی "فوج" کے ہیں یعنی جب سلیمانؑ نے فوج کا جائزہ لیا۔ مگر افسوس کہ ان کے یہ معنی بے سند اور عربی لغت کے پیشِ نظر باطل ہیں اور یہ مسلّم ہے کہ لغت میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے بلکہ وہ اہلِ زبان کے استعمال کے تابع ہے اور اہلِ عرب حقیقی اور مجازی کسی معنی کے اعتبار سے بھی "طیر" بمعنی 'فوج' نہیں استعمال کرتے، بلکہ "الطیر" اور "طیر" متعلقات و اضافات سے مجرد ہونے کی صورت میں صرف "پرندہ" کے معنی ہی میں بولا جاتا ہے۔

قرآنِ عزیز اُس زندہ زبان میں نازل کیا گیا ہے، جس کو لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ کہا گیا ہے، یہ کسی مُردہ زبان میں نہیں اُتارا گیا کہ ہر شخص اپنی مرضی کے ماتحت جس لفظ کے جو چاہے معنی بیان کر دے۔ ایک شخص "اصحابِ فیل" کے اصل واقعہ کا انکار کرنا چاہے تو طَيْرًا أَبَابِيلَ میں طیر کے معنی بدشگونی کے اختیار کرنے اور دوسرا شخص اگر ہُدہُدِ سلیمانؑ کو پرندہ تسلیم کرنے سے منکر ہو تو وہ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ میں "طیر" کے معنی "فوج" کے بیان کر دے خواہ دونوں معنی اپنے اپنے مقام پر لغتِ عرب کے لحاظ سے قطعاً غلط اور محاورۂ عرب

کے اعتبار سے باطل ہی کیوں نہ ہوں۔ سخت تعجب ہے مولانا سید سلیمان ندوی سے کہ اس مقام پر مولوی چراغ علی کی تاویلِ باطل کا رد کرنے کے باوجود اس مسئلہ کو عقلی بنانے کے خیال میں یہ تحریر فرما رہے ہیں:۔

اور اگر پرندوں کا بولنا اب بھی کھٹکتا ہے تو فرض کر لو کہ نامہ بر کبوتروں کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر ہُدہُد ہوگا اور اس کے بولنے سے مقصود اس مضمون کا خط اُس کے پاس ہونا سمجھ لو جیسا کہ خود اس موقع پر قرآن مجید میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے خط دے کر اس کو ملکۂ سبا کے پاس بھیجا۔ اسی طرح پہلے بھی خط لے کر آیا ہوگا۔[1]

تعجب اس لیے ہے کہ جبکہ قرآنِ عزیز "منطق الطیر" کو اور "نملہ" اور "ہُدہُد" کے واقعات کو حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے لیے عظیم الشان نعمت اور بے غایت احسان ظاہر کر رہا ہے اور قرآنِ عزیز کا سیاق اور سباق ان واقعات کو ایسے انداز میں ہونا بیان کرتا ہے جس سے ہُدہُد کا پرندہ ہو کر حضرت سلیمانؑ سے باتیں کرنا صاف اور صریح معلوم ہوتا ہے تو چند فطرت پرستوں کے بے دلیل انکار اور حقائقِ ثابتہ کو اپنے ناقص علم میں محدود ماں کر دی کے دیئے ہوئے علم کے انکار پر اصرار کی خاطر سید صاحب نے کیوں ایسی تاویل بیان کی جو قرآنِ عزیز کے بیان کردہ مقصد کے خلاف ہے نیز کسی واقعہ کا توراۃ یا اسرائیلی روایات میں منقول ہونا اُس کے باطل اور لغو ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ جب قرآنِ عزیز یا احادیثِ صحیحہ بدلائل اس کے باطل ہونے کو واضح کریں یا قرآن و حدیث کے روشن اصول و مسلمات کے خلاف وہ کوئی بات بیان کریں یا ایسی تفصیلات نقل کریں کہ جو قرآن و حدیث میں مذکور نہیں ہیں اور عقل و درایت کی نگاہ میں لغو و فضول ہیں تو بے شبہ اس قسم کی تمام اسرائیلی روایات قابلِ رد ہیں لیکن ایک واقعہ بصراحت قرآن یا حدیث میں موجود ہے اور توراۃ یا اسرائیلی ادبیات بھی اسی طرح کا واقعہ نقل کرتی ہیں تو محض اس لیے کہ یہ واقعہ اسرائیلی روایات میں بھی مذکور ہے اس کو غلط قرار دے کر قرآن کے صاف اور صریح مطالب

[1] ارض القرآن جلد ۱ ص ۲۶۰۔

میں بھی تحریف یا رکیک تاویلات کا باب کھول دینا ہرگز جائز نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے برعکس اسرائیلی ادبیات میں منقول شدہ واقعہ کو قرآن اور حدیث کے مصرحہ واقعہ کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ ہُدہُد (پرندہ) حضرت سلیمانؑ کا پانی کے لیے مہندس تھا زمین کے اندر جس جگہ بھی پانی ہوتا اور لشکر کو ضرورت پیش آتی تو ہُدہُد بتا دیتا کہ اس جگہ اس قدر گہرائی پر پانی ہے اور حضرت سلیمانؑ جنوں سے کھدائی کرا کر پانی کو کام میں لاتے [1]

ملکۂ سبا کا تخت ملکۂ سبا کے تخت کی تعریف ہُدہُد کی زبانی ہم سُن چکے ہیں اور اس سلسلہ میں حضرت سلیمان کا معجزہ بھی قرآن میں مذکور ہے کہ اُن کے حکم سے نگاہ پلٹتے ہی وہ تخت سبا کے ملک سے حضرت سلیمانؑ کے دربار میں پیش کر دیا گیا۔ اس کے متعلق قرآن عزیز کی چند تصریحات کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

(۱) ملکہ نے اپنے قاصدوں کے ہاتھ جو ہدایا بھیجے تھے حضرت سلیمانؑ نے اُن کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَیْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِیَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ۝ اِرْجِعْ اِلَیْهِمْ الآیۃ

(۲) جب حضرت سلیمانؑ کو معلوم ہوا کہ ملکۂ سبا (حضرت سلیمانؑ کے ملک کی جانب) روانہ ہو گئی تو درباریوں سے کہا کہ اُس کے یہاں آنے سے قبل کون اُس کے تخت کو میرے پاس لا سکتا ہے: قَالَ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَیُّكُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ۝

(۳) اول ایک دیو پیکر جن نے کہا کہ میں آپ کے دربار برخاست ہونے سے پہلے اس کو حاضر کر سکتا ہوں اور اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ کہا کہ میں بہت قوی ہوں اور اُس تخت کے بیش قیمت سامان کے لیے امین بھی ہوں: قَالَ عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ وَاِنِّیْ عَلَیْهِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ ۝

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۱۔

(۴) حضرت سلیمانؑ کے وزیر نے کہا کہ میں آپ کی نگاہ پلٹتے ہی اس کو پیش کرسکتا ہوں " اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ "

(۵) جب حضرت سلیمانؑ نے رُخ پھیر کر دیکھا تو تخت کو اپنے نزدیک موجود پایا، یہ دیکھ کر انھوں نے خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا فضل میری اس آزمائش کے لیے ہے کہ میں اُس کا شکر گزار بندہ ہوں یا نافرمان " فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ "

(۶) حضرت سلیمانؑ نے اب حکم دیا کہ اس کی ہیئت تبدیل کردو قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِیْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِیْنَ لَا یَهْتَدُوْنَ "

(۷) جب ملکہ سبا سفر کر کے دربارِ سلیمانؑ میں پہنچ گئی تو اب اس سے یہ دریافت کیا گیا کہ یہ تخت ایسا ہی ہے جیسا کہ تیرا؟ اور اس نے عاقلانہ جواب دیا، گویا یہ وہی ہے " فَلَمَّا جَآءَتْ قِیْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ " تخت سے متعلق اس تفصیل اور پھر اس کی ترتیب کو پیشِ نظر رکھیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن ایک ایسے تخت کا ذکر کر رہا ہے جس کی خبر ہُدہُد نے سلسلۂ پیغام سے پہلے دی تھی وہ سلیمانؑ کے لیے بنایا نہیں گیا تھا اس لیے کہ قاصدوں کی معرفت جو ہدایا بھیجے گئے ان میں تخت کا کوئی ذکر نہیں ہے اور وہ واپس بھی گئے، مگر ملکہ کے آنے کی خبر سُن کر حضرت سلیمانؑ اس کا شاہی تخت اُس کے پہنچنے سے قبل اپنے دربار میں منگانا چاہتے ہیں اور اس کا لانا ایسا عجیب وغریب ہے کہ جنوں میں سے بھی ایک بہت بڑا دیو پیکر جن یہ وعدہ کرتا ہے کہ دربار برخاست ہونے سے پہلے اُٹھا کر لا سکتا ہوں مگر حضرت سلیمانؑ کا معتمد کہتا ہے کہ میں پلک جھپکتے حاضر کردوں گا اور حاضر کر دیتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ خدا کے عطا کردہ اس اعجاز کو دیکھ کر اُس کو خدا کا عظیم الشان فضل قرار دیتے ہیں اس کے بعد تخت کی ہیئت تبدیل کرنے کا حکم فرماتے ہیں اور ان تمام مراحل کے بعد اب ملکہ حضرت سلیمانؑ کے دربار

میں پہنچتی ہے اور تخت سے متعلق سوال وجواب ہوتے ہیں اور اس جگہ بھی قرآن ملکہ سبا کے کسی تحفہ کا ذکر نہیں کرتا۔

اس پوری تفصیل میں نہ اپنی جانب سے کوئی تاویل اور توجیہ ہے اور نہ توڑ مروڑ کر اُس کو اپنی خواہش کے مطابق کیا گیا ہے لہٰذا اس تخت کا معاملہ بے شک وشبہ اعجاز اور حضرت سلیمانؑ کی نبوت ورسالت کا "نشان" ہے، اور جن حضرات نے اس کے علاوہ دوسرے معانی یا تفاسیر بیان کی ہیں وہ سب باطل ہیں۔ اس لیے کہ وہ یا تو قرآن کے صاف اور سادہ بعض حصوں کو نظر انداز کر کے بیان کی گئی ہیں جیسا کہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے کیا ہے یا اس کے بعض الفاظ سے غلط فائدہ اُٹھا کر باقی پورے واقعہ کی حقیقت کو مسخ کر دیا گیا ہے۔

علامہ ندوی نے جو تاویل ان آیات کی فرمائی ہے اس کو مطالعہ کرنے کے بعد اربابِ نظر خود انصاف فرما سکتے ہیں کہ قرآنِ عزیز کے زیرِ بحث واقعہ کا مضمون اُن کی تاویل کے ساتھ کس درجہ مطابقت رکھتا ہے؟ فرماتے ہیں:۔

"ہماری رائے یہ ہے کہ ملکہ سبا نے تحفہ کے طور پر حضرت سلیمانؑ کے لیے اپنے ملک کی صنعت کاری کی ایک چیز طیار کرائی تھی اور چونکہ یہ تحفہ تھا ضرور ہے کہ ملکہ اپنے ساتھ شام لائی ہوگی، تحفہ کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ قرآن نے سبا کی پہلی سفارت میں تحفہ کا ذکر کیا اور تبیم میں بھی سبا کے تحائف کا ذکر ہے۔

قرآن میں مذکور ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے ایک درباری نے جو کتاب سے واقف تھا عرض کی کہ میں نظر پلٹنے سے پہلے ملکہ کا تخت اٹھا لاتا ہوں۔ نگاہ پلٹنے سے پہلے تخت اٹھالانے سے مقصود جیسا کہ ہماری زبان میں سرعت اور جلدی سمجھا جا سکتا ہے اسی طرح عربی زبان میں قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ سے یہی سمجھنا چاہیے۔ بعض تابعین اور مفسرین کبار نے بھی اس لفظ کے یہی معنی لیے ہیں، اور یہ کہنا تو درحقیقت محاوراتِ زبان سے نادانی کا ثبوت ہے کہ

واقعاً اس سے نگاہ پلٹنے کے ساتھ کام کا ہو جانا مقصود ہے[1]"

کاش کہ سید صاحب اُن تابعین اور مفسرینِ کبار کا نام بھی ظاہر فرما دیتے جنھوں نے سید صاحب کی تاویل کے مطابق معنی بیان کیے ہیں ورنہ اس جملہ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ" سے سُرعت اور جلدی کے معنی لینے کا تو کسی کو بھی انکار نہیں فرق یہ ہے کہ سید صاحب اس سرعت کو محاورہ کی حدود میں محدود رکھنا چاہتے ہیں اور قرآن اس مقام پر اُن حدود سے بالاتر ہو کر حضرت سلیمانؑ کا "نشان" ظاہر کرنا چاہتا ہے اسی لیے اس کو قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ کہنے والے کے مقابلہ میں ترجیح دی گئی ورنہ تقابل فضول ہو جاتا ہے کیونکہ جب حضرت سلیمانؑ کا مقصد یہ ٹھہرا کہ وہ توشہ خانے سے دربار میں ملکہ کی آمد سے قبل آجائے تو قَوِیٌّ اَمِیْنٌ کی پیش کش اس کے لیے کافی تھی اور نہ یہ کوئی ایسا اہم معاملہ رہ جاتا جس پر مذاکرہ ہوتا اور قرآن اس کی تفصیل کو اتنی اہمیت دیتا۔

نجار نے اس موقع پر بہت عمدہ بات تحریر فرمائی ہے:-

"حضرت سلیمانؑ نے ملکۂ سبا کا تخت اس شخص کے ذریعہ جس کے پاس کتاب کا علم تھا جس خاص طریقہ سے منگایا وہ ایسا طریقہ ہے جس کو موجودہ علوم ابھی تک نہیں پا سکے اور تخت کا یہ واقعہ صریح نص سے ثابت ہے جو یقینی الثبوت والدلالت ہے اور ان مفسرین کی تاویل انتہائی رکیک اور قابلِ افسوس ہے جنھوں نے "عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ" کے یہ معنی بیان کیے کہ اس کے پاس مملکتِ سلیمان کا خریطہ رہتا تھا لہٰذا اُسے معلوم تھا کہ یہ "تخت" سلیمانؑ کے کس توشہ خانہ میں رکھا ہے، اور خارقِ عادات معجزات کا جب ثبوت موجود ہو تو انکار اور بے دلیل انکار سے کیا فائدہ اس لیے کہ قوانینِ قدرت کا جو خالق ہے اس کو یہ بھی اختیار ہے وہ قدرت کے کسی عمل کو توڑ پھوڑ دے اور یہ کیوں نہ تسلیم کیا جائے کہ اس قسم کے معجزانہ اعمال کے لیے عام قوانینِ قدرت کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے خاص قوانینِ قدرت اور نوامیسِ فطرت کار فرما ہیں جن کو ابھی تک "علم" معلوم نہیں کر سکا اور جن پر صرف وہی پاک نفوس مطلع ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں پر وہ نوامیس کے ذریعہ معجزات کا ظہور کراتا ہے" وَاللّٰهُ تَعَالٰى

2

يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ[1]

عِندَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ کی شخصیت	مفسرین کہتے ہیں کہ جس شخص کے متعلق قرآن عزیز نے یہ کہا ہے "اُس کے پاس کتاب کا علم تھا" اُس کا نام آصف[2]

بن برخیا تھا، اور یہ حضرت سلیمانؑ کا معتمد خاص اور کاتب (وزیر) تھا حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے یہی منقول ہے اور بعض مفسرین نے کچھ اور نام بھی ذکر کیے ہیں[3] مگر زیادہ پہلے قول ہی کو راجح تسلیم کرتے ہیں۔

مفسرین نے اس مسئلہ پر بھی بحث کی ہے کہ یہ شخص انسانوں میں سے تھا یا قوم جن سے۔ ضحاکؒ، قتادہؒ اور مجاہدؒ کہتے ہیں کہ وہ انسانوں میں ہی سے تھا[4]

اس شخص کے متعلق تیسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیت کے جملہ عِندَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ میں علم کتاب سے کیا مراد ہے؟ وہب بن منبہؒ، مجاہدؒ، محمد بن اسحٰقؒ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسم اعظم سے واقف تھا، اور بعض جدید اہل قلم کہتے ہیں کہ اس سے حضرت سلیمانؑ کا درباری رجسٹر اور سرکاری دفتر مراد ہے یعنی اُس کو ہدایا کے رجسٹر کے امین ہونے کی وجہ سے یہ علم تھا کہ وہ "تخت" توشہ خانہ کے کس حصہ میں محفوظ ہے اور سید سلیمان فرماتے ہیں:۔

> عربی محاورہ میں کتاب اکثر "خط" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے خود اسی جگہ قرآن میں دو جگہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے اس لیے آیت کا مقصود یہ ہے کہ درباریوں میں سے ملکۂ سبا کے مضمون خط کا جس کو علم تھا وہ بطور تحفہ اپنے ساتھ ایک تخت لائی ہے۔ اس لئے کہا "میں ابھی لاتا ہوں"[5]

ہمارے نزدیک آخر کے دونوں قول غلط اور قرآن کی تصریحات کے خلاف ہیں اس لیے کہ زیر بحث تخت کا یہ معاملہ ملکۂ سبا کے دربار سلیمانؑ میں پہنچنے سے قبل کا ہے تعجب ہے کہ

---

[1] قصص الانبیاء ص ۲۹۶ ۔ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۳۶۴ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۳
[3][4] ایضاً [5] ارض القرآن جلد ۱ ص ۲۷۰ ۔

فطرت پرستوں کی مرعوبیت میں اس صاف اور واضح بات کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا اسی طرح رجسٹر اور دفتر سے بھی اس معاملہ کا کوئی تعلق نہیں ہے ابھی تو ملکہ اور اس کے رفقاء یا اس کے ہدایا دربارِ سلیمانی میں پہنچے ہی نہیں اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت سلیمانؑ کو ملکہ کے آنے کی خبر وحی کے ذریعہ نہیں بلکہ ہُدہُد یا ملکۂ سبا کے کسی قاصد کے ذریعہ ہوئی جو ملکہ کا خط لے کر ملکہ کے آگے روانہ ہوا تب بھی کسی جگہ نہ قرآن میں اور نہ اسرائیلیات میں یہ مذکور ہے کہ ملکہ سے پہلے اُس کے تحفہ کا تخت حضرت سلیمانؑ کے دربار میں پہنچ چکا تھا، اس لیے اٹکل کے یہ تیر نشانہ پر ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ اور صحیح اور راجح قول یہ ہے کہ یہ شخص آصف ہو یا کسی اور نام سے موسوم، درحقیقت حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا صحابی اور اُن کا بہت مقرب تھا اور جس طرح صدیقِ اکبر (رضی اللہ عنہ) کی شخصیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں نمایاں تھی اسی طرح یہ حضرت سلیمانؑ کا رفیق تھا اور اُن کے شرفِ صحبت سے اس کو تورات اور زبور اور اسماء و صفاتِ الٰہی سے متعلق اسرار و حقائق کا زبردست علم حاصل تھا اسلیے جب جنوں میں سے ایک "عفریت" نے تختِ سبا کو حاضر کرنے کا دعویٰ کیا تو اگرچہ مقصد کے حاصل ہونے کے لیے یہ مدت بھی کافی تھی مگر حضرت سلیمانؑ کا گوشۂ خاطر یہ رہا کہ یہ عمل عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ کے ذریعہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ خدا کے کسی خاص بندہ کے ہاتھ پر ہونا چاہیے تاکہ اُن کی پیغمبرانہ توجہ سے وہ "معجزہ" اور "نشان" بن کر ملکۂ سبا کے سامنے پیش ہو۔ آصف نے حضرت سلیمانؑ کے اس گوشۂ التفات کو سمجھ کر فوراً خود کو پیش کیا اور "عفریت" کی بیان کردہ مدت سے بھی بہت قلیل مدت میں حاضر کر دینے کا وعدہ کر لیا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی مبارک توجہ اس اعجاز کو پورا کر دکھائے گی۔ اور چونکہ معجزہ دراصل خدائے تعالیٰ کا اپنا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر کیا جاتا ہے (جیسا کہ قصص القرآن جلد اول میں گزر چکا) تو حضرت سلیمانؑ نے اپنی صداقتِ نبوت اور عظمتِ رسالت کے اس نشان کو دیکھ کر ان الفاظ میں خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کیا "هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ" یعنی جو کچھ

بھی ہو اس میں آصف کی یا میری سعی اور قوت کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ محض خدا کا فضل ہے جس نے یہ کام کر دکھایا "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ"

ملکۂ سبا کا قبولِ اسلام

حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کا واقعہ اس حد پر جا کر ختم ہو جاتا ہے کہ ملکہ نے حضرت سلیمانؑ کے پیغمبرانہ جاہ و جلال کو دیکھ کر اسلام قبول کر لیا "وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" اور اس مکمل واقعہ میں حضرت سلیمانؑ کی یہی ایک غرض تھی جس کا اظہار انھوں نے اپنے پہلے مکتوب ہی میں کر دیا تھا، مگر ملکہ اس وقت اس غرض کو نہ پا سکی تھی۔

عام مفسرین کی نگاہوں میں یہ سوال حل طلب رہا ہے کہ اس مقصد کے لیے حضرت سلیمانؑ کا ملکہ کو اپنے دربار میں بلانا تو بیشک اپنی جگہ رکھتا ہے لیکن تخت کو اس طرح منگوانا اور آبگینہ کے محل کے سامنے ملکہ کے ساتھ پیش آمدہ معاملہ ہونا اس مقصد سے کیا تعلق رکھتا ہے؟ اور پھر خود ہی یہ جواب دیا ہے کہ اس سے ملکۂ سبا پر یہ اثر ڈالنا مقصود تھا کہ وہ یقین کر لے کہ حضرت سلیمانؑ کے بلانے کی غرض دنیوی لالچ اور دولت و حکومت میں اضافہ نہیں ہے بلکہ اس سے بلند و بالا دوسرا مقصد ہے نیز وہ یہ سمجھ جائے کہ یہ دونوں واقعات شاہانہ اقتدار اور قاہرانہ قوت و طاقت سے بالاتر اور حضرت سلیمانؑ کی پیغمبرانہ صداقت کا نشان ہیں اسی لیے مفسرین نے ملکۂ سبا کے قول "كُنَّا مُسْلِمِيْنَ" میں اسلام بمعنی ایمان مراد لیا ہے۔ یعنی ملکہ نے حقیقی معنی میں اسلام قبول کر لیا۔

لیکن مفسرین کی حکمت و مصلحت کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے ان کی اس دلیل پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے کہ "كُنَّا مُسْلِمِيْنَ" کہہ کر ملکہ نے اسلام قبول کر لیا تھا تو اس کے بعد کی آیات کے ان دو جملوں کے کیا معنی ہوں گے "وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ" اور اس کو ایمان لانے سے ماسوا اللہ (آفتاب) کی عبادت نے باز رکھا۔ کیونکہ بے شبہ وہ قوم کافرین میں سے تھی "قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ

نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" یعنی آبگینہ کے محل کے واقعہ سے متاثر ہو کر ملکہ نے یہ کہا کہ اب تک میں نے شرک کر کے نفس پر ظلم کیا اور اب میں رب العلمین پر ایمان لاتی ہوں۔"

ان دونوں جملوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کُنَّا مُسْلِمِیْنَ کہتے وقت وہ مسلمان نہیں ہوئی بلکہ اُس کے بعد دوسرے واقعہ سے متاثر ہو کر پھر دین اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا حالانکہ دونوں باتوں کا مظاہرہ حضرت سلیمانؑ کے دربار ہی میں ہو رہا تھا چنانچہ مجاہدؒ، سعیدؒ اور ابن جریرؒ نے اس اعتراض کو تسلیم کرتے ہوئے زیر بحث آیات کی یہ تفسیر کی ہے کہ جملہ وَاُوْتِیْنَا الْعِلْمَ" سے مِنْ قَوْمٍ کٰفِرِیْنَ تک سب حضرت سلیمانؑ کا مقولہ ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ ہم کو ملکۂ سبا کی آمد سے قبل ہی یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ملکہ کافر دل میں سے ہے اور ہم بہر حال مسلمان ہیں اور ملکہ کو آفتاب پرستی نے ماسوی اللہ کی پرستش کا عادی بنا کر خدائے واحد کی عبادت سے روگرداں کر دیا ہے۔

اور ابن کثیرؒ نے مجاہد کی اس تفسیر کو نقل کر کے کہا ہے کہ یہی قول راجح ہے اس لیے کہ ملکۂ سبا ابھی تک مسلمان نہیں ہوئی تھیں بلکہ بصراحتِ قرآن وہ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ" کے واقعہ کے بعد ایمان لائی ہے لہٰذا کُنَّا مُسْلِمِیْنَ" اس کا مقولہ نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس تفسیر میں یہ سُقم ہے کہ ضمائر کے مرجع میں بے ترتیبی اور خلل واقع ہوتا ہے یعنی جبکہ جملہ قَالَتْ کَاَنَّہٗ ھُوَ" میں قَالَتْ کی قائل ملکۂ سبا ہے اور اس کے بعد حضرت سلیمانؑ کا کوئی ذکر نہیں ہے تو بعد کے جملہ" وَاُوْتِیْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِھَا وَکُنَّا مُسْلِمِیْنَ" کو جو پہلے جملہ کے متصل ہے کس طرح حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا مقولہ کہا جا سکتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان دونوں جملوں کے درمیان قَالَ سُلَیْمٰنُ" یا فقط" قَالَ" مقدر ہے تو یہ دعویٰ بے دلیل ہے اور جبکہ مرجع کے اختلال کے بغیر ہی آیات کی صحیح تفسیر ہو سکتی ہو تو بے وجہ مقدر ماننے کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے۔ چنانچہ آیاتِ زیر بحث کی ایسی تفسیر جس میں یہ دونوں سُقم بھی باقی

نہ رہیں اور ہر دو واقعات کی حکمت و مصلحت بھی روشن اور نمایاں ہو جائے شیخ الہندؒ سے بواسطہ علامہ سید حسین احمد مدنی منقول ہے، فرماتے ہیں:۔

حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے ہُدہُد کی معرفت جو پیغام بھیجا تھا اس میں یہ لکھ کر وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ ملکۂ سبا کو صریح الفاظ میں دعوتِ اسلام دی تھی مگر ملکۂ سبا چونکہ حقیقتِ توحید اور دینِ اسلام سے نا آشنا تھی اس لیے وہ حضرت سلیمانؑ کے مطلب کو نہ سمجھ سکی اور مکتوبِ گرامی میں أَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ کے بعد اس نے جب وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ کو پڑھا تو وہ شاہوں کی خط و کتابت کے پیشِ نظر یہ سمجھی کہ سلیمان (علیہ السلام) اپنے قاہرانہ اقتدار کے زور میں مجھ کو اور میری حکومت کو اپنا تابعِ فرمان اور زیرِ نگین بنانا چاہتے ہیں اسی لیے اُس نے اپنے درباریوں سے مشورہ کے بعد دریافتِ حال کے لیے وہ طریقہ اختیار کیا جس کا ذکر قرآن کر رہا ہے اور جب اس کو یہ یقین ہو گیا کہ درحقیقت سلیمان (علیہ السلام) کی شاہانہ عظمت اور قاہرانہ سطوت شاہنشاہوں سے بھی زیادہ بلند ہے تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ سلیمان (علیہ السلام) سے جنگ مناسب نہیں اور ان کی اطاعت و انقیاد ہی میں نجات ہے اس لیے ملکِ شام کی جانب روانہ ہو گئی حضرت سلیمانؑ کو جب یہ اطلاع ملی کہ ملکۂ سبا ان کی خدمت میں حاضری کے لیے روانہ ہو چکی ہے تو سوچا کہ ایسا کوئی لطیف طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس سے ملکۂ سبا خود یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائے کہ آفتاب پرستی یقیناً گمراہی ہے اور سیدھی اور سچی راہ یہ ہے کہ صرف خدائے واحد کی پرستش کی جائے۔

قومِ سبا کا مذہب آفتاب پرستی تھا اور وہ اس فلسفہ کی قائل تھی کہ کائنات میں خیر و شر کی قدرت و طاقت کواکب کے ہاتھ میں ہے اور چونکہ آفتاب اُن میں سب سے بڑا اور کائنات پر اثر انداز ہے اس لیے وہی اس قابل ہے کہ اُس کی پرستش کی جائے اسلیے حضرت سلیمانؑ ملکہ کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ کائنات کی ان چھوٹی اور بڑی تمام اشیاء پر صرف ایک "حقیقت" کا تسلط ہے اور وہ خدائے کائنات ہے اور آفتاب و ماہتاب، کواکب و

سیارگان یہ سب اس کی مخلوق اور اس کی قدرت کے مظاہر ہیں لہٰذا انسان کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ وہ حقیقت کو چھوڑ کر مظاہر کی پرستش کرنے لگتا ہے کیونکہ وہ اس کے سامنے مشاہد اور محسوس ہیں حالانکہ مظاہر صرف "حقیقت" کے وجود اور اس کی ہستی کیلیے دلیل ہیں نہ کہ بجائے خود حقیقت" اسی لیے تغیر و تبدل، وجود و فنا، طلوع و غروب، ناپائداری و بے ثباتی مظاہر کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئے ہے اور حقیقت (ذات واحد) ان تمام تغیرات سے پاک اور بالاتر ہے یہی سوچ کر انھوں نے ملکہ کے شاہی تخت کو یمن سے اٹھا منگایا تاکہ اس کے نزدیک سے ایک مثال دے کر اس کو بتائیں اور اس پر یہ واضح اور ثابت کریں کہ دیکھ میرے اس دعوے کی دلیل خود تیرا یہ تخت شاہی ہے، غور کر کہ یہ تیری حکومت و سطوت کا مظہر ہے اور اسی لیے "تخت شاہی" کہلاتا ہے، مگر جوں ہی تو اپنے ملک سے غائب ہوئی یہ "مظہر" بے حقیقت ہو کر رہ گیا اور کل جو تیری سطوت کا مظہر تھا آج وہ میرے دربار کی زینت بنا ہوا ہے اور یہاں بھی تبدیل ہیئت و صورت کے ساتھ تجھ کو اپنی بے ثباتی اور ناپائداری کا درس دے رہا ہے۔

حضرت سلیمانؑ کے اس ارادہ کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ جب انھوں نے ملکہ کا تخت اپنے دربار میں منگالیا تو اس میں تغیر کا حکم دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا: نَنظُرْ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ "ہم یہ اس لیے کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھیں کہ وہ اس واقعہ سے متاثر ہو کر ہدایت قبول کرتی ہے یا گمراہ ہی رہتی ہے، اس اعتبار سے یہاں "ہدایت" سے خاص اسلام کی ہدایت مراد ہے نہ کہ محض "راہیاب" ہونا جو کہ ہر معاملہ کی حقیقت پر آگاہ ہو جانے کے لیے عام ہے۔

اس اسلوب بیان سے حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے ملکہ سبا پر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اُن کا جلال و جبروت صرف شاہانہ اقتدار اور حاکمانہ قوت و سطوت کی وجہ سے ہی نہیں ہے بلکہ اس کی پشت پر خدائے تعالیٰ کی وہ طاقت کارفرما ہے جو شاہنشاہوں کی قاہرانہ

جبروت کی دسترس سے بھی بالاتر پیغمبرانہ جاہ وجلال کے ساتھ نشانِ الٰہی کے نام سے وابستہ رہتی ہے اور ساتھ ہی تبلیغ ودعوت کے مسطورہ بالا طریقۂ خصوصی کے ذریعہ یہ بھی واضح کردیا کہ سبا کی آفتاب پرستی حقیقت کو چھوڑ کر مظہر کی باقی سے مُنہ موڑ کر فانی کی، قدیم سے روگرداں ہوکر حادث کی، صمد سے رُخ بدل کر محتاج کی اور خالق سے نگاہ پھیر کر مخلوق کی پرستش ہے اور یہ سخت گمراہی اور ضلالت کی راہ ہے اور صراطِ مستقیم یہ ہے کہ صرف "حقیقت" (خدائے واحد) ہی کو نفع وضرر اور خیر وشر کا مالک سمجھا جائے اور فقط اس کی ہی عبادت کی جائے۔

لیکن قومِ سبا چونکہ صدیوں سے غیر اللہ کی پرستش میں اعتقاد رکھتی تھی اس لیے ملکہ اس لطیف دلیل کے سمجھنے سے قاصر رہی اور اس کی عقل وخرد حقیقت کی معرفت تک نہ پہنچ سکی اور تخت کے اس پورے واقعہ سے اس نے یہی نتیجہ نکالا کہ سلیمان (علیہ السلام) اس محیر العقول طریقہ سے اپنی بے مثال شان وشوکت کا مظاہرہ کرکے مجھ کو اپنی اطاعت وفرماں برداری کے لیے متاثر کررہے ہیں، چنانچہ ملکہ نے یہی سوچ کر یہ جواب دیا "آپ اگر یہ زبردست مظاہرہ نہ بھی کرتے تب بھی ہم کو پہلے سے آپ کے جلال وجبروت کا حال معلوم ہوچکا ہے اور ہم آپ کے تابع اور حکم بردار ہوچکے ہیں اور ملکہ کے اس جواب کو نقل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے درمیان میں اس کی صدیوں کی گمراہی اور معاملہ کی اصل حقیقت کے متعلق قصورِ فہم کی وجہ بھی یہ بیان فرمادی کہ آفتاب پرستی کی مداومت نے اب بھی اُسکو قبولِ اسلام سے باز رکھا اور وہ کافر رہی۔

یہی دو باتیں ہیں جو آیاتِ ذیل میں بغیر کسی تاویل کے صاف اور واضح طور پر بیان کی گئی ہیں " قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ ۚ وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ ○ وَصَدَّهَا مَا كَانَت تَّعْبُدُ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ إِنَّهَا كَانَتْ مِن قَوْمٍ كَافِرِينَ ○

اس کے بعد حضرت سلیمانؑ نے دوسرا مظاہرہ کیا جو اس بارہ میں پہلے سے زیادہ واضح

اور روشن تھا اور یہ آبگینہ کے محل کا واقعہ تھا۔ ملکہ نے جب یہ سمجھ کر کہ صاف شفاف پانی بہہ رہا ہے اپنے کپڑے سمیٹے اور پانی میں اُترنے کا ارادہ کیا تو اس کو بتایا گیا کہ جس کو تو پانی سمجھ رہی ہے وہ آبگینہ کا عکس ہے پانی نہیں ہے۔ ملکہ پر جب اس حقیقت کا انکشاف ہوا تو اب اس کا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ حضرت سلیمانؑ کا ان مظاہروں سے کیا مقصد ہے؟ اور اب اس کی عقل و دانش کی اس حقیقت تک رسائی ہوئی کہ جس طرح میں نے یہ غلطی کھائی کہ ایک شے کے پرتو عکس اور مظہر کو حقیقت جان کر اس کے ساتھ حقیقت کا سا معاملہ کرنا چاہا تو اسی طرح بے شبہ میں اور میری قوم اس گمراہی میں مبتلا ہیں کہ آفتاب کی پرستش کر رہے ہیں حالانکہ وہ حقیقت (خدائے واحد) کی قدرت کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے اور اس سے بڑھ کر اور کون سا ظلم ہو سکتا ہے کہ حقیقت کو چھوڑ کر مظہر کی پرستش کی جائے اور اب وہ یہ بھی سمجھی کہ حضرت سلیمانؑ کے مکتوب گرامی میں جملہ وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ کا کیا مطلب تھا چنانچہ ملکہ کے قلب میں یہ خیال آنا تھا کہ وہ فوراً پکار اٹھی رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

شیخ الہند (نور اللہ مرقدہٗ) کی اس تفسیر سے آیات کے انسجام اور ان کے مرجعوں کی ترتیب میں بھی کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اور حذف و تقدیر کلام کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی اور ہر دو واقعات سے متعلق حکمت و مصلحت اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی پیغمبرانہ دعوت و ارشاد اور جاہ و جلال کی عظمت کا اظہار بھی حسن و خوبی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

ملکۂ سبا کے پہلے مقولہ وَكُنَّا مُسْلِمِينَ میں اسلام "بمعنی انقیاد و اطاعت کی نظیر سورۂ حجرات کی وہ آیت ہے جو اعراب مدینہ کے دعویٰ ایمان پر نازل ہوئی قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا "اعرابی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ کہہ دیجئے تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم تابع دار اور منقاد ہو گئے ہیں اور اس جملہ" كُنَّا مُسْلِمِينَ "میں اسلام" بمعنی انقیاد و اطاعت اور جملہ أَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

میں "اسلام" بمعنی دینِ اسلام کا فرق اور دونوں معانی کا تفاوت خود قرآنِ عزیز کی اُن آیات سے ہی ظاہر ہے کہ پہلے جملہ میں ملکۂ سبا نے کوئی ایسی تفصیل نہیں بیان کی جس میں شرک سے بیزاری اور توحید کے قبول کا ذکر ہو اور اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُس کے اس جملہ کے بعد بھی یہی ظاہر فرمایا کہ آفتاب پرستی اس کو اسلام سے باز رکھے ہوئے ہے اور وہ کافروں میں سے ہے لیکن آخری جملہ میں ملکہ نے صراحت کے ساتھ یہ اقرار کیا کہ اب اس کا اسلام لغوی نہیں بلکہ دینِ اسلام کا اصطلاحی اسلام ہے اور جو سلیمان (علیہ السلام) کے لیے نہیں بلکہ سلیمان (علیہ السلام) کی رفاقت میں "رب العلمین" کے لیے ہے اور غالباً اسی تفاوت کے پیشِ نظر پہلے جملہ میں ملکہ نے اپنے ساتھ تمام ارکانِ سلطنت اور رعایا کو شامل کر کے جمع کی تعبیر اختیار کی کیونکہ حضرت سلیمانؑ کے شاہانہ اقتدار کی اطاعت کا مسئلہ ملکہ اور ملکہ کے ارکینِ دولت کے درمیان مشورہ کے بعد باتفاق طے شدہ تھا اور دینِ اسلام کے قبول کا مسئلہ اس کے اپنے ذاتی یقین پر مبنی تھا، اس لیے اس کے اظہار میں اُس نے انفرادیت اختیار کی اگرچہ اس زمانہ کے عام دستور کے مطابق پادشاہ کا مذہب خود بخود رعایا کا مقبول مذہب ہو جاتا تھا اور غالباً اس کی قوم نے بھی دینِ اسلام قبول کر لیا ہوگا، غرض یہ تفسیر بہت لطیف اور ہر حیثیت سے راجح اور قابلِ قبول ہے۔

توراۃ میں ملکۂ سبا کا ذکر توراۃ میں بھی ملکۂ سبا اور حضرت سلیمانؑ کی ملاقات کا ذکر موجود ہے، چنانچہ سلاطین[1] میں ہے:

> "اور جب کہ خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سبا کی ملکہ تک پہنچی تو وہ مشکل سوالوں سے اُسے آزمانے آئی اور وہ بڑے جلو کے ساتھ اور اونٹوں کے ساتھ جن پر خوشبوئیں لدی ہوئی تھیں اور بہت سونا اور انمول جواہرات ساتھ لے کے یروشلم میں آئی اور اس نے سلیمان کے پاس آ کے جو کچھ اس کے دل میں تھا سب کی بابت اس سے گفتگو کی سلیمان نے اس کے سب سوالوں کا جواب دیا۔ پادشاہ سے کوئی بات پوشیدہ نہ تھی جو اس کے کسی سوال کا جواب نہ دیتا اور جبکہ سبا کی ملکہ نے سلیمان کی ساری دانشمندی کا حال اور اس گھر کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دسترخوان

[1] باب ۱۰۔ آیات ۱۔۱۰

کی نعمتوں کو اور اس کے ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی حاضر باشی اور ان کی پوشاک اور اس کے ساقیوں اور اس سیڑھی کو کہ جس سے وہ خداوند کے مسکن کو جاتا تھا دیکھا تو اس کے ہوش نہ رہے اور اس نے بادشاہ سے کہا یہ تحقیقی خبر تھی جو میں نے تیری کراماتوں اور تیری دانش کی بابت اپنے ملک میں سُنی تھی ..... وہ خبر جو میں نے سنی تھی سو آدھی بھی نہ تھی کیونکہ تیری دانش اور اقبال مندی اس شہرت سے جو میں نے سنی تھی کہیں زیادہ ہے۔ نیک بخت ہیں تیرے لوگ اور نیک بخت ہیں تیرے خواص جو تیرے حضور کھڑے رہتے ہیں۔ اور تیری حکمت سنتے ہیں خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے راضی ہے اور تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا، اس لیے کہ خداوند نے اسرائیلیوں کو سدا پیار کیا۔[1]

تورات کے بیان میں اگرچہ ملکہ کے مسلمان ہونے کا ذکر نہیں ہے لیکن آخر کے جملے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اسرائیلی خدا پر ایمان لے آئی تھی تب ہی تو اس کا ذکر اس عقیدتمندی سے کرتی ہے۔

مگر قرآن اور تورات کے بیان میں یہ فرق نمایاں ہے کہ قرآنِ عزیز کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے بایں جاہ و جلال ملکۂ سبا کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ ایک اولوالعزم پیغمبر کی طرح کا تھا اور قرآن کے بیان سے بات بات میں تبلیغ و دعوت اور پیغمبرانہ شان نظر آتی ہے لیکن تورات کے بیان میں حضرت سلیمانؑ کی دانشمندی اور شاہانہ اقتدار کے ماسوا اور کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ بنی اسرائیل کے اس غلط عقیدہ کا نتیجہ ہے جو انھوں نے حضرت سلیمانؑ کے متعلق اختراع کر لیا تھا کہ وہ پیغمبر نہیں ہیں صرف بادشاہ ہیں۔

اور قرآنِ عزیز جبکہ اصلاحِ عقائد و اعمال کے ساتھ ساتھ اُمم سابقہ اور اُن کے انبیاء و رُسل سے متعلق واقعات میں بنی اسرائیل کی تحریف و تبدیل اور اُن کے غلط اور فضول اختراعات کی اصلاح کا بھی مدعی ہے اس لیے اُس نے اس مقام پر بھی واقعہ سے متعلق صحیح حقائق کو بیان اور اُن غلطیوں کو واضح کر دیا جو کتبِ سابقہ میں پائی جاتی ہیں۔

[1] باب ۲۰ - آیات ۱۰-۱

ملکۂ سبا کا حضرت سلیمانؑ کے ساتھ نکاح

کتبِ تفاسیر میں منقول ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت سلیمانؑ نے ملکۂ سبا (بلقیس) سے نکاح کر لیا اور اس کو اپنے ملک میں جانے کی اجازت دی اور حضرت سلیمانؑ گاہے گاہے اس سے ملاقات فرماتے رہتے تھے[1] لیکن قرآنِ عزیز اور احادیثِ صحیحہ میں نفی یا اثبات دونوں حیثیتوں میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اسرائیلیات

بلقیس ملکۂ سبا اور حضرت سلیمانؑ کے اس واقعہ سے متعلق بیان کردہ تفصیلات کے علاوہ اور بھی عجیب و غریب اور دُور از کار باتیں کتبِ سیر میں مذکور ہیں جو اوّل سے آخر تک اسرائیلیات اور یہودی روایات سے ماخوذ ہیں چنانچہ ان کے متعلق ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں جو کچھ فرمایا ہے اُس کا حاصل یہ ہے۔

"اس سلسلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک عجیب روایت منقول ہے جس کو ابن السائب کی سند سے ابوبکر بن شیبہ نے روایت کیا ہے اور ابن ابی شیبہ نے اس روایت کے متعلق کہا ہے کہ یہ کیسا دل خوش کن واقعہ ہے مگر میں کہتا ہوں کہ ابن ابی شیبہ کو یہ نہیں کہنا چاہیئے بلکہ یہ روایت قابلِ انکار ہے اور بے شبہ اس کے بیان کرنے میں عطا ابن سائب کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ وہ اس روایت کو ابن عباس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ اس قسم کا طرزِ روایت دراصل اہلِ کتاب کے صحیفوں سے ماخوذ ہے اور واقعہ کی یہ تفصیلات اسی طرح کی ہیں جیسا کہ کعب احبار اور وہب بن منبہ بنی اسرائیل کے قصّے اُن کی کتابوں سے نقل کر کے اس اُمت کو سنایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ درگزر کا معاملہ کرے، کہ وہ ان قصوں میں عجیب و غریب اور قابلِ انکار باتیں اور واقعی و غیر واقعی اور تحریف شدہ و مسخ شدہ ہر قسم کے واقعات نقل کر دیا کرتے تھے حالانکہ اللہ سبحانہٗ نے ہم کو ان فضول اور لغو باتوں سے قطعی غنی اور بے پروا کر دیا ہے اور ہم کو ایسا علم (قرآن) عطا کیا ہے جو واقعات کی صحت، نیک مقصد کی افادیت، مطالب کی وضاحت اور کلام کی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بہت برتر اور بلند ہے۔"[2]

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۴ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۳۶۵، ۳۶۶

قصص القرآن میں واقعات کی تحقیق کے سلسلہ میں بار بار یہ کہا جاتا رہا ہے کہ فلاں روایت صحیح ہے اور فلاں اسرائیلی روایت ہے تو اسرائیلیات سے کیا مراد ہے یہ بات قابلِ وضاحت ہے۔

بنی اسرائیل کی روایات کا مدار بیشتر تورات پر ہے عبرانی زبان میں تورات کے معنی "شریعت" کے ہیں۔ اس لیے اس کا عمومی اطلاق سفرِ تکوین (پیدائش) سفرِ خروج سفرِ احبار سفرِ عدد، سفرِ استثنار پر ہوتا ہے، توراۃ کے علاوہ دوسرا سلسلہ نبییم ہے یہ عبرانی قاعدۂ لغت کے اعتبار سے "نبی" کی جمع ہے۔ عبرانی میں "ی" اور "م" اضافہ کرکے جمع بناتے ہیں۔ یہ بنی اسرائیل کے انبیاء کے مواعظ، مراثی اور بنی اسرائیل کے کلام اور مختصر تاریخ کا ذخیرہ ہے جن میں سفرِ یوشع۔ سفرِ القضاۃ، سفرِ سموئیل، سفرِ ایام، سفرِ ملوک خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ آج کل نبییم بھی توراۃ کا ہی حصہ شمار ہوتا ہے۔ تیسرا حصہ ترگوم ہے۔ عربی زبان میں "ترجمہ" کو کہتے ہیں۔ یہودی علماء نے توراۃ اور نبییم کی آرامی زبان میں تفسیر کی ہے، جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے یہ تفسیر انبیاء علیہم السلام سے سُنی ہے، چوتھا حصہ مدراش ہے اس کی حیثیت یہود کے یہاں وہ ہے جو اسلام میں حدیث کا درجہ ہے، پانچواں حصہ تالمود ہے یہ بنی اسرائیل کا فقہ ہے اور ان سب کے علاوہ بعض وہ قصص و حکایات ہیں جن کو یہود سینہ بہ سینہ اپنی یادداشت سے مذہبی نقول کی طرح نقل اور بیان کرتے چلے آتے ہیں۔

یہود کے سلسلۂ روایات کی یہ تمام اقسام وہ ہیں جو اسرائیلیات کہلاتی ہیں اور ان میں سے بعض روایات اُن علماءِ یہود کے ذریعہ جو مشرف باسلام ہو گئے تھے مسلمانوں میں بھی نقل ہو کر مشہور ہوگئیں اور اس لیے ہمیشہ علماءِ محققین کا مقدس گروہ ان پر تنبیہ کرتا اور ان سے اسلامی روایات کو پاک کرتا چلا آتا ہے اور صرف انہی روایات کے ذکر سے چشم پوشی کرتا ہے جو قرآنِ عزیز اور صحیح احادیث کے مضامین کی تائید کرتی ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کے مکتوب کا اعجاز | ماہرینِ ادبیات کہتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ نے ملکۂ سبا کو جو خط

دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں بھیجا وہ دنیا کے اُن خطوط میں جو آج تک تحریر کیے گئے ہیں یکتا اور بے مثال ہے اور یہ دعویٰ حسنِ عقیدت کی بناء پر نہیں ہے بلکہ دعوے کی بنیاد اس دلیل پر قائم ہے کہ اس قدر اہم اور نازک مسئلہ پر نہایت مختصر مگر مقصد کے لحاظ سے بہت واضح فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے نہایت رفیع، ادائے بیان اور طرزِ ادا کے پیشِ نظر بے حد لطیف و شیریں، پُرشوکت اور دلنشیں غرض مجموعۂ صفات سے متصف کوئی خط کسی بڑے انسان کا کتبِ تاریخ میں اس کے علاوہ ایسا موجود نہیں ہے جو اس کا مقابلہ کر سکے۔

مضمونِ خط میں خلل انداز نہ ہونے والے انتہائی اختصار کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی ربوبیت، خالقیت و مالکیتِ عام کا اظہار، پیغمبرانہ پیغامِ حق کا اعلان، حاکمانہ و قاہرانہ اقتدار کا مظاہرہ اور اپنا ذاتی تعارف، جیسے اہم امور کو جس خوبی سے ادا کیا گیا ہے اس پر یہ مثال صادق آتی ہے، "گویا دریا کوزہ میں بند ہے"۔

خط کی عبارت کو مطالعہ کیجیے اور پھر سطورۂ بالا خصوصیات و امتیازات کا اندازہ کیجیے اور بتائیے کہ مجموعۂ الفاظ و معنی کے لحاظ سے یہ خط "اعجاز" نہیں تو اور کیا ہے۔

إِنَّهُ مِن سُلَيْمَٰنَ وَإِنَّهُ	یہ خط ہے سلیمان کی جانب سے اور یہ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ	شروع ہے اللہ کے نام سے جو رحمٰن ہے اور بڑا مہربان۔
أَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ وَأْتُونِي	مجھ پر اپنی ڈھاک نہ بٹھاؤ اور نہ برتری کا مظاہرہ کرو اور
مُسْلِمِينَ ۝	خدا کی فرمانبردار بن کر میرے پاس حاضر ہو۔

حضرت سلیمانؑ اور بنی اسرائیل کا بہتان

گزشتہ صفحات میں تاریخی نقول سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنی الہامی کتابوں میں تحریف کر دی تھی اور اپنی اغراضِ دنیوی کی خاطر ان میں ہر قسم کا رد و بدل کر دیا تھا۔ چنانچہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان (علیہما السلام) کے معاملہ میں تو اس درجہ جسارت اختیار کی کہ ان کی نبوت و رسالت سے بھی انکار کر کے ان پر طرح طرح کے الزام اور بیہودہ بہتان لگائے۔ منجملہ دوسرے الزامات کے ایک الزام حضرت

سلیمانؑ پر یہ بھی لگایا کہ وہ جادو کے حامل اور اس ہی کے زور پر "کنگ سلیمان" تھے، اور جن وانس اور وحوش وطیور کو مسخر کیے ہوئے تھے۔

قرآن عزیز نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے بنی اسرائیل کے لگائے ہوئے اس بہتان کی مدلل تردید کی اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی پیغمبرانہ عظمت کو نمایاں اور روشن کیا۔ اس نے بتایا کہ سلیمان (علیہ السلام) کا دامن جادو کی نجاست سے پاک ہے اور اصل حقیقت یہ ہے کہ سلیمان (علیہ السلام) کے زمانہ میں بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے کے لیے شیاطین (انس وجن) نے سحر کو سکھایا اور اس کو مدوّن کیا اور بنی اسرائیل نے کتاب اللہ (تورات وزبور) کو پس پشت ڈال کر اس کو الہامی قانون سمجھا اور جادو سیکھنے سکھانے لگے اور جب بنی اسرائیل میں سے مخصوص اہل حق نے ان کو سمجھایا اور بتایا کہ یہ سخت گمراہی اور کفر ہے تم اس سے باز آجاؤ تو شیطانوں کے بہکانے پر انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ سلیمان (علیہ السلام) کا سکھایا ہوا علم ہے اور سلیمان (علیہ السلام) اسی کے ذریعہ سے اتنی بڑی حکومت کے مالک تھے اور یہ کہہ کر اپنی گمراہی پر قائم رہے مگر وہ اس قول میں جھوٹ بولتے اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) پر بہتان طرازی کرتے ہیں۔

سدی کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) ہی کی زندگی میں بنی اسرائیل میں یہ گمراہی شروع ہو گئی تھی اور اُن میں یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ "جن" علمِ غیب جانتے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے شیاطین کے ان تمام نوشتوں کو حاصل کر کے اپنے تخت کے نیچے دفن کر دیا تاکہ جن وانس کسی کو وہاں تک پہنچنے کی جرأت نہ ہو سکے، اور ساتھ ہی یہ فرمان جاری کر دیا کہ جو شخص سحر کریگا یا جنوں کے متعلق علمِ غیب کا عقیدہ رکھے گا تو اس کو قتل کی سزا دی جائے گی۔ لیکن جب سلیمان (علیہ السلام) کا انتقال ہو گیا تو شیاطین نے اس مدفون ذخیرہ کو نکال لیا اور بنی اسرائیل میں یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ جادو کا یہ علم حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا علم ہے اور وہ اسی قوت سے جن وانس، وحوش وطیور اور ہوا پر

حکومت کرتے تھے اور اس طرح جادو کو پھر بنی اسرائیل میں رائج کر دیا۔[1]

قرآنِ عزیز نے اس تاریخی حقیقت کو اس ضمن میں بیان کیا ہے کہ بنی اسرائیل باوجود اس یقین رکھنے کے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور اُن کی نبوت کی بشارات کثرت سے کتبِ عہدِ قدیم میں موجود ہیں پھر بھی ضد اور ہٹ کی راہ سے رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت ورسالت کا انکار کرتے ہیں اور کتبِ الٰہیہ کو پسِ پشت ڈال کر اسی طرح شیطان کی پیروی کرتے ہیں جس طرح حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں جادو کے متعلق کر چکے ہیں اور آج تک بیجا جسارت کے ساتھ حضرت سلیمانؑ کی جانب کفر (جادو) کی نسبت کرتے چلے آتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ عزیز کا سیاق وسباق اس حقیقت کو بخوبی واضح کر رہا ہے:۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ	اور جب ان (بنی اسرائیل) کے پاس اللہ کی جانب سے
عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ	رسول آیا جو تصدیق کر رہا ہے اُن الہامی کتابوں کی جو
نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا	ان کے پاس ہیں تو جو لوگ (بنی اسرائیل) کتاب
الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ	(توراۃ) دیے گئے تھے انھوں نے اللہ کی کتاب (توراۃ)
ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۫	کو پسِ پشت ڈال دیا اور (آپ کی صداقت کی بشارات)
وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى	کے متعلق ایسے ہوگئے گویا وہ جانتے ہی نہیں اور (یہ تو وہ
مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ	لوگ ہیں کہ) انھوں نے سلیمان کے زمانہ میں اس چیز
وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا	کی پیروی اختیار کرلی تھی جو شیاطین پڑھتے تھے اور سلیمان
يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۤ وَمَآ	نے کفر نہیں کیا تھا لیکن شیاطین نے کفر کیا تھا کہ لوگوں
اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ	کو جادو سکھاتے تھے اور وہ (علم) جو بابل میں ہاروت و
هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا	ماروت دو فرشتوں پر نازل کیا گیا اور جس کو کہ وہ دونوں
يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى	جب کسی کو سکھاتے تھے تو یہ کہہ کر سکھاتے تھے کہ ہم

2

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۱۳۴۔

يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا	(تمھارے لیے) سخت آزمائش ہیں لہٰذا تم (اب) کفر نہ کرنا
تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا	مگروہ (بنی اسرائیل) ان دونوں سے بھی ایسی بات سیکھتے
مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ	کہ جس کے ذریعہ سے زن وشو کے درمیان تفریق پیدا
وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ	ہوجائے حالانکہ وہ اس کے ذریعہ سے خدا کی مرضی کے بغیر
بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ	کسی کو بھی نقصان پہنچا نہیں سکتے (البتہ) وہ ایسی شے سیکھتے
اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ	ہیں جو (انجام کار) ان کو نقصان پہنچانے والی ہو اور ان
وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا	کو ہرگز نفع نہیں دے گی اور بے شبہ وہ جانتے ہیں کہ جس
لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ	شخص نے اس شے (جادو) کو خریدا۔ اُس کے لیے آخرت
فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ	میں کوئی حصہ نہیں ہے اور ضرور وہ شے بہت بُری ہے
وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ	جس کے عوض میں انھوں نے اپنی جان فروخت کر ڈالی
لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○	کاش کہ وہ سمجھتے (یعنی سمجھنے کے بعد اُس سے بچتے) اور وہ
(بقرہ پ ع)	کام نہ کرتے جس کا نتیجہ بُرا ہے۔

مسطورۂ بالا آیات میں جن حقائق کو واضح کیا گیا ہے اُن کی تفسیر میں مفسرین مختلف ذوق رکھتے ہیں اس لیے کہ ان تین باتوں کے علاوہ جن کا گزشتہ سطور میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جا چکا ہے واقعہ کی باقی تفصیلات کے بارے میں قرآنِ عزیز خاموش ہے کیونکہ وہ تفصیلات اُس کے مقصد کے لیے ضروری نہیں ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ کی تفاسیر میں سے ہم نے ترجمہ میں عام تفسیر سے جُدا راہ اختیار کی ہے جو آیۃٌ من آیات اللہ محققِ عصر علامہ محمد انور شاہ (نور اللہ مرقدہٗ) کی تحقیق سے ماخوذ ہے حضرت استاذ کی تفسیر کا خلاصہ یہ ہے:۔

"جب بنی اسرائیل کو شیاطین نے سحر سکھا کر گمراہ کر دیا اور وہ شیاطین کو غیب داں یقین کرنے لگے اور یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی وفات ہو چکی تھی اور اُس وقت اُن کے درمیان خدا کا کوئی نبی موجود نہ تھا تو بنی اسرائیل کو راہِ ہدایت دکھانے اور سنبھالنے

2

کے لیے اُس معجزانہ طریقہ کے مطابق جو صدیوں سے اُن کے لیے حق تعالیٰ کی جانب سے سنتِ متوارثہ بنا ہوا تھا۔ ہاروت، ماروت دو فرشتے آسمان سے نازل کیے گئے اور انھوں نے بنی اسرائیل کو تورات سے ماخوذ اسما، وصفاتِ الٰہی کے اسرار کا ایسا علم سکھایا جو "سحر" کے مقابلہ میں ممتاز، اور سحر کے ناپاک اثرات سے پاک تھا اور اس کی وجہ سے ایک اسرائیلی بآسانی یہ سمجھ سکتا تھا کہ "یہ سحر" ہے اور "یہ علوی علم الاسرار" ہے، اور جب وہ فرشتے بنی اسرائیل کو یہ علم سکھاتے تو پھر اُن کو نصیحت کرتے کہ اب جبکہ تم پر اصل حقیقت منکشف ہوگئی اور تم نے حق و باطل کے درمیان چشم دید مشاہدہ کرلیا تو اب کتاب اللہ کے علم کو پسِ پشت ڈال کر پھر بھی سحر کی طرف رجوع کروگے تو تم بے شبہ کافر ہوجاؤگے، کیونکہ خدا کی حجت تم پر تمام ہوگئی اور اب تمھارے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا، گویا ہمارا وجود تمھارے لیے ایک آزمائش ہے کہ تم ہماری تعلیم کے بعد شیاطین کے تابع ہوکر "سحر" ہی کے شیدائی رہتے ہو یا اس سے زیادہ زبردست اور امرِ حق "کتاب اللہ" کے علم کی پیروی کرتے ہو؟ لیکن بنی اسرائیل کی کج فطرت نے اس موقع پر بھی اُن کا ساتھ نہ چھوڑا اور انھوں نے اس پاک "علوی علم" کو بھی ناجائز اور حرام خواہشات کے لیے استعمال کرنا شروع کردیا، مثلاً زن و شو کے درمیان ناحق تفریق وغیرہ اور اس طرح حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرکے اس کو بھی ایک کرشمہ بنادیا۔ اور حق کو باطل کے ساتھ خلط کرنے یا کسی پاک جملہ کے خواص و اثرات کو ناجائز اور حرام کاموں میں استعمال کرنے کے متعلق علماءِ حق کی تصریحات موجود ہیں کہ یہ بھی ساحرانہ اعمال کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور اسی لیے حرام اور کفر ہے[2]

حضرت شاہ صاحبؒ کی اس تفسیر کے مطابق آیت وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ میں مَا نافیہ نہیں ہے بلکہ بمعنی اَلَّذِیْ ہے[3] اس لیے کہ آیت میں سحر اور "مَآ اُنْزِلَ" کے درمیان

---

[1] موضح الفرقان از شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہٗ زیرِ آیت فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ و کتاب النبوات از شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ۔ [3] تفسیر ابن کثیر جلد ۱۔

معطوف اور معطوف علیہ کی نسبت ہے اور عربیت کے قاعدہ سے عطف، مغائرتِ کلام کے لیے ہوتا ہے لہٰذا آیاتِ زیر بحث میں "سحر" الگ شے ہے جو شیاطین کے ذریعہ سے وجود پذیر ہوتا ہے اور فرشتوں کا لایا ہوا علم دوسری شے ہے جو پاک مقصد کے لیے تعلیم کیا گیا۔ لہٰذا فرشتوں کی جانب سحر کی نسبت صحیح نہیں ہو سکتی۔ یہ تفسیر معانی کی ترتیب، سیاق و سباق کی مطابقت اور حقائق و وقائع کی وضاحت کے لحاظ سے بہت وقیع ہے اور اس لیے ہم اسی کو راجح سمجھتے ہیں۔

اس تفسیر کے علاوہ دوسری تفسیر مشہور نحوی فرّاء سے منقول ہے، وہ مَآ اُنْزِلَ میں مَآ کو نافیہ تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آیات کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سحر کی تعلیم شیاطین کے ذریعہ پھیلی اور ان کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ یہ سلیمان (علیہ السلام) کا علم ہے اور یہ بھی غلط کہ بابل میں ہاروت، ماروت دو فرشتے نازل ہوئے اور وہ بنی اسرائیل کو جادو کھاتے اور سکھاتے وقت یہ تنبیہ کرتے کہ ہم آزمائش بنا کر تمھارے پاس بھیجے گئے ہیں تم اگر سیکھو گے تو ہم ضرور سکھا دیں گے، مگر تم کافر ہو جاؤ گے، اس لیے تم کو نصیحت کرتے ہیں کہ کفر اختیار نہ کرو اور جب بنی اسرائیل اصرار کرتے تو وہ زن و شو کے درمیان تفریق کا جادو سکھا دیتے۔ یہ سارا قصہ جو اُن کے درمیان مشہور ہے سب غلط ہے اور ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

تیسری تفسیر امام قرطبیؒ کی جانب منسوب ہے اور ابن جریر بھی اسی کو راجح تسلیم کرتے ہیں اور وہ یہ کہ آیت "مَآ اُنْزِلَ" الآیہ میں "مَا" نافیہ ہے اور ہاروت و ماروت "شیاطین" سے بدل ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ غلط ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے آسمان کے فرشتے "سحر" کا علم لے کر آئے تھے بلکہ شیاطین سحر سکھاتے تھے جن میں سے بابل میں دو مشہور شخصیتیں ہاروت و ماروت کی تھیں اور وہ جادو سکھاتے تو بنی اسرائیل کی مذہبی زندگی پر طعن کرتے ہوئے یہ کہتے جاتے کہ دیکھو! اگر تم نے ہم سے یہ "سحر" سیکھا تو تم کافر ہو جاؤ گے مگر بنی اسرائیل کی گمراہی کا یہ عالم تھا کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی ان سے زن و شو کے

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ا ص ۱۲۷۔

درمیان تفریق کا جادو سیکھتے اور کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈال دیتے تھے۔

ہمارے خیال میں یہ دونوں تفسیریں بھی عام تفسیر سے زیادہ بہتر ہیں کیونکہ عام تفسیر کے مطابق مَا کو بمعنی اَلَّذِی تسلیم کر کے یہ مطلب لینا کہ بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتے بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے خدائے تعالیٰ کی جانب سے نازل ہو کر سحر سکھاتے اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کرتے جاتے تھے کہ ہم سے یہ علم نہ سیکھو ورنہ کافر ہو جاؤ گے بے وجہ متعدد اشکالات کو دعوت دینا اور "سحر" اور "مَآ اُنْزِلَ" کو بے دلیل ایک ہی شے تسلیم کرنا ہے۔

ان تفاسیر کے علاوہ آیاتِ زیرِ بحث کے سلسلہ میں بعض عجیب و غریب آثارِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) اور ایک مرفوع روایت کتبِ تفسیر میں منقول ہیں حالانکہ یہ حقیقتاً نہ آثارِ صحابہ ہیں اور نہ مرفوع حدیث، بلکہ کعب احبار اور دوسرے علماء یہود کے وہ بیان کردہ قصے ہیں جو بنی اسرائیل کا ذخیرۂ خرافات کہے جانے کے مستحق ہیں۔ ان قصوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ہاروت و ماروت فرشتوں نے ایک مرتبہ خدائے تعالیٰ کے حضور میں انسانوں کی معصیتوں کا مذاق اُڑایا کہ یہ کیسی ذلیل مخلوق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے انعامات کے باوجود اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتی رہتی ہے۔ یہ طنز اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا اور اُن سے فرمایا کہ اگر تم دنیا کے ماحول میں محصور ہوتے تو تم یہی کرتے۔ فرشتوں نے اپنی عصمت اور پاکدامنی پر اعتماد کا اظہار کیا تب بطور آزمائش اُن دونوں کو زمین پر اُتار دیا گیا، یہاں رہتے رہتے ایک مرتبہ ان کی نگاہ ایک بیحد حسین عورت زہرہ پر پڑی اور دونوں اس کے عشق میں گرفتار ہو گئے اور زہرہ سے قربت کے طلبگار ہوئے۔ اس نے کہا جب تک تم شراب نہ پیو گے، قتل نہیں کرو گے اور بت کو سجدہ نہیں کرو گے مجھے حاصل نہیں کر سکتے، چنانچہ زہرہ کے عشق میں انھوں نے یہ تینوں کام کیے۔ زہرہ نے بحالتِ مقاربت اُن سے دریافت کیا کہ وہ آسمان پر کس طرح جاتے ہیں فرشتوں نے اس کو اسمِ اعظم سکھا دیا اور زہرہ اسمِ اعظم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی اور یہ دونوں فرشتے خدا کے غضب میں مبتلا ہو گئے اور بابل کے

کنویں میں قید کر دیے گئے۔ اب جو شخص اُن کو آواز دے کر اُن سے جادو سیکھنا چاہتا ہے وہ اول تو اس کو منع کرتے اور کافر ہو جانے کا خوف دلاتے ہیں، لیکن جب وہ اصرار کرتا ہے تو اس کو جادو سکھا دیتے ہیں اور اس سے دریافت کرتے ہیں کہ تجھ کو کچھ نظر آیا؟ وہ شخص کہتا ہے کہ ایک نورانی شکل کا انسان گھوڑے پر جاتا ہوا نظر آتا ہے، فرشتے کہتے ہیں کہ یہ تیرا ایمان تھا جو تجھ سے جُدا ہو گیا اور اب تو جادوگر بن گیا۔ یہ فرشتے قیامت تک خدا کے عذاب کی وجہ سے اسی طرح کنویں میں اُلٹے لٹکے رہیں گے۔

اس روایت کا لغو ہونا خود بخود واضح ہے اس لیے محققین نے اس کی لغویت اور خرافت پر متنبہ کر کے اسلامی روایات کے دامن کو اس سے پاک اور محفوظ ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ ابن کثیرؒ نے اوّل مرفوع روایت پر بحث کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا ہے:۔

واقرب مایکون فی ھذا انہ من روایۃ عبد اللہ بن عمر عن کعب الاحبار لا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم	اور اس سلسلہ میں قریب تر بات یہ ہے کہ "عبداللہ بن عمرؓ سے جو روایت مسند احمد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے منقول ہے" وہ دراصل عبداللہ بن عمرؓ نے کعب احبار سے اسرائیلی قصہ نقل کیا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب اس کی نسبت ہرگز صحیح نہیں ہے۔
فدار الحدیث ورجع الی نقل کعب الاحبار عن کتب بنی اسرائیل[1]	(بیان کردہ تصریحات کے بعد) نتیجہ یہ نکلا کہ جس حدیث کو مرفوع کہا جاتا تھا وہ آخر کار کعب احبار کی روایت ثابت ہوئی جو انھوں نے بنی اسرائیل کی کتابوں سے نقل کر کے بیان کی ہے۔

اور اس فیصلہ کے بعد اُن تمام آثار پر تنقید کرتے ہوئے جو اس سلسلہ میں صحابہ (رضی اللہ عنہم) اور تابعین (رحمہم اللہ) کی جانب منسوب کیے جاتے ہیں جو محاکمہ کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے:۔

ہاروت و ماروت کا یہ قصہ (زہرہ اور چاہِ بابل کا قصہ) تابعین کی ایک اچھی خاصی جماعت

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱

نے نقل کیا ہے مثلاً مجاہد، سُدی، حسن بصری، قتادہ، ابو العالیہ، زہری، ربیع بن انس، مقاتل، ابن حبان وغیرہ اور پھر ان سے نقل کر کے متقدمین اور متاخرین نے کثرت سے بیان کیا ہے مگر ان تمام نقول کا حال یہ ہے کہ ان میں جس قدر تفصیلات بھی منقول ہیں وہ سب بنی اسرائیل کے قصوں سے لی گئی ہیں اس لیے کہ صادق مصدوق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے (کہ جن کی شانِ مبارک یہ ہے کہ وہ اپنے ہوائے نفس سے کچھ بھی نہیں کہتے جو کچھ فرماتے ہیں وحی الٰہی سے فرماتے ہیں) اس بارہ میں کوئی صحیح روایت ذخیرۂ حدیث میں موجود نہیں ہے اور قرآن کا ظاہر سیاق واقعہ کو مجمل رکھتا ہے اور کوئی تفصیل اور تشریح نہیں کرتا اس لیے ہمارا ایمان یہ ہے کہ قرآن عزیز نے جس قدر اس سلسلہ میں بیان کیا ہے وہ حق ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی تفصیل و تشریح کیا ہے وہ اس ہی کے سپرد ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال[1]

یعنی قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کو جس غرض سے بیان کیا ہے وہ تو صرف اس قدر ہے کہ بنی اسرائیل کا حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی جانب جادو (کفر) کی نسبت کرنا بہتان اور افتراء ہے، یہ کام شیاطین کا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کا دامن اس سے پاک ہے اور یہ کہ بنی اسرائیل نے شیاطین کی پیروی اختیار کی اور اللہ کی کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا اور باقی تفصیلات کو اس نے نظر انداز کر کے صرف اجمال پر اکتفا کیا ہے لہٰذا ہمارے لیے اس کے اجمال پر ایمان لے آنا ہی کافی ہے اور اس کی شرح و بسط کو خدا کے حوالہ کرنا ہی اسلم طریقہ ہے کیونکہ ان تفصیلات سے دین و ملت کا کوئی مسئلہ وابستہ نہیں ہے۔

ابن کثیرؒ کے اس مسلک کی تائید بعض دوسرے محققین نے بھی کی ہے جس میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابو حیان اندلسی[2] خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی وفات قرآنِ عزیز نے سورۂ سبا میں حضرت سلیمانؑ کی وفات کا جو

---

[1] ترجمہ از تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۱۴۱۔ [2] البحر المحیط جلد ۱

واقعہ بیان کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے حکم سے جنوں کی ایک بہت بڑی جماعت عظیم الشان عمارات بنانے میں مصروف تھی کہ سلیمان (علیہ السلام) کو پیغام اجل آپہنچا مگر جنوں کو اُن کی موت کی خبر نہ ہوئی اور وہ اپنی مفوضہ خدمات میں مصروف رہے اور عرصہ کے بعد جب دیمک نے اُن کی لاٹھی کو چاٹ کر اُس توازن کو خراب کر دیا جس کی وجہ سے حضرت سلیمانؑ لاٹھی سے ٹیک لگائے کھڑے نظر آتے تھے اور وہ گر گئے تب جنوں کو علم ہوا کہ حضرت سلیمانؑ کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا تھا مگر افسوس کہ ہم نہ معلوم کر سکے کاش کہ ہم علم غیب رکھتے تو عرصہ تک اس مشقت و محنت میں نہ پڑے رہتے جس میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے خوف سے مبتلا رہے۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا	اور جب ہم نے اس (سلیمانؑ) کی موت کا فیصلہ کر دیا
دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ	توان (جنوں) کو اس کی موت کی کسی نے اطلاع نہیں
الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا	دی مگر دیمک نے کہ جو سلیمان کی لاٹھی چاٹ رہی تھی اور
خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا	جب سلیمانؑ (لاٹھی کے توازن خراب ہو جانے سے)
يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا	گر پڑا تو جنوں پر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ غیب کا علم رکھتے ہوتے
فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ (سبا پ ۲۲)	تو اس سخت مصیبت میں مبتلا نہ رہتے۔

کہتے ہیں کہ جنوں پر یہ راز جب کھلا کہ تعمیر مکمل ہو چکی تھی اس لیے جنوں کو افسوس رہا کہ اگر وہ غیب داں ہوتے تو اس سے بہت پہلے آزاد ہو گئے ہوتے۔

اس مقام پر قرآنِ عزیز کا مقصد جس طرح حضرت سلیمانؑ کی وفات کے واقعہ کا اظہار ہے اُسی طرح بنی اسرائیل کو اُن کی حماقت پر متنبہ کرنا بھی اس کا مقصد ہے کہ اُن کے عقیدہ کے مطابق اگر جن غیب داں ہوتے تو وہ عرصہ تک حضرت سلیمانؑ کے خوف سے تعمیر بیت المقدس یا کسی دوسرے شہر کی تعمیر کی صعوبتوں میں مبتلا نہ رہتے چنانچہ حضرت سلیمانؑ کی وفات کا جس صورت سے اُن کو علم ہوا اُس کے بعد خود شیاطین (جنوں) کو بھی

یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ہمارا دعویٰ غیب دانی قطعاً غلط ثابت ہوا۔

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی وفات کے متعلق قرآنِ عزیز نے اسی قدر بتایا ہے، اس سے زاید تفصیل نہیں بیان کی اور نہ اُس کے مقصدِ تبلیغ کے پیشِ نظر اس کی کوئی ضرورت تھی لہٰذا ہم کو بھی ان تفصیلات میں کنج وکاؤ کی حاجت نہیں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کتنی مدت لاٹھی کے سہارے کھڑے رہے؟ کس حالت میں کھڑے رہے؟ انس و جن دونوں ہی کو اس کا علم نہیں تھا یا فقط ان جنوں کو ہی علم نہیں ہوا جو بیت المقدس سے بہت فاصلہ پر کسی شہر کی تعمیر میں مشغول تھے وغیرہ وغیرہ۔

البتہ اسرائیلی روایات سے ماخوذ ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں فرشتۂ اجل نے حاضر ہو کر یہ پیغام سنایا کہ اُن کی موت میں چند ساعتیں باقی ہیں تو انھوں نے یہ سوچ کر کہ کہیں "جن" تعمیر کو ناقص نہ چھوڑ دیں فوراً جنوں سے آبگینہ کا ایک حجرہ بنوایا اور اس میں دروازہ نہیں رکھا اور خود اس کے اندر بند اور لاٹھی کے سہارے کھڑے ہو کر مشغولِ عبادت ہو گئے اور اسی حالت میں موت کے فرشتے نے اپنا کام پورا کر لیا تقریباً ایک سال تک حضرت سلیمانؑ اسی طرح کھڑے رہے اور "جن" مشغولِ تعمیر رہے لیکن جب وہ تعمیر کو مکمل کر کے فارغ ہو گئے تو اب حضرت سلیمانؑ کی لاٹھی میں دیمک پیدا ہو گئی اور اس نے لاٹھی کو چاٹ کر بے جان کر دیا اور وہ حضرت سلیمانؑ کا بوجھ برداشت نہ کر سکی اور حضرت سلیمانؑ زمین پر گر گئے۔ تب جن سمجھے کہ حضرت سلیمانؑ کا عرصہ ہوا کہ انتقال ہو گیا اور اپنی نادانی پر افسوس کرنے لگے [1]

غرض یہ اور اسی قسم کی روایات ہیں جو اسرائیلیات سے نقل ہو کر اس سلسلہ میں کتبِ تفاسیر میں بیان کی گئی ہیں اور نقل کرنے کے بعد محققین نے واضح کر دیا ہے کہ اُن کی حقیقت کیا ہے۔ تورات میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی وفات کا واقعہ اس طرح ہے:۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۵۲۹ - ۵۳۰ -

"غرض ساری مدت کہ سلیمان (علیہ السلام) نے یروشلم میں سارے اسرائیل پر سلطنت کی، چالیس برس کی تھی اور سلیمان اپنے باپ دادوں کے ساتھ سو رہا اور اپنے باپ داؤد کے شہر صیہون میں گاڑ دیا گیا اور اس کا بیٹا رحبعام اس کی جگہ بادشاہ ہوا"[۱]

اور قاضی بیضاوی نے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی عمر ابھی تیرہ سال ہی کی تھی کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا انتقال ہوگیا اور وہ سریر آرائے سلطنت ہوئے اور ترپن سال کی عمر میں انتقال فرمایا[۲]۔ بیضاوی کا یہ قول غالباً توراۃ ہی سے ماخوذ ہے۔

بصائر حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے واقعات کو جس ترتیب اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے وہ صاحبِ بصیرت کو خود دعوتِ بصیرت دیتے، پیغامِ عبرت سناتے اور ایک حقیقت بیں نگاہ کے سامنے اہم حقائق کے پردے چاک کرتے ہیں تاہم اُن میں سے یہ چند امور خصوصیت کے ساتھ قابلِ مطالعہ ہیں:۔

(۱) اُمم سابقہ نے خدا کے سچے دین میں اپنی خواہشاتِ نفس کے زیرِ اثر جہاں اور بہت سی تحریفات کی ہیں اُن میں سے ایک شرمناک تحریف خدا کے سچے پیغمبروں اور اولوالعزم رسولوں پر بہتان طرازی اور اُن کی جانب بیہودہ اور فحش انتسابات کے لیے بیجا اقدام بھی ہے۔

اور اس معاملہ میں بنی اسرائیل کا قدم سب سے آگے ہے، وہ ایک جانب خدا کی ایک برگزیدہ ہستی کو نبی اور رسول بھی تسلیم کرتے ہیں اور دوسری جانب بغیر کسی جھجک کے شرمناک اور غیر اخلاقی امور کا انتساب بھی ان کے ساتھ وابستہ رکھتے ہیں مثلاً حضرت لوط (علیہ السلام) اور اُن کی بیٹیوں کا معاملہ[۳] نیز بعض انبیاء و رُسل اور خدا کے جلیل القدر پیغمبروں کی رسالت و نبوت سے انکار کر کے اُن پر مختلف قسم کے بہتان اور جھوٹے الزامات

---

[۱] سلاطین ۱ باب ۱۱۔ آیات ۴۲۔ ۴۳۔ [۲] تفسیر سورۂ سبا۔ [۳] تورات پیدائش باب ۱۹ آیات ۳۰۔ ۳۸۔

لگانا قابلِ فخر بات سمجھتے ہیں مثلاً حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (علیہما السلام) کا معاملہ۔

قرآنِ عزیز نے دین کے بارہ میں سچائی اور اعلانِ حق کا جو بیڑا اٹھایا اور اصلاحِ ادیان کے ساتھ دینِ حق (اسلام) کی جو حقیقی روشنی عطا کی۔ اس کے ان احسانات میں سے ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ جن انبیاء و رُسل کا اس نے ذکر کیا ہے اُن سے متعلق بنی اسرائیل کی خرافات و ہزلیات کو مدلل رد کیا اور ان کے مقدس دامن کو عائد کردہ آلودگیوں سے پاک ظاہر کیا اور اس طرح اصل حقیقت کو آشکارا کر کے کور باطنوں کی خباثتِ نفس کا پردہ چاک کر دیا۔

(۲) صد ہزار قابلِ عبرت ہے یہ بات کہ جس گمراہی کو بنی اسرائیل نے اختیار کیا اور قرآنِ عزیز نے جس کو روشن اور واضح دلائل کے ساتھ مردود قرار دیا تھا اس آلودگی سے ہمارا دامن بھی محفوظ نہ رہ سکا اور قرآنِ عزیز کی صاف اور روشن راہ کو چھوڑ کر ہم نے تحریف شدہ روایاتِ بنی اسرائیل کو اسلامی روایات میں جگہ دینی شروع کر دی۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک جگہ صرف یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اہلِ کتاب کی جو روایات قرآن اور تعلیمِ اسلام کے منافی نہ ہوں اُن کو نقل کرنا درست ہے لیکن ہم نے اس ارشادِ مبارک کی بنیادی شرط "کہ وہ قرآن اور تعلیمِ اسلام کے خلاف نہ ہو" کو نظر انداز کر کے ہر قسم کی اسرائیلی روایات کو نہ صرف نقل کیا بلکہ قرآنِ عزیز کی تفسیر و توجیہ کے لیے اُن کو دلیل بنایا اور جگہ جگہ تاویل و تفسیرِ قرآن میں اُن کو پیش کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف تو غیر مسلموں نے اُن روایات کو اسلامی روایات ظاہر کیا اور اُن میں آب و رنگ پیدا کر کے اسلام کی بے لوث اور پاک تعلیم پر حملے شروع کر دیے اور اُن کو اپنے ناپاک مقاصد کے لیے بہانہ اور حیلہ بنا لیا اور دوسری جانب خود مسلمانوں میں الحاد و زندقہ کے علم برداروں نے اُن روایات کی آڑ لے کر قرآنِ عزیز اور صحیح احادیث سے ثابت اور علمِ یقین (وحی الٰہی) سے حاصل حقائق (معجزات) حشر و نشر کے واقعات، جنت و جہنم کی

تفصیلات سے انکار کے لیے راہ بنائی اور ہر ایسے مقام پر بے سند یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو ہمارے مفسرین نے عادت کے مطابق اسرائیلی اعتقادات سے اخذ کر لیا ہے حالانکہ اس واقعہ کے لیے خود قرآنِ عزیز یا حدیثِ رسولؐ کی نصِ قطعی (یقینی صراحت) موجود ہوتی ہے۔

چنانچہ سرسید، مولوی محمد حسن امروہوی، مولوی چراغ علی، غلام احمد قادیانی محمد علی لاہوری کی تفاسیر قرآن اور تفسیری مضامین کی اساس اسی الحاد پر قائم ہے۔

غرض یہ دونوں راہیں غلط ہیں۔ اسلام کی تعلیم کے خلاف اسرائیلی روایات کو اسلامیات خصوصاً تفسیرِ قرآن میں جگہ دینا بھی غلط راہ اور سخت مہلک قدم ہے خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ اُٹھایا گیا ہو اور اسی طرح الحاد کی دعوت کے لیے اس نقل روایات کی آڑ لے کر نصوصِ قرآن وحدیث سے انکار یا تفسیر کے نام سے معنوی تحریف کا اقدام بھی اسلامی تعلیم کو برباد کرنا اور اس کے خد وخال کو مسخ کر دینا ہے۔

صحیح اور صاف راہ (راہِ مستقیم) صرف وہ ہے جو علماءِ محققین نے اختیار کی ہے کہ وہ ایک طرف نصوصِ قرآن وحدیث کو اپنا ایمان یقین کرتے اور اُن میں ملحدانہ تاویلات کو تحریف سمجھتے ہیں اور دوسری جانب قرآن وحدیث کے دامن کو اسرائیلیات سے پاک ثابت کر کے حقیقت کی روشنی کو سامنے لاتے ہیں۔

(۳) صاحبِ حکومت انبیاء ورُسل اور دنیوی بادشاہوں اور حکمرانوں کی زندگی میں ہمیشہ بیّن اور واضح امتیاز رہا اور رہتا ہے، اوّل الذکر حضرات کی زندگی کے ہر ایک پہلو اور ہر ایک گوشہ میں خدا کا خوف، اس کی خشیت، عدل وانصاف، دعوت وارشاد، خدمتِ خلق نمایاں نظر آتے ہیں وہ کسی جائز موقع پر حاکمانہ اقتدار کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں تو اس میں نخوت وتکبر کی جگہ بغض فی اللہ نظر آتا ہے یعنی ان کا غصہ اپنے لیے نہیں، اپنے ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ خدائے برتر کے کلمہ کی بلندی کے لیے ہوتا ہے، چنانچہ حضرت

یوسفؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ (علیہم السلام) کی حیاتِ طیبہ کا پورا دور اس کا شاہد عدل ہے اور موخر الذکر کی زندگی اور حیات کے ہر شعبہ میں ذاتی وقار شخصی یا جماعتی (پارٹی) تفوق و برتری کا مظاہرہ، زیر دستوں پر ظلم، اساس و بنیاد کی طرح کارفرما نظر آتے ہیں۔

مثال کے طور پر آپ اوّل فرعون کے اس اعلان پر غور فرمائیے "اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی" "میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں دوسرا کوئی نہیں" اور پھر حضرت سلیمانؑ کے اس خطاب پر نظر کیجیے "اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ" "مجھ پر بلندی نہ ظاہر کرو اور مسلمان ہو کر میرے پاس حاضر ہو" دونوں جملوں میں حاکمانہ اقتدار کا مظاہرہ موجود ہے مگر فرعون کے اعلان میں خدا کے ساتھ سرکشی، مخلوقِ خدا پر ظالمانہ قہرمانیت اور دعوائے خدائی کے لیے انانیت جیسے اوصاف نظر آ رہے ہیں اور حضرت سلیمانؑ کے خطاب میں مخاطب کے مقابلہ میں سربلندی کا اظہار ذاتی وقار اور شخصی سربلندی کے لیے نہیں بلکہ خدائے واحد کے ارشاد و تبلیغ، اعلاءِ کلمۃ اللہ اور شرک سے بیزاری کے ساتھ دعوتِ توحید کے لیے کیا جا رہا ہے اور یہی فرق ہے جو انبیاء علیہم السلام کی وراثت کے ذریعہ ہمیشہ خلافتِ حقہ اور ملک عضوض (دنیوی حکومت) کے درمیان نمایاں رہنا چاہیے۔

(۴) جس شخص کی زندگی خالص اللہ کے لیے ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ بھی اپنی کل کائنات کو اس کے لیے تابع اور مسخر کر دیتے ہیں اور اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ اس کا کوئی قدم بھی خدا کی مرضی کے خلاف نہیں اٹھتا۔ اب اگر ایسا شخص بعض ایسے امور کر دکھاتا ہے جو عام دنیوی اسباب و وسائل سے بالاتر ہو کر عمل میں آئے ہیں تو کوتاہ بیں اور مشکوک نگاہیں دیکھنے اور سمجھنے کی تو زحمت گوارا نہیں کرتیں کہ جس ہستی سے یہ اعمال صادر ہوئے ہیں وہ خدا کی مرضی میں خود کو فنا کر چکی ہے اس لیے خدا کی بے قید قدرت کا ہاتھ اس کے سر پر ہے اور اس کے ان اعمال (معجزات) کو بھی عام قوانینِ قدرت کی ترازو میں تول کر ان کے انکار پر آمادہ ہو جاتی ہیں یہ راہ بے شبہ غلط اور گمراہی کی راہ ہے اور صاف اور روشن راہِ مستقیم۔

وہ ہے جس کو ہمیشہ سے منکرینِ اسلام قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کرتے چلے آئے ہیں، یعنی :-

عام قوانینِ قدرت کے خلاف امور ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اُن کا انکار بداہت کا انکار ہے اس لیے کہ قوانینِ قدرت اور نوامیسِ فطرت کے خالق کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بے قید قدرت سے کسی قانون کو توڑ دے بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ غالباً معجزات جیسے امور کے لیے اس کے یہاں شروع ہی سے ایسے جُدا نوامیسِ فطرت اور قوانینِ قدرت کام کر رہے ہیں جو عام قوانینِ فطرت سے خاص ہیں اور چونکہ دنیوی علوم نے اُن حدود تک رسائی نہیں کی اور وہ ابھی تک اُن کے اکتشافات سے عاجز ہیں، اس لیے ہم اپنی کوتاہ عقل کے پیشِ نظر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ امور خارقِ عادت اور قوانینِ قدرت کو توڑنے والے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اُن اعمال کا تعلق بھی نوامیسِ فطرت ہی سے وابستہ ہوتا ہے، فرق صرف عام اور خاص کا ہے نہ کہ عام قوانین کے توڑنے کا، اور نوامیسِ فطرت کی اس تقسیم کا علم خدائے تعالیٰ کی جانب سے اُن نفوسِ قدسیہ کو مشاہدہ کے درجہ میں حاصل ہو جاتا ہے، جن کے ذریعہ سے ایسے امور کو ظاہر کیا جاتا ہے جو خاص نوامیسِ فطرت کے تحت میں بر روئے کار آتے ہیں (مثلاً معجزات وکرامات)

(۵) شیطانی اثرات میں سب سے بدترین اثر یا شیطانی وسوسہ یہ ہے کہ زن وشو کے خوش گوار تعلقات میں نفرت وعداوت کا ایسا زہر ملا دیا جائے جو ان کے مابین تفرقہ کا باعث ہو۔ یہ اس لیے بدترین ہے کہ عموماً اس کے نتائج کذب وبہتان، بدکلامی بداخلاقی بدکاری وفحش حتیٰ کہ قتل تک دور رس ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ عمل شیطان کو بہت محبوب ہے، چنانچہ صحیح حدیث میں آتا ہے :

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابلیس علی الصباح اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے اور پھر اپنی فوج کو انسانوں کی گمراہی کے لیے اطرافِ زمین میں منتشر کرتا ہے اور جو اُن میں سے

زیادہ فتنہ پرداز ہوتا ہے وہ اس کے یہاں زیادہ تقرب پاتا ہے چنانچہ واپس آکر ہر ایک شیطان اپنی اپنی کارگزاری بیان کرتا ہے کہ مثلاً میں فلاں شخص کو چمٹا رہا حتی کہ یہ کلمات (بیہودہ کلمات) کہلا کر چھوڑا۔ مگر ابلیس اس قسم کی کارگزاریوں کی داد نہیں دیتا اور ان کے فتنہ کو معمولی قرار دیتا ہے کہ اسی درمیان میں ایک شیطان آکر کہتا ہے کہ میں نے زن و شوہر کے درمیان آج تفرقہ ڈال دیا اور ان کے خوش گوار تعلقات کو مکدر بنا دیا۔ ابلیس یہ سن کر فوراً اس کو اپنے گلے لگا لیتا اور شاباش دیتا ہے کہ بیشک تو نے بہت بڑا کارِ نمایاں کیا ہے۔[1]

شیاطینِ جن و انس کا یہ سحر عموماً ایسے وساوس اور اسباب کے ذریعہ عمل میں آتا ہے جو دونوں کے درمیان بدگمانی، بدکلامی اور شکر رنجی پیدا کرتے ہوں اور یہ حالت آہستہ آہستہ نفرت و عداوت اور تفریق بین الزوجین پر منتج ہوتی ہے۔ اعاذنا اللہ من ذٰلک۔



---

[1] صحیح مسلم۔

حضرتِ ایوبؑ (علیہ السلام)

حضرت ایوب (علیہ السلام) اور قرآن عزیز، حضرت ایوب کی شخصیت؟ یوباب اور ایوب، عہد ایوب (علیہ السلام) حضرت ایوب اور علماء یہود و نصاریٰ، غلط فہمی کا ازالہ، قرآنِ عزیز اور واقعۂ ایوب (علیہ السلام)، چند تفسیری حقائق، سفر ایوب، وفات، بصائر۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور قرآنِ عزیز

قرآنِ عزیز میں حضرتِ ایوب (علیہ السلام) کا ذکر چار سورتوں میں آیا ہے، سورۂ نساء، انعام، انبیاء اور صٓ۔ نساء اور انعام میں تو انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں فقط نام مذکور ہے:۔

وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ		اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس
وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ	(نساء)	اور ہارون اور سلیمان۔
وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ		اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور
وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ	(انعام)	ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون۔

اور سورۂ انبیاء اور صٓ میں مجمل تذکرہ ہے اور صرف یہ بتایا گیا ہے کہ اُن پر آزمائش و امتحان کا ایک سخت وقت آیا اور مصیبتوں اور بلاؤں نے چہار جانب سے اُن کو گھیر لیا مگر وہ صبر و شکر کے ماسوا حرفِ شکایت تک زبان پر نہیں لائے اور آخر کار ان کو خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیا اور مصائب کے بادل دور کر کے اُن کو فضل و عطا سے مالا مال کر دیا اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ عزیز کے بیان کردہ واقعات سے قبل حضرت ایوبؑ کی شخصیت پر تاریخ کی روشنی میں بحث کر لی جائے تاکہ ہم اس ہستی کا صحیح تعارف کر سکیں جس کے صبر و شکر کی قرآنِ عزیز نے مدحت کی ہے اور جس کی زندگی کو مبارک اور

اخلاقی بلندی میں ضرب المثل ٹھہرایا ہے۔

حضرت ایوبؑ کی شخصیت

حضرت ایوبؑ کی شخصیت سے متعلق تحقیق کے لیے صرف دو ماخذ ہو سکتے ہیں، ایک تورات اور دوسرے وہ اقتباسات جو تاریخِ قدیم سے اخذ کر کے مؤرخینِ عرب اور مؤرخینِ اسلام نے نقل کیے ہیں اور اگر اُن کے ساتھ چند خارجی قرائن کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق سب سے قدیم شہادت سفرِ ایوب کی ہے، یعنی وہ صحیفہ جو مجموعۂ تورات میں ایوب (علیہ السلام) کی جانب منسوب ہے اور جس میں اُن کی حیاتِ طیبہ کے متعلق تفصیلی حالات درج ہیں۔

سفرِ ایوب میں تاریخی حیثیت سے ایوب (علیہ السلام) کے متعلق دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سرزمینِ عوض کے باشندہ تھے۔

عوض کی سرزمین میں ایوب نامی ایک شخص تھا اور وہ شخص کامل اور صادق تھا اور خدا سے ڈرتا اور بدی سے دور رہتا تھا[1]

دوسری بات یہ کہ اُن کے مویشی اور چوپایوں پر سبا اور کسدیوں (بابلیوں) نے حملہ کر کے لوٹ لیا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں قوموں کے زمانۂ عروج کے معاصر تھے۔

یوباب اور ایوب

سفرِ ایوب کے ان دو حوالوں کی وضاحت کے علاوہ ایک اور تاریخی مسئلہ بھی ہے جس سے حضرت ایوب کے زیرِ تحقیق مسئلہ میں مدد مل سکتی ہے وہ یہ کہ توراۃ اور کتبِ تاریخ میں ایک نام یوباب آتا ہے، اور محققین کا خیال اس کے متعلق یہ ہے کہ ایوب اور یوباب ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ دراصل عبرانی میں یوباب کو ادب کہا گیا ہے اور یہی ادب عربی میں ایوب ہو گیا۔ لیکن اس تحقیق کے باوجود کہ ایوب، یوباب اور اوب مختلف زبانوں میں ایک ہی شخصیت کے نام ہیں۔ حضرت ایوب کی شخصیت سے

متعلق مسئلہ پھر بھی حل طلب رہتا اور کچھ تفصیل چاہتا ہے۔

توراۃ کے بیان کے مطابق یوباب دو جُدا جُدا شخصیتوں کا نام ہے۔ ایک بنی یقطان میں سے ہے اور دوسرا بنی ادوم میں سے، جو یوباب یقطان کی نسل سے ہے اُس کا زمانہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے بھی مقدم ہے کیونکہ اس کا سلسلۂ نسب پانچ واسطوں سے حضرت نوح (علیہ السلام) تک پہنچتا ہے۔ یعنی یوباب بن یقطان بن عیر بن سلخ بن ارفکسد بن سام بن نوح[1] (علیہ السلام)۔ اور جو بنی ادوم میں سے ہے وہ بھی اگرچہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے پہلے ہے لیکن یوباب اوّل کے زمانہ سے اس کا عہد متاخر ہے، اس لیے حضرت اسحٰق (علیہ السلام) کے تذکرہ میں یہ ذکر آچکا ہے کہ ادوم، اسحٰق (علیہ السلام) کے صاحبزادہ عیسو (عیص یا عیصو) کا لقب ہے اور یہ کہ وہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) سے بڑے تھے اور کنعان سے ترکِ وطن کر کے اپنے چچا حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کے پاس حجاز میں آ گئے تھے اور اُن کی صاحبزادی محلات[2] یا بشامہ (باسمہ) سے شادی کر کے عرب کے اس حصۂ سرزمین میں آباد ہو گئے تھے جو شام و فلسطین کے جنوب مغرب میں عرب کی آخری حد ہے اور جس جگہ کوہِ ساعیر کا سلسلہ طول میں شمال سے جنوب تک چلا گیا ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ وہ مقام جو عمان سے حضرموت تک وسیع ہے۔[3]

ان عیسو (ادوم) کی نسل میں صدیوں تک حکومت و سطوت کا دور رہا ہے۔ اور مؤرخین کے نزدیک ان کے دورِ حکومت کی ابتدا تقریباً ۱۸۰۰ ق م بتائی جاتی ہے چنانچہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں جب بنی اسرائیل مصر سے واپس آئے ہیں تو اس وقت بھی بنی ادوم شعیر (ساعیر) پر حکمراں تھے، تورات میں ہے:[4]

تب موسیٰ نے قادس سے ادوم کے بادشاہ کو ایلچی کے ہاتھ یوں کہلا بھیجا کہ تیرے

---

[1] پیدائش باب ۱۰۔ آیت ۲۲-۲۴
[2] تورات پیدائش باب ۲۸ آیت ۹۔
[3] دائرۃ المعارف للبستانی جلد ۲
[4] گنتی باب ۲۰۔ آیت ۱۴۔

بھائی اسرائیل نے کہا ہے کہ وہ سب تکلیفیں جو ہم پر آن پڑی ہیں تو جانتا ہے۔ ۔۔ ۔۔
اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت قادس سے روانہ ہو کر کوہ ہور پر آئی اور خداوند نے کوہ ہور پر جو ادوم کی سرحد سے ملا ہوا تھا موسیٰ اور ہارون کو کہا[1]

بنی ادوم[2] کے ان حکمرانوں کی جو فہرست تورات میں مذکور ہے اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر ساؤل (طالوت) کی وسیع حکومت سے پہلے کہ جس کی وسعت خطۂ ادوم تک پہنچی اور جو ۱۰۰۰ ق م میں قائم ہوئی تھی آٹھ حکمراں بر سرِ حکومت رہ چکے تھے اور ان میں سے دوسرے حکمراں کا نام یوباب بن زارح تھا۔

اس حد پر پہنچ کر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت ایوب (علیہ السلام) اور یوباب دونوں نام ایک ہی شخصیت کے ہیں تو اُن دونوں میں سے کس یوباب کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں مؤرخین کی دو رائیں ہیں ــــ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ یہ بنی یقطان کی نسل سے اور عربِ عاربہ میں سے ہے اور اسی لیے حضرت ایوب (علیہ السلام) یا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے معاصر ہیں اور یا کم از کم حضرت اسحٰق (علیہ السلام) و حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے معاصر۔ فرماتے ہیں:

اولاً محققینِ تورات میں سے اکثر اس طرف گئے ہیں کہ حضرت ایوب عرب تھے عرب میں ظاہر ہوئے تھے اور سفرِ ایوب اصلاً قدیم عربی میں لکھی گئی تھی حضرت موسیٰ نے اُسے قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا۔ سفرِ ایوب میں ہے کہ وہ عوض کے ملک میں رہتے تھے اور آگے چل کر تصریح کی ہے کہ ان کے مویشی پر شیبا (سبا) کے لوگوں نے حملہ کیا تھا (۱:۱۵)

ان دونوں تصریحوں سے بھی اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کیونکہ کتاب پیدائش اور تواریخ اول میں عوض کو آرام بن سام بن نوح کا بیٹا کہا ہے، اور آرامی بالاتفاق عربِ عاربہ کی ابتدائی جماعتوں میں سے ہیں[3]

---

[1] گنتی باب ۲۰۔ آیات ۲۲-۲۳ [2] پیدائش باب ۳۶۔ آیات ۳۲-۳۹ [3] ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۴۸۶۔

عرب مؤرخ ابن عساکر کا رجحان بھی اسی جانب معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت ایوب (علیہ السلام) کو قریب بعہد ابراہیمی مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت لوط (علیہ السلام) کے معاصر اور دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے۔[1]

اور نجار مصری اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت ایوب کا زمانہ حضرت ابراہیم سے ایک سو سال پہلے تھا۔[2]

ان دونوں کے برعکس مولانا سید سلیمان فرماتے ہیں کہ ایوب (علیہ السلام) بنی ادوم میں سے ہیں اور ان کا زمانہ ۱۱۰۰ ق م اور ۱۰۰۰ ق م کے درمیان ہے۔ چنانچہ ارض القرآن میں ہے:

"یہ مسئلہ کہ حضرت ایوب ایک ادومی عرب تھے، خود سفر ایوب سے ثابت ہے: عوص کی سرزمین میں ایک مرد صالح، راست گو، خدا سے ڈرنے والا اور بدی سے دور تھا (۱-۱)[3]

عوص توراۃ میں دو آدمیوں کا نام ہے، ایک تو نہایت قدیم عوص بن ارم بن سام بن نوح (تکوین ۳۶-۲۹) باتفاق اہلِ کتاب اس سے عوص ثانی مراد ہے، عوص کے بنی ادومی عرب ہونے پر ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ سفر ایوب میں رفقائے ایوب کے جو مسکن بتائے ہیں وہ تیمن، نعمان اور شوحان ہیں (۲-۱۱) اول کے متعلق تو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ مملکتِ ادوم کا ایک مشہور شہر تھا (تکوین ۳۶-۳۵) الخ

زمانہ کے متعلق بھی فیصلہ اس لیے آسان ہے کہ "کلدان" (ایوب ۱-۱۷) اور سبا (ایوب ۱-۱۵) کا اس پر ذکر معاصرت ہے۔ سبا کا عروج ۱۱۰۰ ق م ۸۰۰ ق م تک ہے، اس لیے ان دونوں زمانوں کے حدود میں کہیں حضرت ایوب کا عہد قرار دینا چاہیے۔[4]

یہ عجیب بات ہے کہ زمانہ کے تعین میں دونوں حضرات سبا اور کلدانیوں (بابلیوں) کی معاصرت کی سند پیش فرماتے ہیں۔ مگر نتیجہ جدا جدا نکالتے اور ایک دوسرے کے متضاد فیصلہ دیتے ہیں۔

---

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۲۶ [2] قصص الانبیاء ص ۴۱۵ [3] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۲ [4] ایضاً ص ۳۶۔

سید سلیمان صاحب کی تائید مشہور مؤرخ یعقوبی کے قول سے ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے:

یوباب ھو ایوب بن زارح الصدیق　　یوباب ہی ایوب صدیق بن زارح ہیں۔

ان تفصیلات کے بعد ہمارا خیال یہ ہے کہ بے شبہ یہ صحیح ہے کہ یوباب ہی ایوب علیہ السلام ہیں اور راجح یہی ہے کہ بنی یقطان میں سے نہیں بلکہ بنی ادوم میں سے ہیں۔

عہد ایوب (علیہ السلام) | البتہ زمانہ کے متعلق سید صاحب کی تحقیق صحیح نہیں ہے اور اُن کا یہ فرمانا کہ ایوب (علیہ السلام) کا عہد ۱۰۰۰ ق م سے ۸۰۰ ق م کے درمیان ہے غیر تحقیقی ہے بلکہ صحیح اور تحقیقی بات یہ ہے کہ ایوب (علیہ السلام) کا زمانہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت اسحٰق و یعقوب (علیہما السلام) کے زمانہ کے درمیان ہے اور تقریباً ۱۵۰۰ ق م اور ۱۳۰۰ ق م کے حدود میں تلاش کرنا چاہیے۔

ہماری یہ تحقیق چند اہم قرائن پر مبنی ہے اور جو اس درجہ واضح ہیں کہ اگر اُن کو دلائل بھی کہہ دیا جائے تو بے جا نہیں ہے۔

(۱) پہلا قرینہ یہ ہے کہ بالاتفاق محققین توراۃ کے نزدیک صحیفۂ ایوب (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے قبل زمانہ کا ہے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اُس کو قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا ہے اور یہ کہ مجموعۂ تورات میں سب سے قدیم صحیفہ سفرِ ایوب ہے۔

(۲) جن مؤرخین نے ایوب (علیہ السلام) کو بنی ادوم میں سے بتایا ہے وہ بھی ادوم (عیسو یا عیص) اور اُن کے درمیان دو واسطوں سے زیادہ بیان نہیں کرتے یعنی ایوب بن زراح (زارح) بن موص (عوص) بن عیصو (عیسو)[1]

(۳) یہی مورخین حضرت ایوب (علیہ السلام) کا سلسلۂ نسب بیان کرتے ہوئے جب مادری سلسلہ پر آتے ہیں تو لوط (علیہ السلام) کی صاحبزادی سے لے کر صاحبزادگان تک حضرت یوسف علیہ السلام کی صاحبزادیوں کے ذکر کے نیچے نہیں اُترتے مثلاً ابن عساکر

---

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۲۶۔

کہتے ہیں کہ وہ بنتِ لوطؑ (علیہ السلام) کے صاجزادے ہیں اور قاضی بیضاوی[1] نقل کرتے ہیں کہ وہ لیاؑ بنت یعقوب (علیہ السلام) یا ماخیر بنت میشا بن یوسف (علیہ السلام) یا رحمت بنت افرائیم بن یوسف (علیہ السلام) کے صاجزادے[2] ہیں۔

(۴) سید صاحب نے عوض کا جو نسب نامہ نقل کیا ہے اس کے پیشِ نظر بھی حضرت ایوب (علیہ السلام) کا نسب نامہ اس طرح بغیر کسی جرح و تنقید کے صحیح ہو سکتا ہے یعنی یوباب (ایوب) بن زارح بن عوض بن دیسان بن عیسو بن اسحٰق (علیہ السلام) اور اس سلسلہ میں اگرچہ عام مؤرخین کے بیان کردہ نسب نامہ سے صرف ایک نام دیسان کا اضافہ ہوتا ہے تاہم اس سے یہ فرق نہیں پڑتا کہ ان کا زمانہ پیچھے ہٹ کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ سے بھی بعد ہو جائے اور ۱۵۰۰ق م اور ۱۳۰۰ق م کے درمیان پہنچ جائے۔

مسطورۂ بالا قرائن یا دلائل میں سے پہلا قرینہ بہت مضبوط اور تاریخی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ محققینِ توراۃ نے تاریخی روشنی ہی میں یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ سفرِ ایوب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے عہد سے قبل زمانہ کا ہے اور اس لیے یہ قرینہ نہیں بلکہ زبردست دلیل ہے اور دوسرا اور تیسرا قرینہ اگرچہ ناموں کے تعین کے لحاظ سے قابلِ بحث ہو سکتا ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ تورات اور تاریخی نقول کا سلسلۂ نسب کے متعلق یہ بیان کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کے نواسہ یا حضرت لوطؑ (علیہ السلام) کے نواسہ ہیں محض اتفاقی نہیں ہے بلکہ کسی حقیقت پر مبنی ہے۔ اور چوتھا قرینہ بھی یہ واضح کرتا ہے کہ حضرت ایوب کا زمانہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے قبل ہونا چاہیے اور وہ ۱۵۰۰ق م اور ۱۳۰۰ق م کے درمیان ہو سکتا ہے۔ امام بخاری کی بھی غالباً یہی تحقیق ہے اسی لیے انھوں نے کتاب الانبیاء میں انبیاء علیہم السلام کے متعلق جو ترتیب قائم کی ہے اس میں حضرت ایوب کا ذکر حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے قبل کیا ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ ایوب (علیہ السلام) کے سلسلۂ نسب میں تورات کے ناموں اور مؤرخینِ عرب

[1] بیضاوی سورۂ انبیاء۔ [2] ایضاً سورۂ ص۔

کے ناموں میں کچھ اختلاف ہے لیکن بنظرِ تحقیق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ ناموں کے متعلق اس قسم کا اختلاف ہے جو عموماً مختلف زبانوں میں منتقل ہونے کی وجہ سے کتابت کی تصحیف وتبدیل کی شکل میں پیش آتا رہتا ہے یعنی تورات کا عوض اور عرب مؤرخین کا موص، اور اسی طرح تورات کا زارح اور مؤرخین کا زراح دونوں ایک ہی ہیں البتہ جن بعض مؤرخین نے موص یا اموص کو ایوب اور زراح (زارح) کے درمیان بیان کردیا ہے وہ صحیح نہیں ہے، حافظ ابن حجرؒ نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ بعض حضرات نے ایوب (علیہ السلام) کا نسب بیان کرتے ہوئے روم بن عیص کہہ کر ان کو بنی روم سے بتایا ہے' یہ قطعاً بے اصل ہے۔

حضرت ایوب اور علماء یہود و نصاریٰ

حضرت ایوب کے بارہ میں صحیح تحقیق کے بعد یہ حقیقت بھی واضح رہنا چاہیے کہ ایوب (علیہ السلام) کے متعلق علماء یہود و نصاریٰ کے درمیان سخت اختلاف ہے' ان میں سے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ یہ فرضی نام ہے اور ایوب کسی شخصیت کا نام نہیں ہے مثلاً ربی حمانی دیز، میکائیس، سملر، استیان اسی کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اس شخصیت سے متعلق جس قدر واقعات منسوب ہیں سب باطل اور فرضی ہیں گویا ان کے نزدیک سفرِ ایوب اگرچہ تاریخی اعتبار سے قدیم صحیفہ ہے مگر فرضی ہے اور کانٹ اور انٹل وغیرہ کہتے ہیں کہ ایوب (علیہ السلام) ایک حقیقی شخصیت کا نام ہے اور اس سے منسوب "صحیفہ" کو فرضی اور باطل کہنا خود باطل ہے[1]۔

مگر شخصیت تسلیم کرنے کے باوجود پھر تعینِ زمانہ کے متعلق ان کے درمیان بھی سخت اختلاف ہے اور مؤرخینِ عرب کے درمیان بھی اختلاف ہے جو نقشۂ ذیل سے معلوم ہوسکتا ہے:

شمار	نام	قول مختار
(۱)	بستانی	۔۔۔ قبل از عہد ابراہیم (علیہ السلام)

---

[1] قصص الانبیاء للنجار۔ ص ۴۱۵ - ۴۱۶۔

قول مختار	نام	شمار
قریب بعہدِ ابراہیمی	ابن عساکر	(۲)
معاصر یعقوب (علیہ السلام)	کانٹ	(۳)
معاصر موسیٰ (علیہ السلام)	اٹل	(۴)
بعد زمانۂ شعیب (علیہ السلام)	طبری	(۵)
معاصر سلیمان (علیہ السلام)	×	(۶)
بعد سلیمان (علیہ السلام)	ابن خیثمہ	(۷)
اسرائیلی مگر زمانہ نامعلوم	ابن اسحٰق	(۸)
معاصر بخت نصر (بنی کدرزر)	×	(۹)
معاصر زمانہ قضاۃ بنی اسرائیل	×	(۱۰)
معاصر اردشیر شاہِ ایران	×	(۱۱)

غرض حضرت ایوب (علیہ السلام) کی شخصیت کو جب تاریخ کی روشنی میں زیر بحث لایا جاتا ہے تو یقینی طور پر حسب ذیل نتائج ظاہر ہوتے ہیں:

(۱) حضرت ایوب (علیہ السلام) عرب ہیں اور تمام مختلف اقوال میں بھی اُن کے عرب ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔

(۲) مجموعۂ تورات میں سے صحیفۂ ایوب قدیم صحیفہ ہے اور عبرانی میں عربی سے نقل ہو کر آیا ہے۔

(۳) حضرت ایوب (علیہ السلام) بنی ادوم میں سے ہیں۔

(۴) ان کا عہد حضرت یعقوب (علیہ السلام) اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا درمیانی عہد ہے۔

قرآن عزیز اور واقعۂ ایوب علیہ السلام

حضرت ایوبؑ سے متعلق مسطورۂ بالا حقائق روشن ہو جانے کے بعد اب اُس مختصر اور مجمل واقعہ کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے جو سورۂ انبیاء اور سورۂ

صٓ میں مذکور ہے۔

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ	اور ایوب (کا معاملہ بھی یاد کرو) جب اُس نے اپنے پروردگار
مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ	کو پکارا تھا: میں دُکھ میں پڑ گیا ہوں اور خدایا! تجھ سے بڑھ کر
الرّٰحِمِيْنَ ۚۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ	رحم کرنے والا کوئی نہیں، پس ہم نے اُس کی دعا
فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ	قبول کرلی اور اُس کا دکھ دور کردیا اور اس کو اس کا کنبہ
اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ	اور اس کی مثل اور اس کے ساتھ اپنی رحمت سے اور
رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى	اپنے عبادت گزار بندوں کی نصیحت کے لیے
لِلْعٰبِدِيْنَ ۝ (انبیاء پ۱۷ ع۶)	عطا کردیا۔
وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى	اور یاد کر ہمارے بندہ ایوب (کے معاملہ) کو جب اُس نے
رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ	اپنے پروردگار کو پکارا تھا کہ مجھ کو شیطان نے ایذا اور تکلیف
وَّعَذَابٍ ۝ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا	کے ساتھ ہاتھ لگایا ہے (تب ہم نے اُس سے کہا) اپنے پاؤں
مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ۝ وَ	سے ٹھوکر مار (اُس نے ایسا ہی کیا، اور چشمہ زمین سے اُبل
وَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ	پڑا تو ہم نے کہا) یہ ہے نہانے کی جگہ ٹھنڈی اور پینے کی
مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِى	اور ہم نے اُس کو اُس کے اہل (وعیال) عطا کیے اور اُن
الْاَلْبَابِ ۝ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا	کی مانند اور زیادہ اپنی مہربانی سے اور یادگار بننے کیلیے
فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ۭ اِنَّا	عقلمندوں کے لیے، اور اپنے ہاتھ میں سینکوں کا مٹھا
وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ	لے اور اس سے مار اور اپنی قسم میں جھوٹا نہ ہو بے شک
اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝	ہم نے اس کو صبر کرنے والا پایا (اور وہ اچھا بندہ ہے)
(صٓ پ۲۳ ع۴)	بے شبہ وہ (خدا کی جانب) بہت رجوع ہونے والا ہے۔

ان آیات میں حضرت ایوب (علیہ السلام) کے واقعہ کو اگرچہ بہت مختصر اور سادہ طرز میں بیان کیا گیا لیکن بلاغت و معانی کے لحاظ سے واقعات کے جس قدر بھی صحیح اور اہم اجزا

تھے اُن کو ایسے اعجاز کے ساتھ ادا کیا گیا ہے کہ سفرِ ایوب کے ضخیم اور طویل صحیفہ میں بھی وہ بات نظر نہیں آتی۔

ایک پاک اور مقدس انسان ہے جو خدائے تعالیٰ کے یہاں انبیاء و رُسل کی جماعت میں شامل ہے اور اس کا نام ایوب ہے "وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ" وہ دولت و ثروت اور کثرتِ اہل و عیال کے لحاظ سے بھی بہت خوش بخت اور فیروزمند تھا۔ مگر یکایک امتحان و آزمائش میں آگیا اور متاع و مال، اہل و عیال اور جسم و جان سب کو مصیبت نے آگھیرا۔ مال و منال برباد ہوا۔ اہل و عیال ہلاک ہوئے اور جسم و جان کو سخت روگ لگ گیا تب بھی اس نے نہ شکوہ کیا اور نہ شکایت بلکہ صبر و شکر کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی جناب میں صرف عرضِ حال کر دیا: "إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ"

پاسِ ادب کا یہ عالم ہے کہ یہ نہیں کہا: "تو نے مصیبت میں ڈال دیا" کیونکہ اس کو علم ہے کہ تکلیف و عذاب گو خدا ہی کی مخلوق ہیں، مگر شیطانی اسباب پر ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لیے یہ کہا "شیطان نے مجھ کو تکلیف و عذاب کے ساتھ چھو دیا" اور پھر عرضِ حال کیلیے نہایت عجیب و لطیف اور بلیغ پیرایۂ بیان اختیار کیا کہ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ خدایا مجھ کو مصیبت نے آگھیرا ہے "وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ" "اور تو مہربانوں میں سب سے بڑا مہربان ہے" اور جب اس نے پکارا تو خدا نے سنا اور قبول کیا۔ جو مال و متاع برباد ہوا اور جو اہل و عیال ہلاک ہوئے خدا نے اس سے چند در چند اور زیادہ اس کو بخش دیے اور صحت و تندرستی کے لیے چشمہ جاری کر دیا کہ غسل کر کے چنگا ہو جائے أُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هَٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ، فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِن ضُرٍّ وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ "رحمت" اس کا ذاتی وصف ہے وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ اور تاکہ اہلِ بصیرت اور فرمانبردار بندے اس سے نصیحت و عبرت حاصل کریں "رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَذِكْرَىٰ

لِلْعٰبِدِیْنَ" "رَحْمَۃً مِّنَّا وَ ذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ" اور پھر حضرت ایّوب کے صبر و عبودیت کی تعریف کرتے ہوئے اُس نے یہ کہہ کر اُن کی عظمت کو چار چاند لگا دیے: "اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ" اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم نے ایّوب کو بڑا ہی صابر پایا وہ بہت ہی اچھا بندہ اور ہماری جانب رجوع ہونے والا ہے۔

اِن چار پانچ آیات میں حضرت ایّوب کے جس واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے اس کے اعجاز کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان ہی واقعات کو بیان کرنے میں سفرِ ایّوب کے طویل بیالیس ابواب اور کئی سو آیات نے جگہ لی ہے۔

چند تفسیری حقائق	اس مقام پر چند تفسیری حقائق کا بیان کر دینا بھی ضروری ہے جو ایّوب (علیہ السلام) کے واقعہ سے خاص تعلق رکھتے ہیں:-

(۱) اسرائیلی روایات میں حضرت ایّوب کے مرض کے متعلق مبالغہ آمیز روایات درج ہیں اور ان میں ایسے امراض کا انتساب کیا گیا ہے جو باعثِ نفرت سمجھے جاتے اور جن کی وجہ سے مریض انسان سے ... سمجھا جاتا ہے، مثلاً جذام یا پھوڑے پھنسیوں کا اس حد تک پہنچ جانا کہ بدن گل سڑ جائے اور بدبو سے نفرت پیدا ہونے لگے۔ ان روایات کو نقل کرنے کے بعد بعض مفسرین نے یہ اشکال پیدا کیا کہ نبی کو ایسا مرض لاحق نہیں ہوتا جو انسانوں کی نگاہوں میں باعثِ نفرت ہو اور اس کی وجہ سے وہ مریض سے دُور بھاگتے ہوں اس لیے کہ یہ نبوت کے مقصدِ تبلیغ و ارشاد کے منافی ہے اور رشد و ہدایت کے لیے رکاوٹ کا باعث اور پھر اس کے دو جواب دیے۔ ایک یہ کہ شاید حضرت ایّوب کو یہ مرض نبوت سے پہلے لاحق ہوا ہو، اور مصیبت و آزمائش پر صبر و شکر کے بعد جب اُن کو شفا عطا ہوئی تب منصبِ نبوت سے سرفراز کیا گیا ہو اور دوسرا جواب یہ کہ اسرائیلی روایات غیر مستند اور مبالغہ آمیز ہیں اور قرآنِ عزیز اور احادیثِ رسول میں اس کے متعلق کوئی تفصیل موجود نہیں ہے لہٰذا نہ اشکال پیدا ہوتا ہے اور نہ اُس کے جواب کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

محققین کی رائے یہی ہے اور یہی صحیح اور درست ہے اور جبکہ قرآنِ عزیز نے مرض کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی اور تمام ذخیرۂ حدیث اس کے ذکر سے خالی ہے تو اسرائیلی روایات پر بحث قائم کرنا فضول اور لغو ہے۔

(۲) مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ سے کیا مُراد ہے؟ اسرائیلی روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایوب (علیہ السلام) کو آزمانے کے لیے اُن کے مال و منال، اہل و عیال حتیٰ کہ ان کے جسم پر بھی شیطان کو قابو دے دیا تھا۔

اور محققین کہتے ہیں کہ ایوب (علیہ السلام) نے یہ بات پاسِ ادب کے طور پر فرمائی اس لیے کہ یہ حقیقت ہے کہ خدا کی جانب سے تو خیر ہی خیر ہے اور جس شے کو ہم شر کہتے ہیں وہ ہماری نسبت سے شر ہے، ورنہ کائنات کے مجموعی مصالح کے لحاظ سے غور کرو گے تو اُس کو بھی خیر ہی ماننا پڑیگا، ہماری زندگی اور ہمارے اعمال کی نسبتیں بعض چیزوں کو شر بنا دیتی ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ بھی خیر ہی ہوتی ہیں، چنانچہ اسی حقیقت کے اظہار کے لیے متقین کا یہ طریقہ ہے کہ جب اُن کو بھلائی پہنچتی ہے تو وہ اس کی نسبت خدائے تعالیٰ کی جانب کرتے ہیں اور جب اُن پر کوئی بُرائی حملہ کرتی ہے تو وہ اس کو اپنے نفس کی جانب منسوب کر لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ عزیز میں ایک جگہ اس مضمون کو اس طرح ادا کیا گیا ہے:

"مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ"

یہی حضراتِ کرام دوسری توجیہ یہ کرتے ہیں کہ سورۂ انبیاء میں حضرت ایوب کا جو مقولہ بیان کیا گیا ہے "رَبِّ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ" تو اس سے وہ مرض مراد ہے جو ایوب (علیہ السلام) کو لاحق تھا اور سورۂ صٓ کی اس آیت میں شیطان کی ایذاء (نُصب) اور عذاب سے وہ وساوس و ہموم مراد ہیں جو اس کی جانب سے اُن پر ہجوم کرتے اور آئی ہوئی مصیبت کی وجہ سے خدائے تعالیٰ کی ناشکر گزاری اور جزع و فزع پر آمادہ کرنے کے لیے حملہ آور ہوتے رہتے تھے اور حضرت ایوب (علیہ السلام) کے صبر و استقامت اور انابۃ الی اللہ کے پاک

جذبات کو ٹھیس لگا کر ان کی روحانی اذیت و تکلیف کا باعث ہوتے اور حضرت ایوب کے جسمانی مرض کے مقابلہ میں بہت زیادہ پریشان کن بنتے رہتے تھے۔

(۳) آیت وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ میں اہل و عیال کی عطاء کا جو ذکر آیا ہے کیا اس سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایوب (علیہ السلام) کی صحت کے بعد اُن کے ہلاک شدہ اہل و عیال کی جگہ پہلے سے زیادہ اُن کے اہل و عیال میں اضافہ کر دیا اور جو اہلِ خاندان منتشر ہو گئے تھے اُن کو دوبارہ اُن کے پاس جمع کر دیا۔ یا یہ مقصد ہے کہ ہلاک شدگان کو بھی حیاتِ تازہ بخش دی اور مزید عطا کر دیے، ابن کثیرؒ نے حسنؒ اور قتادہؒ سے یہی دوسرے معنی نقل[1] کیے ہیں اور شاہ عبد القادر صاحب (نور اللہ مرقدہٗ) کی بھی یہی رائے ہے[2] اور امام رازی و ابن حیانؒ کا رجحان پہلے معنی کی جانب ہے اور آیت میں دونوں معنی کی گنجائش ہے۔

(۴) سورۂ صٓ میں ہے وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ "اور اپنے ہاتھ میں سینکوں کا مٹھا لے پھر اس سے مار اور قسم میں جھوٹا نہ ہو۔ تو یہ کس واقعہ کی جانب اشارہ ہے؟ قرآنِ عزیز اور احادیث صحیح میں تو اس کی کوئی تفصیل مذکور نہیں، البتہ مفسرین یہ کہتے ہیں کہ ایوب (علیہ السلام) کی ہر قسم کی بربادی کے بعد جب ان کی بیوی کے علاوہ کوئی اُن کا غمگسار باقی نہ رہا تو وہ نیک بی بی ہر وقت ایوب (علیہ السلام) کی تیمارداری میں مشغول اور دُکھ درد کی شریک رہتی تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے حضرت ایوبؑ کی انتہائی تکلیف سے بے چین ہو کر کچھ ایسے کلمات کہہ دیے جو صبرِ ایوبی کو ٹھیس پہنچانے والے اور خدائے تعالیٰ کی جناب میں شکوہ کا پہلو لیے ہوئے تھے۔ ایوب (علیہ السلام) اس کو برداشت نہ کر سکے اور قسم کھا کر فرمایا کہ میں تجھ کو سو کوڑے لگاؤں گا۔ جب حضرت ایوب علیہ السلام کی مدتِ امتحان ختم ہو گئی اور وہ صحت یاب ہوئے تو قسم پوری کرنے کا سوال سامنے آیا۔ ایک جانب رفیقۂ حیات کی انتہائی وفاداری، غمخواری اور حسنِ خدمت کا معاملہ اور دوسری جانب قسم کو سچا اور پورا کرنے کا سوال،

---

[1] ابن کثیر سورۂ صٓ [2] موضح القرآن سورۂ صٓ۔

ایوب (علیہ السلام) سخت تردد میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے نیک بی بی کی نیکی اور شوہر کے ساتھ وفاداری کا یہ صلہ دیا کہ ایوب (علیہ السلام) کو حکم ہوا کہ وہ سو تنکوں کا ایک مٹھا بنائیں اور اُس سے اپنی رفیقۂ حیات کو ماریں اس طرح آپ کی قسم پوری ہو جائے گی۔

(۵) سورۂ ص میں ہے "اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ"

ابن کثیرؒ نے اس کی تفسیر میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایوب اپنی جگہ سے اٹھو اور زمین پر ٹھوکر مارو۔ ایوب (علیہ السلام) نے ارشادِ باری کی تعمیل کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک چشمہ جاری کر دیا جس میں انھوں نے غسل کیا اور جسم کا ظاہری روگ سب جاتا رہا اس کے بعد اُنھوں نے پھر ٹھوکر ماری اور دوسرا چشمہ اُبل پڑا اور انھوں نے اُس کا پانی پیا اور اس سے جسم کے باطنی حصّہ میں مرض کا جو اثر تھا اس کا بھی قلع قمع ہو گیا اور اس طرح وہ چنگے ہو کر شکرِ خدا بجا لائے[1]

حافظ ابن حجرؒ نے بہ واسطہ ابن جریر، قتادہ سے بھی اسی قسم کا قول نقل کیا ہے[2]

چشمہ ایک تھا یا دو اس بحث سے قطع نظر، اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب (علیہ السلام) کے لیے صحت کا جو طریقہ اختیار فرمایا وہ فطری طریقہ ہے۔ آج بھی ایسے معدنی چشمے اُس نے کائناتِ انسانی کے فائدے کی خاطر ظاہر کر رکھے ہیں جن میں غسل کرنے اور اُن کا پانی پینے سے بہت سے امراض کم ہو جاتے یا دُور ہو جاتے ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ ایسے چشمے کا ظہور ایوب (علیہ السلام) کے لیے اعجاز کی صورت میں ہوا اور عام حالات میں اسباب کے ماتحت ہوا کرتا ہے۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ حضرت ایوبؑ غسل فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے سونے کی چند ٹڈیاں اُن پر برسائیں ایوب (علیہ السلام) نے اُن کو دیکھا تو مٹھی بھر کر کپڑے میں رکھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ایوب

---

[1] تفسیر سورۂ ص [2] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۲۶۔

(علیہ السلام) کو پکارا: ایوب: کیا ہم نے تم کو یہ سب کچھ دھن دولت دے کر غنی نہیں بنا دیا، پھر یہ کیا؟ ایوب (علیہ السلام) نے عرض کیا: پروردگار! یہ صحیح اور درست مگر تیری نعمتوں اور برکتوں سے کب کوئی بے پرواہ ہو سکتا ہے۔ ولکن لا غنیٰ عن برکتک [1]

اس روایت کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں کہ امام بخاری کی اپنی شرط کے مطابق حضرت ایوب کے واقعہ سے متعلق کوئی خبر ثابت نہیں ہو سکی اس لیے صرف مسطورۂ بالا روایت ہی پر انھوں نے اکتفا کیا۔ اس لیے کہ وہ ان کی شرط کے مطابق صحیح ہے اس کے بعد حافظ ابن حجر اپنی جانب سے فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں اگر کوئی روایت صحت کو پہنچ سکی ہے تو وہ حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کا ایک اثر ہے جس کو ابن ابی حاتم اور ابن جریج نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے اور وہ روایت اس طرح ہے:-

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایوب (علیہ السلام) تیرہ سال تک مصائب کے امتحان میں مبتلا رہے حتیٰ کہ اُن کے تمام عزیز و اقارب اور قریب و بعید کے متعارف سب ہی نے اُن سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ البتہ اعزہ میں سے اُن کے دو عزیز ضرور صبح و شام اُن کے پاس آتے رہے۔ ایک مرتبہ اُن میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ایوب (علیہ السلام) نے کوئی بہت ہی بڑا گناہ کیا ہے تب ہی تو وہ اس کی پاداش میں ایسی سخت مصیبت کے اندر مبتلا ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو خدا ان پر مہربان نہ ہو جاتا اور ان کو شفا نہ ہو جاتی؟ یہ بات دوسرے نے حضرت ایوبؑ سے کہہ سُنائی۔ ایوب (علیہ السلام) یہ سُن کر بہت بے چین اور مضطرب ہو گئے اور خدائے تعالیٰ کی درگاہ میں سربسجود ہو کر دعاگو ہوئے اس کے فوراً بعد ہی ایوب (علیہ السلام) رفعِ حاجت کے لیے جگہ سے اُٹھے اور انکی بیوی ان کا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں، جب فارغ ہو گئے اور وہاں سے علیحدہ ہوئے تو خدا کی وحی نازل ہوئی کہ زمین پر پاؤں سے ٹھوکر مارو، اور جب انھوں نے ٹھوکر ماری تو پانی کا چشمہ اُبل پڑا اور

[1] بخاری کتاب الانبیاء۔

انھوں نے غسلِ صحت کیا اور پہلے سے زیادہ صحیح و تندرست نظر آنے لگے۔ یہاں بیوی انتظار کر رہی تھیں کہ ایوب (علیہ السلام) تازگی اور شگفتگی کے ساتھ سامنے نظر آئے وہ قطعاً نہ پہچان سکیں اور ایوب علیہ السلام کے متعلق ان ہی سے دریافت کرنے لگیں۔ تب آپ نے فرمایا، میں ہی ایوب ہوں اور خدا کے فضل و کرم کا واقعہ سنایا۔ روزمرہ کے کھانے کے لیے ایوب (علیہ السلام) کے پاس ایک گٹھری گیہوں کی اور ایک جو کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دولت میں اضافہ کرنے کے لیے گیہوں کو سونے اور جَو کو چاندی سے بدل دیا[1]۔

قریب قریب اسی قسم کا واقعہ ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی روایت کیا[2] ہے، اور مدتِ مصیبت کے متعلق وہب بن منبہ تین سال بیان کرتے ہیں، اور حسن سے سات سال منقول ہیں[3]۔

سِفرِ ایوب | ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کی روایات کا ماخذ سِفرِ ایوب سے منقول اسرائیلی روایات ہیں اس لیے کہ اس صحیفہ میں ہی ایوب (علیہ السلام) کے متعلق یہ دو باتیں خصوصیت سے درج ہیں جن کا ذکر قرآنِ عزیز میں موجود نہیں ہے ایک یہ کہ حضرت ایوبؑ کے چند دوستوں نے اُن سے کہا تھا کہ تو نے کوئی سخت گناہ کیا ہے تب ہی اس مصیبت میں مبتلا ہوا، دوسری یہ کہ حضرت ایوبؑ نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور ان سے مناظرہ کیا، یہ مناظرہ بہت طویل ہے اور صحیفہ کے اکثر ابواب اسی سے متعلق ہیں اور جب دونوں دوستوں نے کسی طرح یقین نہ کیا تب بے چین و مضطرب ہو کر ایوب علیہ السلام نے خدا کی درگاہ میں دعا کی کہ اُن کی صداقت ظاہر کرا اور شفایاب کر دے۔ چنانچہ سِفرِ ایوب میں ہے:-

> تب تیمنی الیفز نے جواب دیا اور کہا: اگر ہم تجھ سے ایک بات کہیں تو کیا تو ناراض ہوگا......
> یاد کیجیو، کیا کوئی بے گناہ ہوتے ہوئے بھی کبھی ہلاک ہوا اور کہاں صادق مارے گئے[4]

---

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۲۶ [2] ایضاً ص ۳۲۷ [3] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۱۸۸ [4] باب ۴ آیات ۱-۷

تب ضوفر نعماتی نے جواب دیا اور کہا: کیا طول کلام کا جواب نہ دیا جائے اور کیا کوئی شخص اپنی زیادہ گوئی سے بے گناہ ٹھہرے؟...... جان رکھ کہ خدا نے تیری بدکاری کا بہت ہی کم بدلہ لیا ہے کیا تو اپنی تلاش سے خدا کا بھید پا سکتا ہے[1]

حضرت ایوبؑ نے اپنے ان دوستوں کے اس الزام کو تسلیم نہیں کیا اور مناظرہ میں اُن کو بتایا کہ میں بے گناہ ہوں اور یہ مصیبت خدا کی جانب سے ایک امتحان ہے اور ہم اس کی حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کے کلام کی تصدیق کی اور اُن کے دوستوں کو قصوروار ٹھہرایا۔

اور ایسا ہوا کہ جب خداوند ایوب سے یہ باتیں کہہ چکا تو خداوند نے الیفز تیمنی سے کہا کہ میرا غضب تجھ پر اور تیرے دونوں دوستوں پر بھڑکا ہے، کیونکہ تم نے میری بابت حق باتیں نہیں کہیں، جیسی میرے بندے ایوب نے کہی ہیں[2]

سفرِ ایوب نے حضرت ایوبؑ کے ان دوستوں کے نام یہ بتائے ہیں: تیمنی، الیفر سوخی، بلدو، نعماتی ضوفر۔ اور محققینِ تورات کا یہ دعویٰ ہے کہ سفرِ ایوب قدیم عربی زبان کی غیر غنائی شاعری کا بے نظیر شاہکار ہے اور یہ کہ دنیا کی قدیم ترین نظم سفرِ ایوب ہے، اور تاریخی اعتبار سے صرف رگ وید اس کا معارضہ کر سکتا ہے جب کہ اس کی تصنیف کے زمانہ سے متعلق وہ مذہب تسلیم کر لیا جائے جو رگ وید کو سنہ ۱۵۰۰ ق‌م یا اس سے بھی پیچھے لیجانا چاہتا ہے[3]

وفات | سفرِ ایوب میں ہے کہ ابتلاء سے نجات پانے کے بعد ایوب (علیہ السلام) ایک سو چالیس سال زندہ رہ کر انتقال کر گئے:

بعد اس کے ایوب ایک سو چالیس برس جیا اور اپنے بیٹے اور اپنے بیٹوں کے بیٹے چار پشت تک دیکھے اور ایوب بوڑھا اور دراز عمر ہو کے مر گیا[4]

بصائر | حضرت ایوب (علیہ السلام) کے واقعہ میں صبر و ضبط، استقلال و استقامت اور

---

[1] باب ۱۱۔ آیات ۱۔۶ [2] باب ۴۲۔ آیات ۷ [3] تفسیر ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۸۸ [4] باب ۴۲ آیات ۱۶-۱۷۔

2

مصائب وبلایا میں شکر وسپاس گزاری کے جو اسرار اور حکمتیں موجود ہیں وہ اہلِ بصیرت کے لیے درسِ عبرت ہیں اُن میں سے چند مسطورۂ ذیل ہیں :

(۱) بندگانِ خدا میں سے جس کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ جس قدر تقرب حاصل ہوتا ہے اُسی نسبت سے وہ بَلایا و مصائب کی بھٹی میں زیادہ تپایا جاتا ہے اور جب وہ اُن کے پیشِ آنے پر صبر و استقامت سے کام لیتا ہے تو وہی مصائب اس کے درجاتِ تقرب کی رفعت و بلندی کے سبب بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے :۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشدُّ الناسِ بلاءً الانبیاءُ ثم الصالحون ثم الامثل فالامثل[۱] (الحدیث)	مصائب میں سب سے زیادہ سخت امتحان انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد صلحاء کا نمبر ہے اور پھر حسب مراتب و درجات۔
قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یبتلی الرجل علی قدر دینه فان کان فی دینه صلابة زید فی بلائه[۲] (الحدیث)	انسان اپنے دین کے درجات کے مناسب آزمایا جاتا ہے پس اگر اس کے دین میں پختگی اور مضبوطی ہے تو وہ مصیبت کی آزمائش میں بھی دوسروں سے زیادہ ہوگا۔

(۲) وجاہت و عزت، دولت و ثروت اور خوشحالی و رفاہیت کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری اور احسان شناسی کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے اور اگر رعونت و انانیت کارفرما نہیں ہے تو بہت آسان ہے لیکن مصیبت و بلاء، رنج و محن اور عسرت و تنگ حالی میں رضا بقضاء رہ کر حرفِ شکایت تک زبان پر نہ لانا اور صبر و استقامت کا ثبوت دینا بہت مشکل اور کٹھن ہے اس لیے جب کوئی خدا کا نیک بندہ اس زبوں حالت میں ضبط و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور صبر و شکر کا مسلسل مظاہرہ کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی صفتِ

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۸۰ منقول از صحاح [۲] ایضاً

۲

"رحمت" بھی جوش میں آجاتی ہے اور ایسے شخص پر اس کے فضل وکرم کی بارش ہونے لگتی ہے اور وہ غیر متوقع طور پر بے غایت افضال واکرام سے نوازا جاتا اور دین ودنیا دونوں کی کامرانی کا حقدار بن جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ایوب (علیہ السلام) کی مثال اس کے لیے روشن شہادت ہے:-

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ۝ (الانبیاء پ ع)

(۳) انسان کو چاہیے کہ کسی حالت میں بھی خدائے تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اس لیے کہ قنوطیت کفر کا شیوہ ہے اور یہ نہ سمجھے کہ مصیبت وبلا محض گناہوں کی پاداش ہی میں وجود پذیر ہوتی ہیں بلکہ بسا اوقات آزمائش اور امتحان بن کر آتی اور صابر وشاکر کے لیے اللہ تعالیٰ کی آغوش رحمت وا کرتی ہیں۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مخاطب کرکے ارشاد فرماتا ہے:-

انا عندَ ظنِّ عبدی بی (الحدیث) میں اپنے بندہ کے گمان سے قریب ہوں یعنی بندہ میرے متعلق جس قسم کا گمان اپنے قلب میں رکھتا ہے میں اُس کے گمان کو پورا کردیتا ہوں۔

(۴) زن وشو کے تعلقات میں وفاداری اور استقامت سب سے زیادہ محبوب شے ہے اور اسی لیے ایک حدیث میں شیطانی وساوس میں سے سب سے زیادہ قبیح وسوسہ جو شیطان کو بہت ہی پیارا ہے زن وشو کے درمیان بدگمانی اور بغض وعداوت کا بیج بودینا ہے اسی لیے صحیح احادیث میں اُس عورت کو جنت کی بشارت دی گئی ہے جو اپنے شوہر کے حق میں نکوکار اور وفادار ثابت ہو اور اس وفا ومحبت کی قدر وقیمت اُس وقت بہت زیادہ ہوجاتی ہے جب شوہر مصائب وآلام میں گرفتار ہو اور اس کے اعزہ واقربا

تک اس سے کنارہ کش ہوچکے ہوں چنانچہ ایوب (علیہ السلام) کی "زوجہ مطہرہ" نے ایوب علیہ السلام کے زمانۂ مصیبت میں جس حُسنِ وفا، اطاعت، ہمدردی اور غمخواری کا ثبوت دیا، اللہ تعالیٰ نے اس کے احترام میں ایوب (علیہ السلام) کی قسم کو اُن کے حق میں پورا کرنے کے لیے عام احکامِ قسم سے جُدا ایک ایسا حکم دیا جس سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اُس نیک بی بی کی قدر و منزلت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

(۵) عیش و راحت میں تواضع و شکر اور رنج و مصیبت میں ضبط و صبر وہ ایسی بیش بہا نعمتیں ہیں کہ جس شخص کو یہ نصیب ہوجائیں وہ دین و دنیا میں کبھی ناکام نہیں رہ سکتا اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہر حالت میں اس کی رفیق رہتی ہے:-

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: "وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ" (ابراہیم پ ۱۳ ع ۲) — اور (یاد کرو) جب تمھارے رب نے تم کو آگاہ کیا اگر شکر بجالاؤ گے تو میں تمھیں (اپنی نعمتیں) اور زیادہ دوں گا۔

(وقال) وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝" — اور خوشنودی کی بشارت سنادو اُن لوگوں کو کہ جب اُن پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کا مال ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اُن کے پروردگار کی مہربانی اور رحمت ہے اور یہی سیدھے راستہ پر ہیں۔ (بقرہ پ ۲ ع ۳)



حضرتِ یونس علیہ السّلام

حضرتِ یونسؑ کا ذکر قرآنِ عزیز میں۔ حضرتِ یونس علیہ السلام کا واقعہ۔ نسب۔ زمانہ کا تعین۔ مقامِ دعوت۔ چند تفسیری مباحث۔ متنبی کاذب کی تلبیس۔ وفات۔ موعظت

حضرتِ یونسؑ کا ذکر قرآنِ عزیز میں

قرآنِ عزیز میں حضرتِ یونس (علیہ السلام) کا ذکر چھ سورتوں میں کیا گیا ہے: سورۂ نساء، انعام، یونس، الصافات، انبیاء، القلم۔ ان میں سے چار پہلی سورتوں میں نام مذکور ہے اور دو آخر کی سورتوں میں "ذوالنون" اور "صاحب الحوت" مچھلی والا کہہ کر صفت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ذیل کا نقشہ اس حقیقت کے لیے کاشف ہے:

شمار	سورۃ	آیت	عدد	شمار	سورۃ	آیت	عدد
۱	نساء	۱۶۳	۱	۴	انبیاء	۸۷، ۸۸	۲
۲	انعام	۸۶	۱	۵	الصافات	۱۳۹-۱۴۸	۱۰
۳	یونس	۹۸	۱	۶	القلم	۴۸-۵۰	۳/۱۸

یہ بھی واضح رہے کہ سورۂ نساء اور انعام میں انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں فقط نام مذکور ہے اور باقی سورتوں میں واقعات پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے اور حضرتِ یونس (علیہ السلام) کی حیاتِ طیبہ کے صرف اسی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے جو اُن کی پیغمبرانہ زندگی سے وابستہ ہے اور جس میں رُشد و ہدایت کے مختلف گوشے دعوتِ بصیرت دیتے ہیں۔

حضرتِ یونس علیہ السلام کا واقعہ

قرآنِ عزیز کی روشنی میں یونس (علیہ السلام) کا واقعہ اگرچہ مختصر اور اظہارِ واقعہ کے لحاظ سے صاف اور واضح ہے مگر بعض تفسیری مباحث نے اس کی جزئیات کو معرکۃ الآراء بنا دیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اول آیاتِ قرآنی کی روشنی

میں واقعہ کو مفصل بیان کر دیا جائے اور اس کے بعد تفسیری مباحث پر کلام کیا جائے تاکہ واقعہ کی حقیقت سمجھنے میں مدد ملے[1]۔

حضرت یونس (علیہ السلام) کی عمر مبارک اٹھائیس سال کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا۔ اور اہلِ نینویٰ کی رُشد و ہدایت کے لیے مامور کیا، یونس (علیہ السلام) ایک عرصہ تک اُن کو تبلیغ فرماتے اور توحید کی دعوت دیتے رہے مگر اُنھوں نے اعلانِ حق پر کان نہ دھرا اور تمرّد و سرکشی کے ساتھ شرک و کفر پر اصرار کیے رہے اور گزشتہ نافرمان قوموں کی طرح خدا کے سچے پیغمبر کی دعوتِ حق کا ٹھٹھا کرتے اور مذاق اُڑاتے رہے، تب مسلسل اور پیہم دشمنی اور مخالفت سے متأثر ہو کر یونس (علیہ السلام) قوم سے خفا ہو گئے اور اُن کو عذابِ الٰہی کی بد دعا کر کے اُن کے درمیان سے غضبناک روانہ ہو گئے۔

فراتؔ کے کنارے پہنچے تو ایک کشتی کو مسافروں سے بھرا ہوا تیار پایا، حضرتِ یونس (علیہ السلام) کشتی میں سوار ہوئے۔ اور کشتی نے لنگر اُٹھا دیا۔ راہ میں طوفانی ہواؤں نے کشتی کو آگھیرا، جب کشتی ڈگمگانے لگی اور اہلِ کشتی کو غرق ہونے کا یقین ہونے لگا تو اپنے عقیدہ کے مطابق کہنے لگے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشتی میں کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے۔ جب تک اس کو کشتی سے جُدا نہ کیا جائے گا نجات مشکل ہے" یونس (علیہ السلام) نے سُنا تو ان کو متنبہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو میرا نینویٰ سے وحی کا انتظار کیے بغیر اس طرح چلا آنا پسند نہیں آیا اور یہ میری آزمائش کے آثار ہیں یہ سوچ کر اُنھوں نے اہلِ کشتی سے فرمایا: وہ غلام میں ہوں جو اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے، مجھ کو کشتی سے باہر پھینک دو مگر ملّاح اور اہلِ کشتی اُنکی پاکبازی سے اس قدر متأثر تھے کہ انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور آپس میں یہ طے کیا کہ قرعہ اندازی کی جائے چنانچہ تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی اور ہر مرتبہ یونس (علیہ السلام) کے نام پر قرعہ نکلا، تب مجبور ہو کر انھوں نے یونس (علیہ السلام) کو دریا میں ڈال دیا یا وہ خود دریا میں کود گئے۔ اسی وقت خدائے تعالیٰ کے حکم سے اُن کو مچھلی نے نگل لیا، مچھلی کو حکم تھا

[1] روح المعانی سورۂ یونس والصافات [2] روح المعانی۔

کہ صرف نگل لینے کی اجازت ہے، یونس تیری غذا نہیں ہے اس لیے اس کے جسم کو مطلق گزند نہ پہنچے۔[1] یونس (علیہ السلام) نے جب مچھلی کے پیٹ میں خود کو زندہ پایا تو درگاہِ الٰہی میں اپنی اس ندامت کا اظہار کیا کہ کیوں وہ وحیِ الٰہی کا انتظار کیے اور اللہ تعالیٰ سے اجازت لیے بغیر امتِ دعوت سے ناراض ہو کر نینویٰ سے نکل آئے اور عفوِ تقصیر کیلیے اس طرح دعا گو ہوئے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ہی یکتا ہے۔ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں بے شبہ میں اپنے نفس پر خود ہی ظلم کرنے والا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے یونس (علیہ السلام) کی درد بھری آواز کو سنا اور قبول فرمایا، مچھلی کو حکم ہوا کہ یونس کو جو تیرے پاس ہماری امانت ہے" اگل دے۔ چنانچہ مچھلی نے ساحل پر یونس (علیہ السلام) کو اگل دیا، حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے اُن کا جسم ایسا ہو گیا تھا جیسا کسی پرندہ کا پیدا شدہ بچہ کہ جس کا جسم بیحد نرم ہوتا ہے[2] اور جسم پر بال تک نہیں ہوتے، غرض یونس (علیہ السلام) بہت نحیف و ناتواں حالت میں خشکی پر ڈال دیے گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے ایک بیلدار درخت اُگا دیا[3] جس کے سایہ میں وہ ایک جھونپڑی بنا کر رہنے لگے۔ چند دن کے بعد ایسا ہوا کہ حکمِ خدا سے اس بیل کی جڑ کو کیڑا لگ گیا اور اس نے جڑ کو کاٹ ڈالا جب بیل سوکھنے لگی تو یونس (علیہ السلام) کو بہت غم ہوا، تب اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اُنکو مخاطب کیا اور فرمایا: یونس! تم کو اس بیل کے سوکھنے کا بہت رنج ہوا جو ایک حقیر سی چیز ہے مگر تم نے یہ نہ سوچا کہ نینویٰ کی ایک لاکھ سے زیادہ آبادی جس میں انسان بس رہے ہیں اور ان کے علاوہ جاندار بھی آباد ہیں اس کو برباد اور ہلاک کر دینے میں ہم کو کوئی ناگواری نہیں ہو گی اور کیا ہم اُن کے لیے اس سے زیادہ شفیق و مہربان نہیں ہیں جتنا کہ تجھ کو اس بیل کے ساتھ

---

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۱ [2] تفسیر ابن کثیر الصافات [3] کہتے ہیں کہ یہ کدو کی بیل تھی۔

اُنس ہے جو تم وحی کا انتظار کیے بغیر قوم کو بددعا کر کے ان کے درمیان سے نکل آئے ایک نبی کی شان کے یہ نامناسب ہے کہ وہ قوم کے حق میں عذاب کی بددعا کرے اور نفرت کے ساتھ اُن سے جدا ہونے میں ایسی جلد بازی اختیار کرے کہ وحی کا بھی انتظار باقی نہ رہے۔[1]

ہوا یہ کہ ادھر یونس (علیہ السلام) بددعا کر کے اہلِ نینویٰ سے جُدا ہوئے اور اُدھر انھوں نے بددعا کے کچھ آثار محسوس کیے، نیز یونس (علیہ السلام) کے بستی چھوڑ دینے پر اُن کو یقین ہو گیا کہ وہ ضرور خدا کے سچے پیغمبر تھے اور اب ہلاکت یقینی ہے تب ہی تو یونس ہم سے جدا ہو گئے۔ یہ سوچ کر فوراً بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب کے دل خوف و دہشت سے کانپ اُٹھے اور یونس (علیہ السلام) کو تلاش کرنے لگے کہ اُن کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کریں اور ساتھ ہی سب خدائے تعالیٰ کی درگاہ میں توبہ و استغفار کرنے لگے اور ہر قسم کے گناہوں سے کنارہ کش ہو کر آبادی سے باہر میدان میں نکل آئے حتیٰ کہ چوپاؤں کو بھی ساتھ لے آئے اور بچوں کو ماؤں سے جدا کر دیا اور اس طرح دنیوی علائق سے کٹ کر درگاہِ الٰہی میں گریہ و زاری کرتے اور متفقہ آواز سے یہ اقرار کرتے رہے: ربنا امنا بما جاء بہ یونس (پروردگار! یونس (علیہ السلام) تیرا جو پیغام ہمارے پاس لے کر آئے تھے ہم اس کی تصدیق کرتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں) آخر کار اللہ تعالیٰ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی، اُن کو دولتِ ایمان سے نوازا اور اُن کو عذاب سے محفوظ کر دیا۔

بہر حال حضرتِ یونس (علیہ السلام) کو اب دوبارہ حکم ہوا کہ وہ نینویٰ جائیں اور قوم میں رہ کر اُن کی رہنمائی فرمائیں تاکہ خدا کی اس قدر کثیر مخلوق اُن کے فیض سے محروم نہ رہے۔ چنانچہ یونس (علیہ السلام) نے اس حکم کا امتثال کیا اور نینویٰ میں واپس تشریف لے آئے قوم نے جب اُن کو دیکھا تو بے حد مسرت و خوشی کا اظہار کیا اور اُن کی راہنمائی میں دین و دنیا کی کامرانی حاصل کرتی رہی۔

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۲۲۔

یہ ہے واقعہ کی وہ ترتیب جو آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں تاویلات سے پاک اور صحیح مفہوم کی ترجمان ہے اور بے غل وغش مختلف سورتوں کی تمام آیات کے معانی کو کسی گنجلک کے بغیر صاف صاف ادا کر دیتی ہے لیکن یہ حقیقت اچھی طرح اس وقت ظاہر ہو گی جبکہ واقعہ سے متعلق اختلافی مباحث کو زیرِ بحث لایا جائے اور پھر اس تفصیلی ترتیب کا موازنہ کیا جائے مگر اس سے قبل آیاتِ قرآنی کا مطالعہ ضروری ہے:

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ	پھر کیوں ایسا ہوا کہ قومِ یونس کی بستی کے سوا اور کوئی بستی
فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ	نہ نکلی کہ (نزولِ عذاب سے پہلے) یقین کر لیتی اور ایمان کی
يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا	برکتوں سے فائدہ اٹھاتی؟ یونس کی قوم جب ایمان لے
عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ	آئی، تو ہم نے رسوائی کا وہ عذاب اُن پر سے ٹال دیا جو دنیا
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ	کی زندگی میں پیش آنے والا تھا اور ایک خاص مدت تک
اِلٰى حِيْنٍ ۝ (یونس پ ع)	سروسامانِ زندگی سے بہرہ مند ہونے کی مہلت دے دی۔
وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ	اور ذوالنون (یونس کا معاملہ یاد کرو) جب ایسا ہوا تھا کہ وہ
مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ	(راہِ حق میں) خشمناک ہو کر چلا گیا۔ پھر اس نے خیال کیا کہ ہم
لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ	اس کو تنگی (آزمائش) میں نہیں ڈالیں گے پھر (جب اس کو
فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ	آزمائش کی تنگی نے آگھیرا تو) اس نے (مچھلی کے پیٹ میں اور
اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ	دریا کی گہرائی کی) تاریکیوں میں پکارا "خدایا تیرے سوا کوئی
سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ	معبود نہیں! تیرے لیے ہر طرح کی پاکی ہو! حقیقت یہ ہے
مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝	کہ میں نے اپنے اوپر بڑا ہی ظلم کیا۔
فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ	تب ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے غمگینی سے نجات
وَكَذٰلِكَ نُـنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝	دی اور ہم اسی طرح ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں۔
وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝	اور بیشک یونس پیغمبروں میں سے تھا (اور وہ واقعہ

اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۙ	یاد کرو) جبکہ وہ بھری ہوئی کشتی کی جانب بھاگا۔ (اور
فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ۚ	جب کشتی والوں نے غرق ہونے کے خوف سے) قرعہ
فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ۝	ڈالا تو (دریا میں) ڈالے جانے کے لیے اس کا نام نکلا پھر نگل
فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۙ	گئی اس کو مچھلی اور وہ (اللہ کے نزدیک قوم کے پاس سے بھاگ
لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ	آنے پر) قابلِ ملامت تھا پس اگر یہ بات نہ ہوتی کہ وہ خدا کی پاکی
يُبْعَثُوْنَ ۚ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ	بیان کرنیوالوں میں سے تھا تو مچھلی کے پیٹ میں قیامت تک
وَهُوَ سَقِيْمٌ ۚ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ	رہتا، پھر ڈال دیا ہم نے اس کو (مچھلی کے پیٹ سے نکال کر) چٹیل
شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ۚ	زمین میں اور وہ ناتواں اور بے حال تھا اور ہم نے اس پر (سایہ
وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ	کے لیے) ایک بیل والا درخت اگا دیا اور ہم نے اس کو ایک لاکھ
اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۚ فَاٰمَنُوْا	سے زیادہ انسانوں کی جانب پیغمبر بنا کر بھیجا پس وہ ایمان
فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝	لے آئے پھر ہم نے اُن کو ایک مدت (پیغام موت) تک
(الصافات پ۲۳ ع)	سامانِ زندگی سے نفع اٹھانے کا موقع دیا۔
فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ	پس اپنے پروردگار کے حکم کی وجہ سے صبر کو کام میں لاؤ
كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى	اور مچھلی والے (یونس) کی طرح (بے صبر) نہ ہو جاؤ جبکہ اُس
وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۚ لَوْلَآ اَنْ	نے (خدا کو) پکارا اور وہ بہت مغموم تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی
تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ	کہ اس کے پروردگار کے فضل نے اُس کو (آغوش میں) لے
لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۝	لیا تھا تو وہ ضرور چٹیل میدان میں ملامت شدہ ہو کر
فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ	پھینک دیا جاتا۔ پس اس کے پروردگار نے اس کو
الصّٰلِحِيْنَ ۝ (القلم پ۲۹ ع)	برگزیدہ کیا اور اس کو نکوکاروں میں رکھا۔

نسب مورخینِ اسلام اور اہلِ کتاب اس پر متفق ہیں کہ یونس (علیہ السلام) کے نسب سے متعلق اس سے زیادہ اور کوئی بات ثابت نہیں کہ اُن کے والد کا نام متّی[1] ہے اور بعض

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۱

لوگوں نے کہا کہ متّی حضرت یونس کی والدہ کا نام ہے مگر یہ فاحش غلطی ہے اس لیے کہ بخاری کی ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے بصراحت مذکور ہے کہ متّی والد کا نام[۱] ہے اور اہلِ کتاب یونس (علیہ السلام) کا نام یوناہ اور ان کے والد کا نام امتی بتاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یونس بن متی اور یوناہ بن امتی میں کوئی نمایاں اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ عربی اور عبری زبانوں کی لفظی تعبیر کا فرق ہے۔

زمانہ کا تعین | حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یونس (علیہ السلام) کے زمانہ کا تعین تاریخی روشنی میں مشکل ہے۔ البتہ بعض مورخین نے یہ کہا ہے کہ جب ایران (فارس) میں طوائف الملوکی کا دور تھا اُس وقت نینوی میں حضرتِ یونس کا ظہور[۲] ہوا۔

محققینِ جدید نے فارس کی حکومت کو تین عہدوں پر تقسیم کیا ہے ایک حملۂ سکندر سے قبل، دوسرا پارتھوی حکومت یعنی طوائف الملوکی، تیسرا ساسانی عہد۔

پہلا عہد، عروج وارتقاء کا عہد شمار ہوتا ہے اور اس کی ابتداء تقریباً ۵۵۹ قم سے سمجھی گئی ہے جو تقریباً ۳۳۰ قم یعنی دو صدی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا عہد تقریباً ۲۷۰ قم سے شروع ہو کر ۱۵۰ء تک پہنچتا ہے اور یہی طوائف الملوکی کا دور کہا جاتا ہے[۳] اور اس کے بعد ساسانی دورِ حکومت شروع ہو جاتا ہے۔

اس تحقیق کے پیشِ نظر حافظ ابن حجرؒ کی نقل کے مطابق یونس (علیہ السلام) کا عہد ۲۷۰ قم سے لے کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت کے درمیان ہونا چاہیے۔ مگر یہ قول تاریخی نقطۂ نظر سے غلط ہے اس لیے کہ مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ بابلیوں کے ہاتھوں آشوریوں کا یہ مشہور شہر (نینوی) ۶۱۲ قم میں تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں اہلِ کتاب کی روایات یہ شہادت دیتی ہیں کہ حضرتِ یونس (علیہ السلام) کے عہد کے بعد ۶۹۰ قم

---

[۱] بخاری کتاب الانبیاء [۲] فتح الباری جلد ۶ ص ۵۰۳ [۳] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۱۸۳۔ یہ دور اردشیر بن بابکان پر ختم ہو جاتا ہے اور اردشیر پہلا ساسانی بادشاہ ہے۔

میں جب اہلِ نینویٰ نے دوبارہ کفر و شرک اور ظلم و ستم شروع کر دیا اور ان کی سرکشی بہت بڑھ گئی۔ تب ایک اسرائیلی نبی ناحوم نے دوبارہ اُن کو سمجھایا اور ہدایت و رشد کی دعوت دی، اور جب انھوں نے کوئی پروا نہیں کی تو نینویٰ کی تباہی کی پیشین گوئی فرمائی اور اس سے ستر برس بعد ۶۱۲ ق م میں نینویٰ تباہ و برباد ہو گیا۔ لہٰذا حضرتِ یونس (علیہ السلام) کا عہد ۸۶۰ ق م سے بھی قدیم ہونا چاہیے غالباً شاہ عبد القادر (نور اللہ مرقدہٗ) کا یہ قول صحیح ہے کہ یونس (علیہ السلام) حزقیل (علیہ السلام) کے معاصر ہیں، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

حزقیل کے یاروں میں تھے یونس (علیہ السلام) بڑے شوق میں عبادت کی اور دنیا سے الگ حکم ہوا کہ ان کو بھیجو شہر نینوا میں مشرکوں کو منع کریں بُت پوجنے سے[1]

لیکن اس جگہ حزقیل کے نام میں عرب مورخین کو عام طور پر یہ مغالطہ ہوا ہے کہ وہ اس سے حزقیل بادشاہ سمجھے ہیں حالانکہ بنی اسرائیل میں اس نام کا کوئی بادشاہ نہیں گزرا اسلیے دراصل اس سے مراد مشہور پیغمبر حزقیل (علیہ السلام) ہیں۔

اس تحقیق سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ یونس (علیہ السلام) اسرائیلی پیغمبر ہیں۔

امام بخاری نے کتاب الانبیاء میں انبیاء علیہم السلام کے ذکر میں اپنی تحقیق کے مطابق جو ترتیب قائم کی ہے اُس میں یونس (علیہ السلام) کا ذکر حضرتِ موسیٰ و حضرتِ شعیب (علیہما السلام) اور حضرتِ داؤد (علیہ السلام) کے درمیان کیا ہے۔

مقامِ دعوت عراق کے مشہور و معروف مقام نینویٰ کے باشندوں کی ہدایت کے لیے اُن کا ظہور ہوا تھا۔ نینویٰ آشوری حکومت کا پایۂ تخت اور موصل کے علاقہ کا مرکزی شہر تھا۔

جس زمانہ میں یونس (علیہ السلام) نینویٰ کے باشندوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے وہ زمانہ آشوری حکومت کے عروج کا زمانہ تھا مگر ان کا طرزِ حکومت قبائلی تھا اور ہر ایک قبیلہ کا جُداجُدا حکمراں یا بادشاہ ہوتا تھا اور نینویٰ اُن قبائلی حکومتوں کے پایۂ تختوں میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا اس لیے اپنے عروج و اقبال میں مشہور تھا۔

[1] موضح القرآن سورۂ انبیاء۔

قرآنِ عزیز میں اس شہر کی مردم شماری ایک لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے، ترمذی نے بسندِ غریب ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے اس میں یہ تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی گئی ہے اور مجموعۂ تورات میں جو صحیفۂ یونس (علیہ السلام) کے نام سے موسوم ہے اس میں بھی یہی تعداد مذکور ہے مگر ابنِ عباس (رضی اللہ عنہما) سعید بن جبیر اور مکحول وغیرہ سے اَوۡ یَزِیۡدُوۡنَ کی تفسیر میں دس ہزار سے لے کر ستر ہزار تک منقول ہے۔ ہمارے نزدیک پہلا قول راجح ہے۔

چند تفسیری مباحث | سورۂ انبیاء میں ہے: "وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ" اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں بعض مفسرین یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ یونس (علیہ السلام) اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے اور وحی کا انتظار اور خدا کی مرضی معلوم کیے بغیر چلے گئے، انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ ہم اُن کی اس جلد بازی پر اُن کو آزمائش اور تنگی میں نہ ڈالیں گے" اس تفسیر کے مطابق مُغَاضِبًا کا تعلق قوم سے ہے اور "لَنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ" کے معنی لَنۡ نُّضِيۡقَ عَلَيۡهِ کے ہیں، اور قدر بمعنی ضیق (تنگی) بکثرت مستعمل ہے، جمہور کا یہی قول ہے اور ابن عباسؓ، ضحاکؒ، قتادہؒ، حسنؒ سے یہی منقول ہے اور ابن کثیرؒ اور ابن جریرؒ کا یہی مختار قول ہے۔

اور بعض مفسرین مُغَاضِبًا کی پہلی تفسیر کے ساتھ اتفاق رکھتے ہوئے "لَنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ" میں "قدر" بمعنی "تقدیر و قدرت" لیتے ہیں اور یہ معنی کرتے ہیں "یونسؑ نے سمجھا کہ ہم اُس کو نہ پکڑ سکیں گے" یہ عطیۂ عوفی کا قول ہے مگر اس تفسیر پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایسا عقیدہ تو کفر ہے، لہٰذا یہ بات جبکہ ایک مسلمان بھی نہیں سمجھ سکتا تو نبی کیسے ایسا گمان کر سکتے ہیں، اس اشکال کا جواب مفسرین یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ انبیاء و مرسلین کے ساتھ عوام و خواص سے بالکل جُدا ہے اور جو بات خواص اور صالحین کے حق میں معمولی اور قابلِ نظر انداز سمجھی جاتی ہے وہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں سخت گرفت کا باعث ہو جاتی ہے اور اس بنا پر ان سے اگر معمولی سی لغزش بھی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے سخت

سے سخت تعبیر اور اُس کو بہت بڑا جرم ظاہر کرتا ہے تاکہ وہ یہ محسوس کریں اور اُن کی شان اس قدر رفیع اور خدا کے یہاں اس درجہ بلند ہے کہ معمولی سی معمولی لغزش بھی اُن کی شان کے نامناسب ہے مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ اُن کے اس الزامی واقعہ میں ان کے متعلق ایسی بات بھی کہہ دیتا ہے جس سے یہ واضح ہو جائے کہ اگرچہ خدا کے نزدیک اُن کا یہ معاملہ حد درجہ قابلِ گرفت و مواخذہ ہے مگر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اُس کی بارگاہ میں اُن کی مقبولیت و برگزیدگی میں مطلق فرق نہیں آیا۔ اور چونکہ وہ فوراً ہی خطاء پر متنبہ کر دیے جاتے اور وہ اظہارِ ندامت کے ساتھ عذر خواہی کر کے شرفِ قبولیت حاصل کر لیتے ہیں اس لیے اُن کا تقرب الی اللہ اسی طرح قائم ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام، نوح علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے واقعات مذکورۂ قرآن اس کے شاہد ہیں۔

یہاں بھی یہی صورت ہے کہ یونس (علیہ السلام) نے حقیقۃً یہ گمان نہیں کیا تھا اور نہ کر سکتے تھے لیکن چونکہ وہ نبی تھے اور وحی الٰہی کے مخاطب رہتے تھے اس لیے ان کے چلے جانے کی یہ صورتِ حال اُن کی شان کے نامناسب تھی لہٰذا خدائے تعالیٰ نے اُن کی اُس حالت کو ایسی سخت تعبیر کے ساتھ ظاہر فرمایا۔ مگر ساتھ ہی اُن کے واقعات میں یہ ظاہر کر کے "وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ" اور "فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ" اُن کی عظمت و شان اور رفعتِ مرتبہ کو محفوظ رکھا تاکہ کسی کو مغالطہ نہ ہونے پائے اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس خاص معاملہ سے کسی کج فہم کو کجروی کا موقع ہاتھ نہ آئے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "مُغَاضِبًا" کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے یعنی جب یونس (علیہ السلام) نے یہ دیکھا کہ عذاب کی مدت پر عذاب نہیں آیا تو اس بات پر خفا ہو کر چلے گئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو قوم کے سامنے جھوٹا بنا دیا۔ لیکن یہ معنی ہرگز صحیح نہیں، اس لیے کہ جب یہ بات سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ یونس (علیہ السلام) اپنی قوم سے ناراض ہو کر اور عذاب کی پیشین گوئی کر کے نینویٰ سے چلے گئے تھے تو پھر اس صاف معنی کو چھوڑ کر ایک

بے سند قصہ اس میں اور اس طرح اضافہ کرنا کہ وہ نینویٰ کی بستی سے نکل کر کچھ دن جنگل میں مقیم رہے تاکہ قوم کی ہلاکت کا حال معلوم کریں اور جب شیطان نے پیرِ ضعیف کی شکل میں آکر عذاب ٹل جانے کی اطلاع دی تو اللہ تعالیٰ سے خفا ہو کر چل دیے اور پھر کشتی کا واقعہ پیش آیا، قطعاً دور از کار اور بے محل ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر (رحمہ اللہ) نے اس موقع پر موضح القرآن میں جو تحریر فرمایا ہے وہ ان سب تفسیروں سے جدا روش پر مبنی ہے اُن کے نزدیک مُغَاضِباً کا تعلق قوم اور اللہ تعالیٰ دونوں سے ہے اور یونس (علیہ السلام) کی خفگی کا معاملہ تین مرتبہ پیش آیا۔ ایک جب کہ ان کو نینویٰ جانے کا حکم ہوا کہ اہلِ شہر نے شرک و کفر اور ظلم و ستم میں طوفان برپا کر رکھا ہے اور دوسرا جب کہ وہ قوم میں رہ کر سمجھاتے رہے اور انھوں نے کسی طرح مان کر نہ دیا تو عذاب کی پیشین گوئی کر کے اور خفا ہو کر چلے گئے اور تیسرا جب کہ اُن کو یہ اطلاع ملی کہ عذاب نہیں آیا اور مجھ کو جھوٹا سمجھا جائے گا۔

مگر مجھ کو اس آخری حصہ کے متعلق سخت حیرت یہ ہے کہ یونس (علیہ السلام) کو یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ قوم پر عذاب نہیں آیا۔ مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ قوم پر اس لیے عذاب نہیں آیا کہ وہ ایمان سے بہرہ یاب ہو چکی اور آپ کے لیے چشم براہ ہے، رہا شیطان کے اطلاع دینے کا معاملہ سو اس کے لیے شرعی حجت کی ضرورت ہے جس کا اس جگہ قطعاً ثبوت نہیں ہے، لہٰذا یہ آخری قول تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

حضرت شاہ صاحب نے جملہ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ کی تفسیر میں بھی عجیب پہلو اختیار فرمایا ہے جو راجح و مرجوح اور صحیح و غیر صحیح سے قطعِ نظر اُن کی ذکاوتِ طبع پر دلالت کرتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:-

"یہ جو فرمایا: سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے یعنی مہربانی کے معاملہ میں اُس کو راضی نہ کر سکیں گے، وہ ایسا خفا ہوا۔ اور حکومت کے معاملہ میں ہر چیز آسان ہے۔"

یعنی یونس (علیہ السلام) نے خدا کے ساتھ ناز و ادا کا ایسا پہلو اختیار کیا کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ سے ایسے خفا ہوئے ہیں کہ اب راضی نہ ہوں گے مگر اُن کو یہ حقیقت فراموش ہوگئی کہ جب وہ آزمائش کے شکنجہ میں کسے جا کر پھر خدائے تعالیٰ کی مہربانیوں میں ڈھانپ لیے جائیں گے تو ساری خفگی اور ناراضی بھول جائیں گے اور توبہ وندامت کے ساتھ بہت جلد راضی ہو جائیں گے اور پھر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جہاں حکومت وطاقت ہوتی ہے وہاں مشکل آسان ہو جاتی ہے اور ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔

(۳) سورۂ والصافات میں اہلِ نینویٰ کے ایمان لے آنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے فَآمَنُوا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ پس وہ ایمان لے آئے پھر ہم نے اُن کو ایک مدت تک کیلیے فائدہ اُٹھانے دیا اور سورۂ یونس میں ہے لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے اُن پر سے وہ رسواکن عذاب ٹال دیا جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والا تھا اور ایک خاص مدت تک فائدہ اٹھانے کی مہلت دیدی۔ ان ہر دو قرآنی آیات میں جملہ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ نے مفسرین کے لیے بحث کا دروازہ کھول دیا اور جس قدر بھی احتمالاتِ عقلی ہو سکتے تھے سب ہی بیان کر دیے کسی نے کہا اس سے یہ مراد ہے کہ سنت اللہ یہ جاری رہی ہے کہ جب کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو پھر ٹلتا نہیں اور اس وقت کا ایمان معتبر نہیں کیونکہ وہ "ایمان بالغیب" نہیں ہوتا بلکہ مشاہدہ کا ایمان ہوتا ہے جیسا کہ فرعون نے غرق ہوتے وقت عذاب کے فرشتوں کو دیکھ کر کہا تھا "اٰمَنَّا بِرَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ" مگر یونس (علیہ السلام) کی قوم اس قانون سے مستثنیٰ کر دی گئی اور عذاب دیکھ کر جب انھوں نے توبہ اور انابۃ الی اللہ کا مظاہرہ کیا تو اُن پر سے عذاب ٹال دیا گیا، چنانچہ اس جملہ سے قبل اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ پھر کیوں ایسا ہوا کہ قومِ یونس کی بستی کے سوا اور کوئی بستی نہ نکلی کہ ایمان لے آتی اور اس کا ایمان اس کے لیے نفع بخش ہوتا۔

یہ تفسیر جمہور کے نزدیک ساقط الاعتبار ہے اس لیے کہ زیر بحث آیت میں کسی جملہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قوم یونس پر عذاب آچکا تھا اور جب وہ عذاب میں گھر گئے تو عذاب کے مشاہدہ کے بعد خوف نے اُن کو ایمان پر آمادہ کر دیا اور پھر سنت اللہ کے خلاف صرف یونس (علیہ السلام) کی قوم کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا کہ ان کے ایمان بالمشاہدہ کو قبول کر کے ان پر سے عذاب ہٹا لیا گیا بلکہ آیت میں تو صاف یہ کہا گیا ہے کہ جس طرح یونسؑ کی قوم ایمان لے آئی اسی طرح اور بستیوں نے بھی کیوں ایمان قبول نہیں کر لیا تاکہ جس طرح قوم یونسؑ عذاب سے محفوظ رہی اسی طرح وہ سب بھی عذاب سے محفوظ رہتیں۔ اس مقام پر تو اللہ تعالیٰ اس پر ناراضی کا اظہار فرما رہے ہیں کہ ایمان لا کر دوسری بستی کے لوگوں نے بھی قوم یونسؑ کی طرح کیوں خود کو عذاب سے نہ بچا لیا لیکن جمہور کے خلاف تفسیر بالا یہ ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مُراد یہ ہے کہ قوم یونسؑ کے سوا جس قوم نے بھی عذاب کا مشاہدہ کر کے ایمان قبول کیا ہم نے اس کے ایمان کو رد کر دیا مگر قوم یونس پر یہ مہربانی کی کہ اُنکے ایمان بالمشاہدہ کو منظور کر لیا۔ ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا! اور اگر کوئی شخص اس موقع پر یہ سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ کو قومِ یونسؑ ہی کے ساتھ ایسی کیا خصوصیت تھی اور دوسری قوموں کے ساتھ کیا عداوت کہ جس قسم کا ایمان قومِ یونسؑ کا قبول ہوا اُس قسم کا دوسری قوموں کا کیوں نہ ہوا تو نہ معلوم اس تفسیر کے قائلین اس کا کیا جواب دیں گے؟ اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ چونکہ قومِ یونسؑ نے عذاب کا مشاہدہ کر کے ایمان قبول کیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے صرف دنیا میں اس کو مقبول قرار دیا اور اُن پر سے عذاب ہٹا کر دنیا کی زندگی میں مہلت دے دی مگر آخرت کا عذاب بحالہ اُن پر قائم رہا۔

یہ قول بھی پہلے قول کی طرح غلط اور قرآنِ عزیز کے سیاق و سباق کے قطعاً خلاف ہے اس لیے کہ سورۂ والصافات اور سورۂ یونس میں "مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ" کا یہ مطلب کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ اُن کا ایمان صرف دنیوی زندگی تک مفید تھا اور آخرت میں وہ کافر اور مشرک ہی

شمار ہوں گے جبکہ سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ قوم یونسؑ کی منقبت اور گزشتہ اقوام کے ایمان نہ لانے کی مذمت ہی میں اُس واقعہ کو بیان کر رہا اور شاہد بنا رہا ہے اور اس جگہ سیاقِ کلام ہی یہ ہے کہ دوسری اقوام کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تھا جیسا کہ یونس (علیہ السلام) کی قوم نے کیا اور جبکہ والصافات میں اُن کے ایمان کو کسی بھی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا؟ اس کے علاوہ یہ بات بھی خاص توجہ کے لائق ہے کہ قرآنِ عزیز جب کبھی 'اٰمَنُوْا' کہتا ہے تو اس سے وہی ایمان مُراد لیتا ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں اس کے نزدیک مقبول ہے، وہ 'اَسْلَمْنَا' کو تو لغوی معنی میں استعمال کرتا ہے جیسا کہ اَعرابِ مدینہ کے واقعہ میں مذکور ہے لیکن 'اٰمَنُوْا' 'اٰمَنَّا' کو کبھی 'ایمانِ معتبر' کے سوا دوسرے معنی میں استعمال نہیں کرتا البتہ اس مقام پر مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ یا تو اس معنی میں ہے جو ہم ترجمہ میں ابن کثیر سے نقل کر چکے ہیں اور یا پھر یہ مراد ہے کہ گزشتہ اقوام کی تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ جن قوموں نے اپنے نبی اور پیغمبر کی ہدایت کو تسلیم نہیں کیا اور ان کے ساتھ ٹھٹھا کر کے ظلم و طغیان کو اُسوہ بنا لیا وہ قومیں اُن کے نبی کی بد دعا سے ہلاک ہوگئیں اور اُن کی بستیاں آنے والی قوموں کے لیے سرمایۂ عبرت بنیں اس لیے قرآنِ عزیز جب عاد، ثمود، قومِ صالح (علیہ السلام) قومِ لوط (علیہ السلام) وغیرہ کا ذکر کرتا ہے تو چشمِ عبرت سے دیکھنے والے آنکھ اٹھا کر ان بستیوں کا انجام دیکھ لیتے اور قرآن کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن یونس (علیہ السلام) کی قوم کا معاملہ ایک شبہ پیدا کرتا تھا اور وہ یہ کہ اگر باشندگانِ نینویٰ نے ایمان قبول کر لیا تھا تو پھر خدا کے ان مقبول بندوں کی نسلیں آج بھی پھلتی پھولتی نظر آنی چاہیے تھیں مگر تاریخ بتاتی ہے کہ وہ قوم اور اُن کا تمدن دنیا سے اسی طرح فنا ہو گیا جس طرح عذابِ الٰہی سے ہلاک شدہ قوموں کا، حتیٰ کہ نینویٰ جیسا عظیم الشان اور تاریخی شہر جو آشوری تمدن کا مرکز تھا اس طرح دنیا سے مٹ گیا کہ ۔۔۔ تک دنیائے تاریخ میں اس کا صحیح جائے وقوع تک بھی بے نشان اور نامعلوم ہو گیا تھا[1]

لہٰذا قرآنِ عزیز نے اس شبہ کا جواب پہلے ہی دیدیا تاکہ شبہ کرنے والے کی نگاہ فوراً

[1] تفسیر ترجمان القرآن جلد ۲ ماخوذ از یونانی مورخ۔

ہی تاریخ کے دوسرے ورق پر پڑ جائے وہ یہ کہ یہ درست ہے کہ قومِ یونسؑ حضرتِ یونس (علیہ السلام) کے زمانہ میں مومن، عادل اور پاکباز ہو گئی تھی لیکن اُن کی حیاتِ طیبہ کا یہ دور عرصہ تک قائم نہیں رہا اور عرصہ کے بعد اُن میں کفر و شرک اور ظلم و سرکشی کا وہ تمام مواد پھر جمع ہو گیا جس کے لیے یونس (علیہ السلام) مبعوث ہوئے تھے اور اس زمانہ کے اسرائیلی نبی ناحوم نے اگرچہ اُن کو بہت سمجھایا اور ہدایت و رشد کی راہ دکھائی مگر اس مرتبہ گزشتہ قوموں کی طرح انھوں نے بھی سرکشی اور بغاوت کو زندگی کا نصب العین بنائے رکھا تب وحی الٰہی کی روشنی میں ناحوم (علیہ السلام) نے نینویٰ کی تباہی کی خبر دی اور ان کی پیشین گوئی سے ستر برس کے اندر آشوری قوم کا تمدن اور اُن کا مرکزی شہر سب بابلیوں کے ہاتھوں اس طرح فنا ہو گئے کہ نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔

پس قرآنِ عزیز نے ایک جانب قومِ یونسؑ کے ایمان لے آنے پر اُن کی مدحت کی اور اُن کو سراہا تو دوسری جانب یہ بھی اشارہ کر دیا کہ جن افراد نے یہ نکوکاری اختیار کی اُن کو ہم نے بھی سروسامانِ زندگی سے نفع اٹھانے کا موقع دیا یعنی عذاب سے بچا لیا لیکن قومِ یونسؑ کی یہ حالت ہمیشہ نہ رہی اور ایک زمانہ وہ آیا کہ انھوں نے پھر ظلم و ستم اور کفر و شرک کو اپنا لیا، اور گزشتہ سرکش قوموں کی طرح سمجھانے کے باوجود بھی نہ سمجھی تب خدائے تعالیٰ نے بھی اُنکے ساتھ وہی کیا جو سنت اللہ کے مطابق ایسی قوموں کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔

بہرحال جمہور علماءِ اسلام کی تفسیر کے مطابق صحیح بات یہی ہے کہ قومِ یونس (علیہ السلام) پر عذاب نہیں آیا بلکہ بعض ابتدائی آثار نمودار ہوئے تھے جن میں سب سے بڑا اثر حضرتِ یونس (علیہ السلام) کا عذاب کی بددعا کر کے بستی کو چھوڑ دینا تھا جس کو قوم نے فوراً محسوس کیا اور دوسرے آثار و قرائن کو دیکھ کر یقین کر لیا کہ یونس (علیہ السلام) بیشک خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور ایمان لے آئے اور "عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" کا مطلب یہ ہے کہ جب قوموں کی سرکشی اور ستم کشی پر عذاب آتا ہے تو عذاب آخرت سے قبل اُن کو دنیا ہی میں اس ذلت و

رسوائی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور جبکہ قوم یونسؑ مسلمان ہوگئی اور ایمان لے آئی تو وہ دنیا کی اس ذلت وخواری سے بھی بچ گئے جو ظلم وشرک کی وجہ سے اُن کو پیش آنے والی تھی یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دنیا کے عذاب سے تو بچ گئی مگر آخرت کا عذاب بحالہ قائم رہا۔

حافظ ابن حجر اور ابن کثیر نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، مجاہدؒ، سعید بن جبیرؒ سے یہی نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ سلف صالحین یہی تفسیر کرتے تھے چنانچہ جملہ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والغرض انہ لم یوجد قریۃ	اور غرض یہ ہے کہ گزشتہ بستیوں میں سے کوئی بستی
اٰمنت بکمالھا بنبیھم ممن	ایسی نہ نکلی کہ اس کے باشندے اپنے نبیوں پر اس
سلف من القریٰ الا قوم یونس	طرح ایمان کامل لے آتے جس طرح یونس کی قوم یونس
وھم اھل نینوٰی وما کان ایمانھم	پر ایمان لے آئی اور یہ باشندگانِ نینوئی تھے اور ان کے
الا خوفا من وصول العذاب	ایمان لانے کا واقعہ یہ ہے کہ اُن کو اس عذاب کے
الذی انذرھم بہ رسولھم	آجانے کا ڈر پیدا ہوگیا تھا جس سے اُن کے پیغمبر نے
بعد ما عاینوا اسبابہ وخرج	ان کو ڈرایا تھا جب کہ انھوں نے عذاب کے آثار محسوس
رسولھم من بین اظھرھم	کیے اور انھوں نے دیکھا کہ ان کا پیغمبر اُن کے درمیان
فعندھا جاروا الی اللہ و	سے نکل گیا۔ اس وقت وہ اللہ کی طرف پناہ چاہنے لگے
استغاثوا بہ[1] الخ	اور انھوں نے خدا کی پناہ ڈھونڈھنی شروع کردی۔

اور جملہ "مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ" کی تفسیر میں کہتے ہیں:۔

ای الی وقت اٰجالھم[2] یعنی اپنی زندگی میں عذاب سے محفوظ ہوگئے، رہا موت کا معاملہ تو وہ سب کے لیے ہے۔

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ اختلف	اور آیت فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ میں مفسرین
المفسرون ھل کشف عنھم العذاب	کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اخروی اور دنیوی دونوں

الاخروی مع الدنیوی او انما	عذاب ٹل گئے تھے اور دوسرا یہ کہ صرف دُنیوی ٹل گیا
کشف عنھم فی الدنیا فقط؟	تھا اور اخروی بحالہٖ قائم رہا۔ اور حقیقتِ حال یہ
علی قولین والایمان منقذ من	ہے کہ "ایمان" نہ صرف دنیا کے عذاب سے چھٹکارا
العذاب الاخروی وھذا	دلاتا ہے بلکہ آخرت کے عذاب سے بھی نجات
ھو الظاھر[1] الخ	دلانے والا ہے۔

اور حضرت شاہ صاحبؒ نے اس مقام پر بھی اپنے رنگ کی جُدا تفسیر کی ہے مگر اُس کا مآل جمہور کی تائید ہی نکلتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

یعنی دنیا میں عذاب دیکھ کر ایمان لانا کسی کو کام نہیں آیا۔ مگر قومِ یونس کو اس واسطے کہ اُن پر (خدا کی جانب سے) حکمِ عذاب نہ پہنچا تھا۔ حضرت یونس کی شتابی سے صورت عذاب کی نمودار ہوئی تھی وہ ایمان لائے اور پھر بچ گئے۔ اسی طرح مکہ کے لوگ فتح مکہ میں اُن پر فوجِ اسلام پہنچی قتل وغارت کو، لیکن ان کا ایمان قبول ہوگیا اور امان ملی[2]

مُتنبّی کاذب کی تلبیس حضرتِ یونس (علیہ السلام) کے واقعہ سے مُتنبّیِ پنجاب (مرزا غلام احمد قادیانی) نے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ کہ جب قادیانی نے اپنے بعض مخالفوں کو یہ چیلنج کیا کہ اگر وہ اسی طرح مخالفت کرتے رہے تو خدا کا فیصلہ ہوچکا ہے کہ فلاں وقت تک اُن پر عذابِ الٰہی آجائے گا لیکن مخالفوں کی جانب سے اُس کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہ ملا کہ اُن کی مخالفانہ جدوجہد اور تیز ہوگئی مگر اس کے باوجود اُن پر عذاب نہیں آیا تب ناکامی کی ذلت سے بچنے کے لیے قادیانی نے یہ کہنا شروع کردیا کہ چونکہ مخالف دل میں ڈر گئے ہیں اس لیے اُن پر سے عذاب ٹل گیا جس طرح یونس (علیہ السلام) کی قوم پر سے ٹل گیا تھا۔

لیکن قرآنِ عزیز کی روشن شہادت قادیانی کے اس حیلہ کو مردود قرار دیتی ہے اس لیے کہ یونس (علیہ السلام) کی قوم نے تو عذاب آنے سے قبل ہی علی الاعلان ایمان قبول کرلیا۔ یونس (علیہ السلام) کو پیغمبرِ صادق مان کر اُن کی جستجو شروع کردی اور ان کے واپس آنے پر اُن کی پیروی

[1] سورۂ والصافات و فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۱ [2] سورۂ یونس۔

کو دین وایمان بنالیا مگر قادیانی حریفوں نے نہ صرف مخالفت باقی رکھی بلکہ قادیانی مشن کے خلاف جدوجہد کو اور تیز کر دیا۔لہٰذا قادیانی کا اپنے جھوٹے دعوے کے لیے یونس (علیہ السلام) کے واقعہ سے دلیل لانا اور اُس کی آڑ لے کر کذب بیانی کو چھپانا بے سود کوشش اور قیاس مع الفارق ہے اور اگر بفرضِ محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قادیانی کے مخالف دل میں ڈر گئے تھے تو کیا جو شخص دل میں کسی کی صداقت کا یقین رکھتا ہو مگر اپنے قول وعمل سے اس کا انکار کرتا ہے مومن کہلایا جا سکتا ہے؟ اگر ایسا ہو سکتا تو جن یہود کے متعلق قرآن نے اعلان کیا یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآئَھُمْ وہ (یہود) رسول اللہ کو یعنی ان کے پیغمبر ہونے کو اُسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کے اولاد ہونے کا یقین رکھتے ہیں" وہ مومن کیوں نہ کہلائے؛

کیا یونس (علیہ السلام) کی صداقت اور مرزا قادیانی کی کذب بیانی کے درمیان یہ نمایاں فرق کافی نہیں ہے کہ یونس (علیہ السلام) جب قوم کی جانب واپس آتے ہیں تو جس قوم کو خدا کا دشمن رسول کا دشمن اور متمرد وسرکش چھوڑ گئے تھے اس کو مومن صادق، مطیع وفرمانبردار اپنی آمد پر اُنکو انتہائی مسرور پایا مگر قادیانی نے یہ دیکھا کہ اس کے چیلنج کے بعد مخالف تحریر وتقریر او عملی زندگی میں پہلے سے زیادہ مخالف ہو گئے ہیں اور مزید برآں یہ کہ اُن میں سے بعض آج تک بصد عزت واحترام زندہ ہیں اور خود مرزا قادیانی ایسے مرض میں مبتلا ہو کر جو بعض قوموں کے لیے عذاب کی شکل میں نمودار ہو چکا ہے عرصہ ہوا دنیا کو خیر باد کہہ چکے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!

(۴) سورۂ والصافات میں ہے "وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ" اور اس سے قبل یہ آیت ہے "فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ" چنانچہ آیات کی اس ترتیب کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوا کہ یونس (علیہ السلام) کی بعثت مچھلی کے حادثہ سے قبل ہو چکی تھی یا اس کے بعد ہوئی؟ ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے نقل کیا ہے کہ یونس (علیہ السلام) کی بعثت مچھلی کے حادثہ کے بعد ہوئی ہے اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے

قبل نبوت عطا ہو چکی تھی اور وہ نینویٰ میں تبلیغ کے لیے جا چکے تھے اور بغوی کہتے ہیں کہ یونس (علیہ السلام) مچھلی کے حادثہ سے قبل تو نینویٰ کے باشندوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور مچھلی کے حادثہ کے بعد ایک دوسری اُمت کی جانب بھیجے گئے اور قرآنِ عزیز میں ایک لاکھ سے زاید اسی دوسری امت کی تعداد بیان کی گئی ہے یہ باشندگانِ نینویٰ کی مردم شماری کا ذکر نہیں ہے۔

بغوی کی یہ رائے بے سند ہے اس لیے کہ قرآنِ عزیز میں اشارۃً تک نہیں پایا جاتا کہ یونس (علیہ السلام) دو جدا جدا قوموں کی جانب مبعوث ہوئے تھے۔ رہا ترتیبِ آیات کا معاملہ تو وہ فصاحت و بلاغت کے اصول کے عین مطابق ہے اس لیے کہ زیر بحث آیات میں اوّل یونس (علیہ السلام) کی رسالت و بعثت کا ذکر ہے اور پھر قوم سے ناراض ہو کر چلے جانے، کشتی میں بیٹھنے، بھنور میں آجانے کی وجہ سے قرعہ اندازی ہونے، قرعہ یونس (علیہ السلام) کے نام پر نکلنے، دریا میں کودنے کے بعد مچھلی کے پیٹ میں رہنے، بعد میں صحیح سلامت مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکل آنے اور خدا کی مہربانیوں کے آغوش میں آکر شاد کام واپس لوٹنے کا تذکرہ ہے اور اُس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ جس قوم کی جانب اُن کو بھیجا گیا تھا وہ چند افراد نہیں تھے بلکہ بہت بڑی تعداد تھی جن کا انجام یہ نکلا کہ وہ ایمان لے آئے اور آنیوالے عذاب سے محفوظ ہو کر اپنی زندگی سے بہرہ مند ہوئے۔

لہٰذا آیات میں نہ تقدیم و تاخیر ہے اور نہ اس ترتیب سے یہ لازم آتا ہے کہ بقول بغوی وہ ایک دوسری امت تھی جس کا ذکر "مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ" میں کیا گیا ہے۔

اسی طرح مچھلی کے حادثہ سے قبل اور بعد بعثت کا مسئلہ بھی صاف ہے اور اس میں دو رائے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ابن کثیر نے ہر دو اقوال کی تطبیق میں جو کچھ کہا ہے وہی حقیقت ہے یعنی یونس (علیہ السلام) مچھلی کے واقعہ سے قبل اہلِ نینویٰ کی جانب نبی بنا کر بھیجے گئے اور جب وہ خفا ہو کر چلے آئے تو مچھلی کا حادثہ پیش آیا۔ اس حادثہ سے متنبہ ہو کر جب

انھوں نے خدائے تعالیٰ کی طرف اظہارِ ندامت کے ساتھ رجوع کیا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے شرفِ قبولیت عطا ہوا اور اُن کو حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم کی جانب واپس جائیں کیونکہ وہ ایمان لے آئی ہے اور واپس جاکر اس کی رہنمائی کریں۔

صحیفۂ یوناہ | صحیفۂ یوناہ (یونس) میں ان اقوال سے الگ یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یونس ؑ کو اہلِ نینویٰ کی ہدایت کے لیے مامور کیا۔ مگر وہ ترسیس کو بھاگ گئے اور اسی سفر میں مچھلی کا واقعہ پیش آیا تب وہ متنبہ ہوئے اور پھر اُن کو حکم ہوا کہ نینویٰ جاؤ اور اپنا فرض انجام دو، یونس علیہ السلام نے وہاں جاکر تبلیغ کی اور قوم کے نہ ماننے پر اُن کو چالیس دن مقرر کرکے عذابِ الٰہی سے ڈرایا اور خود دُور جنگل میں چلے آئے مگر قوم فوراً ایمان لے آئی اور بادشاہ سے لے کر رعایا تک نے ٹاٹ کے کپڑے پہن لیے اور انسانوں اور جانوروں کے بچوں کو ماؤں سے علیحدہ کر دیا اور میدان میں نکل کر توبہ و استغفار اور آہ و زاری کرنے اور یونس کی تلاش میں دوڑنے لگے، ادھر یونس علیہ السلام کو یہ معلوم ہوا کہ چالیس دن گزر گئے اور عذاب نہیں آیا تو اللہ تعالیٰ سے رنجیدہ ہو کر دور نکل گئے اور خدا کی درگاہ میں عرض کیا: میں اسی خیال سے ترسیس بھاگ گیا اور نینویٰ نہیں آیا تھا کہ میں جانتا تھا کہ تو بہت مہربان اور عذاب میں دھیما ہے اور تو رحیم و کریم ہے اب میں جھوٹا بنا اور اب مجھ کو موت دیدے کہ میرا مرنا میرے جینے سے بہتر ہے اور چھپر ڈال کر وہیں رہنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے سایہ کے لیے ریںڈی کا بیل دار درخت اُگا دیا جس کو دیکھ کر یونس (علیہ السلام) بہت خوش ہوئے، دوپہر دن کے بعد کیڑے نے اس کی جڑ کو کاٹ دیا اور وہ سوکھ گیا۔ یونس (علیہ السلام) کو بے حد رنج ہوا۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یونس تم ایک معمولی ریںڈی کے درخت کے خشک ہونے پر اس قدر رنجیدہ ہوا اور کیا میں اتنے بڑے شہر پر کہ جس کی مردم شماری ایک لاکھ بیس ہزار ہے شفقت و مہربانی نہ کرتا۔

توراۃ میں یہ صحیفہ "یوناہ نبی کی کتاب" کے نام سے موسوم ہے اور چھوٹے چھوٹے چار ابواب پر مشتمل ہے جس میں یہی واقعہ مذکور ہے۔ اِس صحیفہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:

اور خداوند کا کلام یوناہ بن امتی کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اُٹھ اس بڑے شہر نینوہ کو جا اور اس کی مخالفت میں منادی کر کیونکہ اُن کی شرارت میرے سامنے اوپر آئی۔

اور صحیفہ کا مضمون اس عبارت پر آکر ختم ہوتا ہے:

"اور خدا نے یوناہ (یونس) کو کہا کیا تو اس رینڈی کے درخت کے سبب شدت سے رنجیدہ ہے؟ اس نے کہا کہ میں یہاں تک رنجیدہ ہوں کہ مرنا چاہتا ہوں۔ تب خداوند نے فرمایا کہ تجھے اس رینڈی کے درخت پر رحم آیا جس کے لیے تو نے کچھ محنت نہ کی اور نہ تو نے اُسے اُگایا جو ایک ہی رات میں اُگا اور ایک ہی رات میں سوکھ گیا اور کیا مجھے لازم نہ تھا کہ میں اتنے بڑے شہر نینوہ پر جس میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں سے زیادہ ہیں جو اپنے دائیں بائیں ہاتھ کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتے اور مواشی بھی بہت ہیں شفقت نہ کروں۔"

قرآنِ عزیز اور اس صحیفہ کے واقعات میں بہت کچھ تطابق ہے لیکن تفصیلات میں جس جس جگہ اختلاف ہے اس میں قرآنِ عزیز کا قول ہی درست ہے کیونکہ قرآن کی اطلاع علم الیقین (وحی الٰہی) پر مبنی ہے اور صحیفہ محرّف مجموعہ کا ایک جزء ہے اور یونس (علیہ السلام) کا صحیفۂ ہدایت نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے کا مضمون ہے جس میں یونس (علیہ السلام) کے واقعہ کو معرضِ تحریر میں لایا گیا ہے۔

(۵) یونس (علیہ السلام) نے اہلِ نینوی کو جس عذاب سے ڈرایا تھا اُس کی تعیینِ مدت میں مختلف اقوال ہیں یعنی تین، سات اور چالیس۔ ابن کثیر تین کو ترجیح دیتے ہیں اور شاہ عبد القادر چالیس کو، صحیفۂ یوناہ میں بھی چالیس دن ہی مذکور ہیں۔

(۶) شروع میں کہا جا چکا ہے کہ قرآنِ عزیز میں یونس (علیہ السلام) کا ذکر جن سورتوں میں مذکور ہے اُن میں سے سورۂ انبیاء اور القلم میں نام کی بجائے صفت کے ذریعہ اُن کا تعارف کرایا گیا ہے سورۂ انبیاء میں "ذو النون" کہا گیا ہے اس لیے کہ قدیم عربی میں "نون" مچھلی کو کہتے ہیں اور "القلم" میں "صاحب الحوت" سے یاد کیا گیا، اور حوت بھی مچھلی ہی کو کہتے

ہیں چونکہ ان پر مچھلی کا حادثہ گزرا تھا اس لیے "مچھلی والا" اُن کا لقب ہوگیا۔

وفات شاہ عبدالقادر نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ یونس (علیہ السلام) کی وفات اُسی شہر میں ہوئی جس کی جانب وہ مبعوث ہوئے یعنی نینویٰ میں اور وہیں اُن کی قبر تھی۔

اور عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ فلسطین کے علاقہ میں جو مشہور شہر خلیل ہے اُس کے قریب ایک بستی حلحول کے نام سے معروف ہے اس میں ایک قبر ہے جس کو یونس (علیہ السلام) کی قبر بتایا جاتا ہے اور اسی قبر کے قریب دوسری قبر ہے اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ یونس (علیہ السلام) کے والد متی کی قبر ہے۔

ہمارے خیال میں شاہ صاحب کا قول صحیح ہے اس لیے کہ حضرت یونس (علیہ السلام) کے متعلق جس قدر واقعات بھی بہم پہنچ سکے ہیں وہ سب متفق ہیں کہ یونس (علیہ السلام) دوبارہ نینویٰ واپس تشریف لے گئے اور انھوں نے اپنی قوم کے اندر ہی زندگی گزار دی لہٰذا قرینِ صواب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا انتقال نینویٰ ہی میں ہوا اور وہیں ان کی قبر ہوگی جو نینویٰ کی تباہی کے بعد نامعلوم ہوگئی اور بعد میں خوش اعتقادی کے نقطۂ نظر سے حلحول کی غیر معروف دو قبروں کو یونس (علیہ السلام) اور اُن کے والد متی کی قبر بنا دیا گیا آج بھی بعض مشاہیر اولیاء اللہ کے نام سے ایک بزرگ کی متعدد مقامات پر قبریں موجود ہیں اور ایسا تو کثرت سے ہے کہ غیر معروف بزرگوں کے نام سے بہت سی قبروں کو غلط منسوب کر کے اپنے دنیوی اغراض کو پورا کیا جاتا ہے۔

فضیلتِ یونسؑ احادیثِ صحیحہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یونس (علیہ السلام) کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے ان کی عظمت و فضیلت کا خصوصی اظہار فرمایا ہے چنانچہ بخاری میں منقول ہے:

عن عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے
عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لایقولن	کوئی شخص ہرگز یہ نہ کہے کہ میں (یعنی نبی اکرم
احدکم انی خیر من یونس بن متی [1]	صلی اللہ علیہ وسلم) بہتر ہوں یونس بن متی سے۔

اور حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی سامان فروخت کر رہا تھا کسی شخص نے کچھ خرید کر جو قیمت دینی چاہی وہ اس کی مرضی کے خلاف تھی، وہ کہنے لگا قسم بخدا جس نے موسیٰ (علیہ السلام) کو فضل بشر بنایا میں اس قیمت پر اپنی چیز کو فروخت نہیں کرونگا ایک انصاری نے یہ سُنا تو غصہ میں یہودی کے ایک طمانچہ رسید کر دیا اور کہا تو ایسی بات کہتا ہے درآنحالیکہ ہمارے درمیان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں، یہودی فوراً دربارِ رسالت میں حاضر ہوا اور فریاد کرنے لگا: ابوالقاسم! جبکہ میں آپ کے عہد اور ذمّہ میں ہوں تو اس انصاری نے میرے مُنہ پر طمانچہ کس لیے مارا؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصاری سے وجہ دریافت فرمائی اور جب انصاری نے واقعہ سُنایا تو چہرۂ مبارک غصہ سے سُرخ ہو گیا اور فرمایا: انبیاء علیہم السلام کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو اس لیے کہ جب اوّل صور پھونکا جائیگا تو زمین و آسمان کے درمیان جو بھی جاندار ہیں وہ سب بیہوش ہو جائیں گے مگر جن کو خدا مستثنیٰ کر دے اس کے بعد دوسرا صور پھونکا جائیگا تو سب سے پہلے جو شخص ہوش میں آئیگا وہ میں ہونگا مگر میں جب غشی سے بیدار ہونگا تو دیکھوں گا کہ موسیٰ (علیہ السلام) عرش کے سہارے کھڑے ہیں، اب میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا اُنکی غشی کا معاملہ طور کے واقعہ میں محسوب ہو گیا کہ وہ غشی سے محفوظ رہے یا وہ مجھ سے بھی پہلے ہوش میں آ گئے، اور میں نہیں کہتا کہ کوئی نبی بھی یونس بن متّیٰ سے افضل ہے[1]

ان روایات میں خصوصیت کے ساتھ حضرت یونس (علیہ السلام) کا جو ذکر آیا ہے تو اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہ صرف اس لیے تا کہ جو شخص بھی حضرت یونسؑ کے واقعات کا مطالعہ کرے اس کے دل میں ذات اقدس کے متعلق تنقیص کا کوئی پہلو بھی نہ آنے پائے پس ضروری ہوا کہ اُن کی عظمتِ شان کو نمایاں کر کے تنقیص کے اس خدشہ کا سدِباب کر دیا جائے[2]

فضائل انبیاء علیہم السلام مگر اس مقام پر یہ مسئلہ ضرور حل طلب پیش آ جاتا ہے کہ دوسری حدیث میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی فضیلت سے متعلق آپ نے جو تفصیل ارشاد فرمائی اور "لا تفضلوا بین الانبیاء" فرما کر انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت کی نفی فرما دی تو اس مسئلہ کی حقیقت

[1] بخاری کتاب الانبیاء۔ [2] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۱۔

کیا ہے ؟

مسئلہ زیر بحث کو زیادہ نمایاں کرنے کے لیے یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک جانب قرآنِ عزیز میں ارشاد ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رُسل میں باہم افضل و مفضول کی نسبت قائم کی ہے اور باہم یک دگر فضیلت عطا فرمائی ہے نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے انا سید وُلدِ آدم ولا فخر یعنی بغیر کسی فخر و مباہات کے کہتا ہوں کہ میں تمام اولادِ آدم (علیہ السلام) کا سردار ہوں۔ اور دوسری جانب آپ یہ ارشاد فرمارہے ہیں کہ لا تفضلوا بین الانبیاء اور لا یقولن احد کمانی خیر من یونس بن متّٰی یعنی نہ انبیاء کے درمیان افضل و مفضول کے درجات قائم کرو اور نہ ایک کو دوسرے پر فضیلت اور نہ مجھ کو یونس بن متّٰی اور موسیٰ (علیہما السلام) پر فضیلت دو۔ تو ان نصوصِ قرآنی اور حدیثی کے درمیان کس طرح مطابقت ہوسکتی ہے۔

اس مسئلہ کے حل میں محدثین اور شارحینِ حدیث سے متعدد اقوال منقول ہیں مثلاً ان دونوں مضامین کے درمیان تطبیق کی شکل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشادِ گرامی جس میں انبیاء کے باہم یکدگر فضیلت یا ذاتِ اقدس کو کسی نبی پر فضیلت کی ممانعت مذکور ہے اس زمانہ کے ارشادات ہیں جبکہ سورۂ بقرہ کی اس آیت کا نزول نہیں ہوا تھا اور نہ آپ کو فضائلِ انبیاء خصوصاً تمام انبیاء علیہم السلام پر اپنی فضیلت کا ہنوز علم ہوا تھا۔

لیکن یہ جواب یا مسئلہ کا حل بہت کمزور بلکہ ساقط الاعتبار ہے اس لیے کہ یہودی کا یہ واقعہ یا یونس (علیہ السلام) کی فضیلت سے متعلق روایات کا سلسلہ اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جو مدنی زندگی کے آخری سال کہلاتے ہیں اور ان سے قبل انبیاء علیہم السلام کے مابین فضائل کے بہت سے واقعات خود ذاتِ اقدس سے منقول ہوچکے ہیں۔

دوسرا حل یہ پیش کیا گیا کہ اگرچہ ان روایات میں سے بعض طریقہائے سند میں فضیلتِ انبیاء سے متعلق عام الفاظ منقول ہیں یعنی لا تفضلوا بین الانبیاء مگر درحقیقت اس ارشادِ گرامی

کا مقصد صرف ذاتِ اقدس ہے جیسا کہ یہودی کے واقعہ اور یونس (علیہ السلام) سے متعلق روایت سے ظاہر ہوتا ہے اور اگرچہ آپ جانتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے آپ کو تمام اولادِ آدمؑ پر فضیلت عطا فرمائی ہے تاہم آپ نے تواضع اور انکسار کے طور پر یہ ارشاد فرمایا ہے۔

مگر یہ جواب بھی قوی نہیں ہے اس لیے کہ آپ نے جب مسطورۂ بالا جملہ میں مسئلہ کو عام ذکر فرمایا ہے تو بے دلیل اس کو فقط ذاتِ اقدس کے ساتھ مخصوص کر دینے کے کوئی معنی نہیں۔

تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جن روایات میں انبیا علیہم السلام کے باہم ایک دوسرے پر فضیلت کا انکار کیا گیا ہے اس سے نفسِ نبوت کی فضیلت مراد ہے خصائص و صفات کے لحاظ سے افضل و مفضول ہونے کا انکار نہیں ہے جیسا کہ خود سورۂ بقرہ ہی میں مومن کی شان یہ بیان کی گئی ہے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ یعنی ہم کسی بھی نبی اور رسول کے درمیان کوئی فرق جائز نہیں سمجھتے اور یہ نہیں کرتے کہ خدا کے سچے نبیوں میں سے ایک کو مانیں اور دوسرے کا انکار کریں۔

مگر یہ جواب اُس وقت دلچسپ ہو سکتا تھا جبکہ آپ کا ارشادِ گرامی ایسے واقعہ سے متعلق ہوتا جس میں کسی سچے پیغمبر کے نبی ماننے نہ ماننے پر قضیہ پیش آتا لیکن یہودی کے واقعہ میں تو نفسِ نبوت کی بحث نہیں تھی بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے افضل و مفضول ہونے کی بحث تھی۔

لہٰذا اس مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ بے شبہ انبیاء و رسل (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے درمیان درجاتِ فضائل موجود ہیں اور اُن کے مابین افضل و مفضول کی نسبت قائم ہے اور یقیناً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل (علیہم الصلوٰۃ والسلام) سے افضل ہیں پھر مسطورۂ بالا روایات میں آپ سے جو انبیاء (علیہم السلام) کے درمیان فضیلت دینے کی ممانعت مذکور ہے تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نبی کو دوسرے نبی پر اس طرح کی فضیلت دینا سخت ممنوع ہے کہ جس سے مفضول نبی کی تنقیص لازم آتی ہو یعنی یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کسی پیغمبر کی محبت

کے جوش میں دوسرے انبیاء کا مقابلہ کرتے ہوئے ایسی مدحت و منقبت کی جائے کہ جس سے دوسرے پیغمبر کی شانِ رفیع کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہو نیز ایسے موقع پر فضیلت کی بحث کی ممانعت کی گئی ہے جبکہ یہ مسئلہ مجادلہ اور مناظرہ کی شکل اختیار کرلے کیونکہ ایسی صورت میں احتیاط کے باوجود انسان بے قابو ہو کر دوسرے پیغمبر کے متعلق ایسی باتیں کہہ جائیگا جو ان کی توہین یا تنقیص کا باعث ہوتی ہوں اور نتیجہ میں ایمان کی جگہ کفر لازم کرتی ہوں چنانچہ جس واقعہ میں آپ نے یہ ارشاد فرمایا تھا وہ اسی قسم کے مجادلہ کا موقع تھا۔ باقی انبیاء (علیہم السلام) کے درمیان اللہ تعالیٰ نے بعض خصائص کے اعتبار سے جو فرقِ مراتب قائم کیا ہے اور جس کے متعلق خود یہ فرمایا ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ تو یہ امر محبوب ہے نہ کہ ممنوع۔

اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر کہ اس مسئلہ سے متعلق حافظ ابن حجر نے جو بحث نقل فرمائی ہے وہ بھی قابلِ مطالعہ ہے، ارشاد فرماتے ہیں:۔

قال العلماء فی نہیہ صلی اللہ علیہ وسلم عن التفضیل بین الانبیاء انما نہی عن ذٰلک من یقول برأیہ لا من یقول بدلیل او من یقول بحیث یودی الی تنقیص المفضول او یودی الی خصومۃ والتنازع او المراد لا تفضلوا بجمیع انواع الفضائل بحیث لا یترک للمفضول فضیلۃ فالامام مثلاً اذا قلنا انہ افضل من المؤذن لا یستلزم	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انبیاء کے درمیان فضیلت دینے کی ممانعت فرمائی ہے تو علماء اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ ایسی فضیلت ممنوع ہے جو اپنی رائے سے اختراع کی جائے۔ وہ فضیلت منع نہیں ہے جو دلیلِ شرعی پر قائم ہو یا وہ منع ہے جو اس طرح ادا کی جائے کہ جس نبی پر فضیلت دی جارہی ہے اس کی شان میں نقص پیدا کرتی ہو یا خصومت اور جھگڑے کا باعث بنتی ہو یا ایسی فضیلت دینے کی ممانعت ہے جو ایک نبی کے اندر اس طرح تمام فضائل کو جمع کرتی ہو کہ اس سے یہ لازم آجائے کہ دوسرے نبی کو کوئی فضیلت حاصل ہی نہیں ہے مگر ایسی فضیلت کہ مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ "امام کو مؤذن پر

نقص فضیلة المؤذن بالنسبة الی الاذان وقیل النہی عن التفضیل انما ھو فی حق النبوۃ نفسھا کقولہ تعالٰی "لا نفرق بین احد من رسلہ" ولم ینہ عن تفضیل بعض الذوات علی بعض لقولہ تعالٰی "تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض"۔

فضیلت ہے تو اس سے مؤذن کی شان کا نقص لازم نہیں آتا" جائز ہے ایک قول ضعیف یہ بھی ہے کہ اس ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ نفسِ نبوت میں ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے "لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ" لیکن بعض ذوات گرامی کو بعض پر اُن کی ذاتی خصوصیات کے لحاظ سے فضیلت دینا ممنوع نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالٰی کے اس قول سے ثابت ہے "تِلْكَ الرُّسُلُ ....."

وقال الحلیمی الاخبار الواردۃ فی النہی عن التخییر انما ھی فی مجادلۃ اھل الکتاب وتفضیل بعض الانبیاء علی بعض بالمخایرۃ لان المخایرۃ اذا وقعت بین اھل دینین لا یؤمن ان یخرج احدھما الی الازدراء بالاخر فیفضی الی الکفر فاما اذا کان التخییر مستندا الی مقابلۃ الفضائل لتحصیل الرجحان فلا یدخل فی النہی [1]

اور حلیمی کہتے ہیں: جو احادیث انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت دینے کی ممانعت کرتی ہیں وہ ایسے مواقع کے متعلق ہیں جبکہ اہلِ کتاب سے انبیاء کے متعلق مجادلہ اور جھگڑا ہو رہا ہو یا مسلمان اور عیسائی مثلاً اپنے نبی کو دوسرے پر ترجیح دے رہے ہوں، کیونکہ ایسی صورت میں جب دو مذہبوں کے درمیان بحث آجاتی ہے تو یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ ایسی بات زبان سے نہ نکلے جو دوسرے مذہب کے نبی کی شان میں توہین کا باعث ہو اور کفر کا سبب بنے (اس لیے کہ مسلمان کیلئے تو واجب ہے کہ مذاہب کے تمام سچے نبیوں کو اپنا نبی سمجھے) لیکن اگر مقصد یہ ہو کہ انبیاء کے باہم فضائل کی بحث سے ایک دوسرے کی حقیقی ترجیح کو ثابت کرے تو یہ منع نہیں ہے۔[1]

موعظت حضرت یونس (علیہ السلام) کے واقعہ کا اگر بنظرِ بصیرت و موعظت مطالعہ کیا جائے تو حسبِ ذیل حقائق واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں:۔

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۴ ۔ ۔

(۱) قوموں کی رشد و ہدایت کے متعلق یہ سنت اللہ ہے کہ جب وہ نبی کی دعوت سے مُنہ موڑ کر انکار و جحود پر اصرار کرنے لگتیں اور ظلم کیشی و ستم شعاری کو اُسوہ بنا لیتی ہیں اور نبی مایوس ہو کر اُن کو عذاب کی اطلاع دے دیتا ہے تو پھر اُمت کے لیے صرف دو راہیں باقی رہ جاتی ہیں، یا عذاب آنے سے قبل ایمان لے آئے اور عذاب سے محفوظ ہو جائے اور یا عذابِ الٰہی کا شکار ہو جائے اور یہ ناممکن ہے کہ نبی کی اطلاعِ عذاب کے بعد وہ عذاب سے قبل ایمان بھی نہ لائیں اور عذاب سے محفوظ ہو جائیں۔ قومِ نوح، قومِ صالح، قومِ لوط (علیہم السلام) عاد، ثمود وغیرہ ان سب اُمم ماضیہ اور اقوامِ سالفہ کا عظیم الشان تمدن، بلند و وقیع تہذیب، قہرمانہ طاقت و قوت اور پھر عذابِ الٰہی سے اُن کا یک بیک فنا ہو کر بے نام و نشان ہو جانے کی تاریخ اس حقیقت کو آشکارا کرتی ہے۔

(۲) گزشتہ اقوام میں سے قومِ یونسؑ کی ایک مثال ایسی ہے جس نے عذاب آنے سے قبل ایمان کو قبول کر لیا اور وہ خدا کی سچی مطیع و فرمانبردار ہو کر عذابِ الٰہی سے محفوظ ہو گئی، کاش کہ بعد میں آنے والی نسلیں اور قومیں قومِ یونسؑ کے قدم پر چل کر اسی طرح عذابِ الٰہی سے محفوظ رہ سکتیں مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

(۳) انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ عوام اور خواص دونوں سے جُدا رہتا ہے اور رہنا بھی چاہیے اس لیے کہ وہ براہِ راست خدا کے ساتھ شرفِ مخاطبت و مکالمت رکھتے ہیں لہٰذا احکامِ الٰہی کے امتثال کی وہ ذمہ داری جو اُن سے وابستہ ہوتی ہے وہ دوسروں کے ساتھ نہیں ہوتی، پس اُن کا فرض ہے کہ جو کام بھی انجام دیں وحی الٰہی کی روشنی میں ہونا چاہیے خصوصاً تبلیغِ دین اور پیغامِ حق سے متعلق تمام معاملات میں وحی الٰہی کے علم الیقین ہی پر اُن کا معاملہ معلق رہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی کام میں عجلت کر گزرتے ہیں یا انتظارِ وحی کے بغیر کسی قول و عمل پر اقدام کر جاتے ہیں تو خواہ وہ بات کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو اُن سے اللہ تعالیٰ بہت سخت مواخذہ کرتا اور ان کی اس صورتِ حال کے لیے ایسی سخت تعبیر روا

رکھتا ہے کہ سُننے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ حقیقۃً انھوں نے کوئی عظیم الشان جرم کیا ہے مگر ساتھ ہی اس کی اعانت بھی ان کے شاملِ حال رہتی ہے اور وہ فوراً متنبہ ہوکر اعترافِ ندامت کے ساتھ عفوِ تقصیر کے لیے دست بہ دعا ہوجاتے اور انابت و توبہ کو وسیلۂ کار بنا لیتے ہیں جو بہت جلد خدائے تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوجاتی اور ان کی عزت و احترام کے ازدیاد کا باعث بن جاتی ہے۔

قرآنِ عزیز کے اسلوبِ بیان میں یہ حقیقت بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور جو اس حقیقت سے ناآشنا ہوتا ہے اس کے لیے اس قسم کے مواقع سخت خلجان کا موجب ہوتے ہیں کیونکہ ایک طرف وہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہستی کو نبی اور رسول کہہ کر اس کی مدحت کر رہا ہے اور دوسری جانب یہ نظر آتا ہے کہ گویا وہ بہت ہی بڑے جرم کا مرتکب ہے تو وہ حیران و مضطرب ہوکر یا کجروی میں پڑجاتا ہے اور یا وساوس کے تاریک میدان میں گھر جاتا ہے اس لیے ازبس ضروری ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے وقائع و اخبار میں ہمیشہ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا جائے تاکہ صراطِ مستقیم سے پاؤں نہ ڈگمگا جائیں۔

(۴) اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے سچے نبی اسلام کے اپنے نبی ہیں خواہ وہ کسی دین سے تعلق رکھتے ہوں اور اُن پر اسی طرح ایمان لانا ضروری ہے جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا۔ لہٰذا اس کا یقین رکھتے ہوئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رُسل کے سردار اور افضل البشر ہیں کسی نبی کے مقابلہ میں آپ کی ایسی مدحت و منقبت سخت ممنوع ہے جس سے کسی نبی کی بھی تنقیص ہوتی ہو جیسا کہ عام طور پر میلاد کی مروجہ مجالس میں اس اہم حقیقت سے ناآشنا میلاد خوانوں کے اشعار میں یہ ممنوع طریقہ شائع ذائع ہے۔



حضرتِ ذُوالکِفلُ علیہ السلام

قرآنِ عزیز اور ذوالکفل، نسب، آثار و روایات، تنقید، ایک غلط فہمی کا ازالہ، موعظت۔

قرآنِ عزیز اور ذوالکفل قرآنِ عزیز میں ذوالکفل (علیہ السلام) کا ذکر دو سورتوں "انبیاء" اور "ص" میں کیا گیا ہے، اور دونوں میں صرف نام مذکور ہے اور مجمل و مفصل کسی قسم کے حالات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے:

وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِدْرِیْسَ وَذَا الْکِفْلِؕ	اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل سب (راہِ حق میں)
کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ وَاَدْخَلْنٰھُمْ فِیْ	صبر کرنے والے تھے۔ ہم نے انھیں اپنی رحمت کے سایہ
رَحْمَتِنَاؕ اِنَّھُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝	میں لے لیا۔ یقیناً وہ نیک بندوں میں سے تھے۔
وَاذْکُرْ اِسْمٰعِیْلَ وَالْیَسَعَ وَذَا الْکِفْلِؕ	اور یاد کرو اسمٰعیل، الیسع اور ذوالکفل (کے واقعات)
وَکُلٌّ مِّنَ الْاَخْیَارِ (ص پ ۲۳)	اور یہ سب نکوکاروں میں سے تھے۔

نسب ابھی کہا جا چکا ہے کہ ذوالکفل (علیہ السلام) کے متعلق قرآنِ عزیز نے نام کے سوا کچھ نہیں بیان کیا۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کچھ منقول نہیں ہے لہٰذا قرآن و حدیث کی روشنی میں اس سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا کہ ذوالکفل (علیہ السلام) خدا کے برگزیدہ نبی اور پیغمبر تھے اور کسی قوم کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اس سے زائد سے سکوت ہے، اس کے بعد دوسرا درجہ سِیَر و تواریخ کا ہے لیکن کافی تفتیش و جستجو کے بعد بھی ہم کو اس سلسلہ میں ایسی معلومات بہم نہیں پہنچ سکیں کہ جن کے ذریعہ سے ذوالکفل (علیہ السلام) کے حالات و واقعات پر مزید روشنی پڑ سکے، چنانچہ توراۃ بھی خاموش ہے اور اسلامی تاریخ بھی۔

آثار و روایات البتہ ابن جریر نے مشہور مفسر تابعی مجاہد سے اُن کے متعلق ایک قصہ نقل کیا ہے،

اور اسی کے قریب قریب ابن ابی حاتمؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے بھی بعض آثار نقل کیے ہیں جن کی سند منقطع[1] ہے۔ مجاہدؒ کی روایت یہ ہے:

جب اسرائیلی نبی حضرت الیسع (علیہ السلام) بہت بوڑھے ہوگئے تو ایک دن ارشاد فرمایا۔ کاش میری زندگی ہی میں کوئی شخص ایسا ہوتا جو میرا قائم مقام ہوسکتا اور مجھ کو یہ اطمینان ہوجاتا کہ وہ میری صحیح نیابت کرنے کا اہل ہے۔ اس کے بعد انھوں نے بنی اسرائیل کا اجتماع کیا اور فرمایا: میں تم میں سے ایک شخص کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں بشرطیکہ وہ مجھ سے تین باتوں کا عہد کرے (۱) دن بھر روزہ رکھے (۲) شب کو یادِ خدا میں مشغول رہے (۳) اور کبھی غصہ نہ لائے یہ سن کر ایک ایسا شخص کھڑا ہوا جو لوگوں کی نگاہ میں بے وقعت نظر آتا تھا اور کہنے لگا "اس خدمت کے لیے میں حاضر ہوں" حضرت الیسع نے اپنی تینوں شرطیں دوبارہ بیان کیں اور دریافت کیا ان کی پابندی کروگے؟ اس شخص نے جواب دیا "بیشک"۔ دوسرا دن ہوا تو حضرت الیسع (علیہ السلام) نے پھر اجتماع کیا اور کل کی بات کو دُہرایا۔ سب خاموش رہے اور وہی شخص پھر آگے بڑھا اور اس نے خود کو اس خدمت کے لیے پیش کرتے ہوئے تینوں شرطیں پوری کرنے کا عہد کیا تب الیسع (علیہ السلام) نے اُس کو اپنا خلیفہ بنا دیا۔ ابلیس نے دیکھا تو اس سے برداشت نہ ہوسکا اور اس نے اپنی ذریت کو جمع کرکے کہا کہ ایسی صورتیں اختیار کرو کہ جن سے یہ شخص بہک جائے اور اپنی شرطوں پر قائم نہ رہ سکے۔ شیاطین نے بہت کوشش کی مگر سب ناکام رہے۔ تب ابلیس نے کہا کہ میں ہی اس کام کو انجام دے سکوں گا تم عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔

الیسع (علیہ السلام) کے خلیفہ کا یہ دستور تھا کہ وہ دن رات میں صرف دوپہر کو تھوڑی دیر قیلولہ کیا کرتا اور کچھ سو کر تکان رفع کرلیتا تھا۔ چنانچہ ایک دن ابلیس پراگندہ حال بوڑھے کی شکل میں اُسی وقت اس کے دروازہ پر پہنچا اور دروازہ پر ہاتھ مارا۔ وہ شخص آرام چھوڑ کر آیا اور دریافت کیا

[1] یعنی ان دونوں بزرگوں کے اور ان سے روایت کرنے والے راوی کے درمیان ایک یا چند نام مذکور نہیں کہ جن سے سلسلۂ روایت متصل اور مسلسل ہوجاتا۔ ایسی سند کو اصطلاح میں منقطع کہا جاتا ہے۔

کون ہے؟ ابلیس نے جواب دیا: ایک مظلوم ناتواں بوڑھا ہے" اس نے دروازہ کھول دیا اور حال دریافت کیا۔ ابلیس نے کہا کہ میرے اور میری قوم کے درمیان خصومت ہے، انھوں نے مجھ پر ظلم کر رکھا ہے اور داستانِ ظلم کو اتنا طول دیا کہ قیلولہ کا وقت ختم ہو گیا۔ بنی اسرائیل کے اس امیرؑ نے فرمایا: اب تم جاؤ شام کو جو مجلس منعقد ہوگی تب تم آنا میں تمھاری دادرسی کرونگا۔ وہ چلا گیا۔ شام کو جب مجلس منعقد ہوئی تو خلیفہ نے دیکھا کہ وہ شخص موجود نہیں ہے اور مجلس برخاست بھی ہو گئی مگر وہ نہیں آیا۔ صبح کو جب پھر مجلس میں بیٹھا تو چہار جانب غور سے دیکھا کہ شاید اب آیا ہو مگر اس کو نہ پایا۔ مجلس برخاست ہونے پر جب اُس نے قیلولہ کے لیے تنہائی اختیار کی تو پھر کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اسی بوڑھے کو موجود پایا اور اس کل کی طرح پھر گفت وشنید کی۔ تب خلیفہ نے کہا: میں نے تم سے کہا تھا کہ شام کو مجلس میں آنا، مگر تم نہ آئے؟ ابلیس نے جواب دیا میری قوم بہت ہی خبیث ہے، جب آپ کو مجلس میں پاتی ہے تو آہستہ سے مجھ سے اقرار کر لیتی ہے کہ مرافعہ نہ کرو ہم تمھارا حق ضرور دیدیں گے لیکن آپکے مجلس برخاست کردینے کے بعد پھر منکر ہو جاتی ہے۔ خلیفہ نے کہا: آج شام کو ضرور آجانا میں اپنی موجودگی میں حق رسی کروں گا۔ اس گفت وشنید میں قیلولہ کا وقت پھر جاتا رہا اور خلیفہ کو نیند کی تکلیف نے بہت ستایا۔ مگر شام کی مجلس حسب وعدہ منعقد کی اور دادرسی کے لیے بیٹھا چاروں طرف نگاہ پھرائی مگر اس بوڑھے کو نہ پایا اور نہ صبح کی مجلس میں وہ حاضر ہوا۔ تب تیسرے دن جب نیند کے غلبہ نے عاجز کر دیا تو خلیفہ نے اہلِ خانہ کو حکم دیا کہ آج دروازہ پر خواہ کوئی شخص بھی آئے قیلولہ کے وقت دروازہ ہرگز نہ کھولیں۔ خلیفہ ابھی لیٹا ہی تھا کہ فوراً ابلیس بوڑھے کی شکل میں آموجود ہوا اور دروازہ پر دستک شروع کر دی۔ اندر سے جواب ملا کہ آج خلیفہ کا یہ حکم ہے کہ کسی کے لیے دروازہ نہیں کھولا جائے گا۔ ابلیس نے کہا میں دو روز سے اپنے ایک اہم معاملہ میں حاضر ہو رہا ہوں اور خلیفہ نے مجھ کو اس وقت بلایا تھا اس لیے دروازہ کھول دو۔ مگر دروازہ نہ کھُلا لیکن اہلِ خانہ نے دیکھا کہ باہر کا دروازہ بند ہونے کے باوجود وہ شخص اندر

موجود ہے اور خلیفہ کے کمرہ کے دروازہ پر دستک دے رہا ہے۔ خلیفہ نے دروازہ کھولا اور گھر والوں سے کہا: میں نے تم کو منع کر دیا تھا کہ آج دروازہ نہ کھولنا پھر یہ شخص کیسے داخل ہو گیا ساتھ ہی دروازہ پر نظر کی تو اس کو بند پایا اور بوڑھے کو اپنے قریب دیکھا تب خلیفہ حقیقتِ حال کو سمجھا، اور اس نے ابلیس کو مخاطب کر کے کہا: خدا کے دشمن کیا تو ابلیس ہے؟ ابلیس نے کہا: ہاں میں ابلیس ہوں تو نے مجھ کو جب ہر طرح تھکا دیا۔ اور میری ذریت کسی طرح تجھ پر قابو نہ پا سکی تب میں نے آخری صورت یہ اختیار کی تھی تاکہ تجھ کو غضبناک کروں اور ایفاءِ شروط میں ناکام بنا دوں، مگر افسوس کہ میں خود ہی ناکام رہا۔ چنانچہ اس واقعہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کو ذوالکفل کے نام سے مشہور کر دیا، اس لیے کہ اُس نے جن شرائط کا حضرت الیسع (علیہ السلام) سے تکفل کیا تھا اُس کو پورا کر دکھایا۔[1]

تنقید | مجاہد کی یہ روایت اپنی سند کے اعتبار سے بھی محلِ نظر ہے اور درایت کے لحاظ سے بھی ناقابلِ حجت ہے اور جو اثر ابن عباسؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ سے منقول ہے وہ منقطع بھی ہے اور سند کے پیشِ نظر محلِ نظر بھی، اس لیے اُن کی حیثیت ایک قصہ سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ درایت کے اعتبار سے ہم نے ان کو ناقابلِ حجت اس لیے کہا کہ قرآنِ عزیز نے اگرچہ ذوالکفل (علیہ السلام) کے واقعات و حالات بیان نہیں کیے لیکن ان کو انبیاء و مرسلین کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ اس لیے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جیسے جلیل القدر صحابہ اور مجاہد جیسے تابعی سے یہ مستبعد ہے کہ وہ اُن کے متعلق یہ فرمائیں کہ وہ نبی نہیں تھے بلکہ ایک مردِ نیک تھے جیسا کہ ابن کثیر نے ان تینوں بزرگوں سے اسی قصہ میں نقل کیا ہے اور شاہ عبدالقادر (رحمہ اللہ) ارشاد فرماتے ہیں کہ ذوالکفلؑ ایوب (علیہ السلام) کے بیٹے تھے اور انھوں نے حسبۃً للہ کسی شخص کی ضمانت کر لی تھی جس کی پاداش میں ان کو کئی برس قید کی تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔

کہتے ہیں ذوالکفل تھے ایوبؑ کے بیٹے۔ ایک شخص کے ضامن ہو کر کئی برس قید رہے اور للہ یہ محنت سہی۔[2]

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۱۹۰-۱۹۱ [2] موضح الفرقان سورۂ انبیاء۔

اور بعض معاصرین کا یہ خیال ہے کہ ذوالکفل حزقیل (علیہ السلام) کا لقب ہے اور ایک دوسرے معاصر کی عجیب رائے یہ ہے کہ ذوالکفل "گوتم بدھ" کا لقب ہے اس لیے کہ اس کے دارالسلطنت کا نام "کپل" تھا جس کا معرب "کفل" ہے اور عربی میں "ذو" صاحب اور مالک کے لیے آتا ہے چنانچہ صاحب مال کے لیے "ذومال" اور مالکِ شہر کے لیے "ذوبلد" بہ کثرت استعمال ہے اس لیے یہاں بھی کپل کے مالک اور بادشاہ کو "ذوالکفل" کہا گیا۔ معاصر موصوف نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ گوتم بدھ کی اصل تعلیم توحید اور حقیقی اسلام کی ہی تعلیم تھی اور موجودہ شکل وصورت دوسرے ادیان وملل کی طرح مسخ اور محرف شدہ ہے۔ مگر یہ اقوال تخمینی آراء سے زیادہ تاریخی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔

ہم اس تعصب کے قائل نہیں ہیں کہ اگر صحیح تاریخ سے یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن نے جن انبیاء کے صرف نام ذکر کیے ہیں اُن کا مصداق فلاں برگزیدہ ہستی ہے تو صرف اس لیے انکار کر دیا جائے کہ اس سے قبل ایسی بات چونکہ کسی نے نہیں کہی اس لیے قابلِ رد ہے۔ بلاشبہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخی حقائق کی جستجو کا باب بند نہیں ہوا اور ہر دن نئی نئی تحقیقات سامنے آتی اور جدید اکتشافات کو منکشف کرتی جاتی ہیں بلکہ ان کے ذریعہ قرآنِ عزیز اور احادیثِ رسول کے بیان کردہ ان واقعات کی تصدیق ہوتی چلی جا رہی ہے جن کا انکار ملاحدہ اس لیے کرتے رہے تھے کہ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ اُن کا ساتھ نہیں دیتے پس اگر قرآنِ عزیز کی بیان کردہ کسی ہستی کے متعلق مزید اکتشافات روشنی میں آئیں تو ہمارے لیے باعثِ انکار نہیں بلکہ مخالفین ومعاندین پر مزید حجت ودلیل ہیں لیکن اس اقرارِ حقیقت کے باوجود اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ کسی واقعہ کے متعلق اگر ایک شخص محض اپنے مزعومہ قیاس وتخمین سے بے دلیل کوئی دعویٰ کر دے تو ضرور اس کو مان لیا جائے، چنانچہ ذوالکفل کو گوتم بدھ قرار دینا ابھی تک اس سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

ہمارے لیے دنیا کے مختلف گوشوں میں خدا کے فرستادہ نبیوں پر ایمان لانے کے لیے

قرآن کی وہ تینوں دفعات کافی ہیں جو دینِ حق (اسلام) کا طغرائے امتیاز ہیں یعنی:

(۱) "وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ" اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں خدا کی جانب سے کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

(۲) مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ بعض نبیوں کا ہم نے تم کو (نام لے کر) ذکر سنا دیا اور بعض کے واقعات تم کو نہیں سنائے۔

(۳) لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (اس لیے ایک مومن کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ) ہم خدا کے نبیوں میں سے کسی نبی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے یعنی سب نبیوں پر ایمان لاتے ہیں۔

اس صاف اور واضح عقیدہ کے بعد اگر ہمارے سامنے کسی ملک اور کسی خطہ کے انبیاء و رسل کے واقعات نہیں بھی آئے تو اس کے وجوہ و اسباب دوسرے ہیں لیکن جہاں تک اُن پر ایمان لانے کا تعلق ہے وہ اجمال کے ساتھ بھی کافی ہے اور اُن کی تفصیلات ہمارے مقاصد ہدایت و رشد یعنی ایمان باللہ اور عمل صالح کے لیے موقوف علیہ نہیں ہیں خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "خاتم النبیین" ہیں اور تمام سچے ادیان و ملل کی صحیح اور حقیقی تعلیم کی تصدیق کر کے اُن کو ارتقائی درجات کے درجۂ کمال تک پہنچانے والے ہیں۔ "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"

الحاصل ہم کو یہ تسلیم ہے کہ ہندوستان میں بھی خدا کے سچے نبی اور پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں بلکہ سیر کی روایات کے مطابق ابوالبشر آدم (علیہ السلام) اسی ہندوستان جنت نشان کے کسی گوشہ میں اتارے گئے لیکن جب تک قرآن و حدیث کی صراحت اور یا پھر تاریخ کے صحیح دلائل و براہین سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ "ذوالکفل" "گوتم بدھ" کا لقب ہے، محض ظن و تخمین سے اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جس طرح کسی نبی کو نبی نہ ماننا کفر کی راہ ہے اسی طرح کسی

غیرنبی کو نبی تسلیم کرنا بھی باطل ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ | امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: بنی اسرائیل میں ایک شخص کِفل تھا، انتہا درجہ کا فاسق وفاجر، ایک مرتبہ اُس کے پاس ایک حسین وجمیل عورت آئی۔ کِفل نے اُس کو ساٹھ دینار دے کر زنا پر راضی کرلیا۔ لیکن جب اس نے عورت کے ساتھ مباشرت کا ارادہ کیا تو وہ کانپنے اور زار زار رونے لگی۔ کِفل نے دریافت کیا کیوں روتی ہے کیا مجھ سے نفرت کرتی ہے؟ عورت نے جواب دیا: یہ بات تو نہیں ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں نے ساری عمر کبھی اس بدعمل کو نہیں کیا مگر آج ضرورت اور پیٹ کی خاطر اپنی عصمت کو برباد کر رہی ہوں۔ یہ نشتر ہے جو مجھ کو آہ وزاری کے لیے مجبور کر رہا ہے۔ کِفل نے یہ سُنا تو فوراً اس سے الگ ہوگیا اور کہنے لگا: جو کار بد تو نے کبھی نہیں کیا، آج وہ محض فقر وفاقہ کی خاطر کرے یہ کبھی نہ ہوگا، جا عصمت وعفت کے ساتھ اپنے گھر واپس جا اور یہ دینار بھی تیری ملک ہیں ان کو اپنے کام میں لا۔ اور پھر کہنے لگا: قسم بخدا آج کی گھڑی سے کِفل اب کبھی خدا کی نافرمانی نہیں کریگا۔ حسنِ اتفاق کہ اسی شب میں کِفل کا انتقال ہوگیا اور صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ غیب کے ہاتھ نے اس کے دروازہ پر یہ بشارت لکھ دی ہے "کِفل کو بے شبہ خدا نے بخش دیا۔"

اس روایت میں ذوالکفل نہیں بلکہ فقط کِفل مذکور ہے اور یہ حضرت ذوالکفل کے سوا دوسرا کوئی شخص ہے اس لیے یہ مغالطہ نہ ہونا چاہیے کہ یہ حضرت ذوالکفل (علیہ السلام) کا واقعہ ہے۔

موعظت | اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اپنی "دعوتِ حق کی" بنیاد اس اصل پر قائم کی ہے کہ ملک وقوم اور نسل وخاندان کے تفرقوں سے بالاتر ہوکر یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ پیامِ حق اپنی اساس وبنیاد میں کسی حدبندی اور گروہ بندی کا محتاج نہیں ہے اور نہ وہ کسی فرقہ کی اجارہ داری قبول کرتا ہے اس لیے کہ ذاتِ حق (جل مجدہٗ) جبکہ یکتا اور بے ہمتا ہے تو

بلاشبہ اس کا پیغامِ حق بھی ایک ہی ہونا چاہیے اور وہ ایک ہی ہے اور اس کی صدائے حق نیوش ازل سے اب تک کالے اور گورے، عجمی اور عربی، ایشیائی اور یورپی، امریکی اور افریقی، سب بندھنوں سے بے قید یکساں طور پر تغیر و تبدل سے آزاد سب ہی پر حاوی اور سب ہی میں جاری و ساری ہے۔

البتہ ہر ایک زمانہ کے حالات و کیفیات اور وقتی تقاضوں نیز اقوام و امم کے نشو و ارتقاء اور ان کی فکری و عملی صلاحیتوں کے پیشِ نظر اُس میں یہ لچک ضرور رہی ہے اور رہنی چاہیے تھی کہ اساس و بنیاد متأثر ہوئے بغیر اُس پیغامِ حق کی تفصیلات و احکامات جدا جدا ہوں یہاں تک کہ روحانی نشو و ارتقاء اپنے حدِ کمال کو پہنچ جائے اور انسانی فکر و نظر کا شعور کمالِ عروج حاصل کر لے۔

پس دینی اور روحانی اصطلاح میں پیغامِ حق کی اس نہ بدلنے والی حقیقت کو "دین" کہتے ہیں اور حق تعالیٰ نے اسی کو "اسلام" کے ساتھ معنون کیا ہے:

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ	بلاشبہ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ (آل عمران پ ۳ ع)
وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران پ ع)	اور جو شخص بھی اسلام کے سوا دین کے نام سے کسی شے کا متلاشی ہے اس کی یہ خواہش خدا کے حضور میں ناقابلِ قبول ہے۔
هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا۔ (حج پ ع)	اُسی (خدا) نے تمہارا (انسانوں) کا نام قرآن کے نزول سے پہلے بھی مسلمان رکھا اور اس قرآن میں بھی یہی نام دیا۔

اور اس حقیقت کی بدلتی ہوئی کیفیات اور وقتی حوادث کے زیرِ اثر احکامات و تفصیلات کا نام "منہاج و شریعت" رکھا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا (مائدہ پ ع)	تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے جدا جدا راستے (شریعتیں) اور طریقے مقرر کر دیے ہیں۔

اور روحانی و دینی نشو و نما اور عروج و ارتقاء کے حدِ کمال کو "اکمالِ دین" اور "اتمامِ نعمت" فرمایا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ (المائدہ پ ۶)

مسلمانو! آج ہم نے تمھارے دین کو کامل واکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے اعتبار سے پسند کر لیا۔

تو اب حاصل یہ نکلا کہ آدم (علیہ السلام) سے شروع ہو کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دور تک تمام نبیوں اور رسولوں کا دین اور خدا کا دیا ہوا پیغام حق ہمیشہ ہمیشہ ایک ہی رہا ہے جس کا نام اسلام ہے البتہ انبیاء و مرسلین کے اپنے اپنے زمانوں میں بلاشبہ حق تعالیٰ کی جانب سے احکامات وتفصیلات جدا جدا رہی ہیں جس کو "شریعت" اور "منہاج" کہا جاتا ہے۔ اور جب روحانی ارتقاء اور دینی فکر و شعور بلوغ وکمال کی حد پر پہنچ گیا تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت اُن تمام شریعتوں کو آخری شریعت محمدی میں جذب کر دیا گیا۔ اور ہمیشہ کے لیے اُس کا دائرہ جغرافیائی حدود سے بالاتر تمام عالم وکائنات پر حاوی کر دیا گیا:۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سباء پ ۲۲ ع)

اور ہم نے آپ کو تمام کائنات انسانی کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

اور اسی لیے اس کی تعلیم کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ دنیا کے ہر گوشے اور ہر قوم کے اندر خدا کے سچے بشیر و نذیر یہی پیغام صداقت لے کر آئے ہیں اور اس لیے ایک مسلم و مومن کا یہ فرض ہے کہ وہ اس عقیدہ کا اعلان کرے کہ ہم خدا کے کسی بھی نبی کے درمیان فرق کرنا جائز نہیں رکھتے اور جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں اسی طرح خدا کے ہر نبی پر ایمان لاتے ہیں خواہ ہم اُس کے نام و مقام اور اس کے حالات و واقعات سے آگاہ ہوں یا نہ ہوں۔

(۲) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذوالکفل (علیہ السلام) انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں اور بنی اسرائیل کے اُن حالات و واقعات کے سوا جن کی تفصیلات قرآن عزیز میں مختلف انبیاء بنی اسرائیل کے ذکر میں آتی رہی ہیں اُن کے زمانہ میں کوئی خاص واقعہ ایسا پیش نہیں آیا جو عام تبلیغ وہدایت

سے زیادہ اپنے اندر عبرت وبصیرت اور موعظت کا پہلو رکھتا ہو۔ اس لیے قرآنِ عزیز نے اُن کے نام ہی پر اکتفا کیا اور حالات وواقعات سے تعرض نہیں کیا۔ کیونکہ قصص القرآن میں یہ بحث چند جگہ روشنی میں آچکی ہے کہ امم واقوامِ ماضیہ کے وقائع اور اخبار بیان کرنے سے قرآنِ عزیز کا مقصد صرف رشد وہدایت کے سلسلہ میں بصیرت وموعظت کی جانب توجہ دلانا ہے ورنہ "تاریخ" نہ اس کا موضوع ہے اور نہ اس کا مقصد، چنانچہ قرآنِ عزیز میں ارشاد ہے:۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۚ (طٰہٰ پ ع)	(اے پیغمبر) اسی طرح ہم گزری ہوئی سرگزشتوں میں سے (خاص واقعات کی) خبریں تجھے سُناتے ہیں اور بلاشبہ ہم نے اپنے پاس سے تجھے ایک سرمایۂ نصیحت عطا فرمادیا ہے (یعنی قرآن)
لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ (یوسف پ ع)	بلاشُبہ اُن (نبیوں) کے واقعات میں اہلِ عقل ودانش کے لیے سامانِ عبرت ہے۔
اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یوسف پ ع)	کیا اُنھوں نے زمین میں چل پھر کر سیر نہیں کی تاکہ وہ دیکھتے کہ ان سے اگلوں کا انجام کیا ہوا اور بلاشبہ مقامِ آخرت ان لوگوں کے حق میں بہتر ہے جو پرہیزگار ہیں۔ پس کیا وہ سمجھتے نہیں؟
وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاۗءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (ھود پ ع)	اور (اے پیغمبر) رسولوں کی سرگزشتوں میں سے جو قصے ہم تجھ کو سناتے ہیں تو اُن سب میں یہی بات ہے کہ تیرے دل کو تسکین دیدیں اور پھر اُن کے اندر تجھے امرِ حق مل گیا اور نصیحت مل گئی اور یاددہانی مومنوں کے لیے۔



حضرتِ عُزَیر (علیہ السلام)

قرآن عزیز اور حضرتِ عُزَیر علیہ السلام، واقعہ سے متعلق تاریخی بحث، واقعہ کی غلط تفسیر، حضرتِ عُزَیر اور عقیدۂ اِبْنِیَّت، ایک شبہ کا جواب، حضرتِ عُزَیر کی زندگی، حضرتِ عُزَیر اور منصبِ نبوت، نسب، وفات، بصائر۔

قرآنِ عزیز اور حضرتِ عزیر علیہ السلام

قرآنِ عزیز میں حضرتِ عُزَیر (علیہ السلام) کا نام صرف ایک جگہ سورۂ توبہ میں مذکور ہے اور اس میں بھی صرف یہ کہا گیا ہے کہ یہود عُزَیر (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں جس طرح کہ نصاریٰ عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ اس ایک جگہ کے سوا قرآن میں اور کسی مقام پر اُن کا نام لے کر اُن کے حالات وواقعات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ	اور یہودیوں نے کہا: عُزَیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے
وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ	کہا: مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ ان کی باتیں ہیں محض ان کی
ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ	زبانوں سے نکالی ہوئی۔ ان لوگوں نے بھی ان ہی کی سی
قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ	بات کہی جو اس سے پہلے کفر کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔ ان
اللّٰهُ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ (توبہ پ ۱۰ ع ۵)	پر اللہ کی لعنت، یہ کدھر بھٹکے جا رہے ہیں۔

البتہ سورۂ بقرہ میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک برگزیدہ ہستی کا اپنے گدھے پر سوار ایک ایسی بستی سے گذر ہوا جو بالکل تباہ و برباد اور کھنڈر ہو چکی تھی اور وہاں نہ کوئی مکین باقی رہا تھا اور نہ کوئی مکان، مٹے ہوئے چند نقوش باقی تھے جو اس کی بربادی اور تباہی کے مرثیہ خواں تھے، ان بزرگ نے یہ دیکھا تو تعجب اور حیرت سے کہا کہ ایسا کھنڈر اور تباہ حال ویرانہ پھر کیسے آباد ہوگا اور یہ مُردہ بستی کس طرح دوبارہ زندگی اختیار کرے گی یہاں تو کوئی بھی ایسا سبب نظر نہیں آتا؟ یہ ابھی اسی فکر میں غرق تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی جگہ اُن کی روح قبض کر لی اور سو برس تک اسی حال میں رکھا۔ یہ

مدت گزر جانے کے بعد اب ان کو دوبارہ زندگی بخشی اور تب اُن سے کہا، بتاؤ کتنے عرصہ اس حالت میں رہے ہو؟ وہ جب تعجب کرنے پر موت کی آغوش میں سوئے تھے تو دن چڑھے کا وقت تھا اور جب دوبارہ زندگی پائی تو آفتاب غروب ہونے کا وقت قریب تھا اس لیے انھوں نے جواب دیا: ایک دن یا اس سے بھی کم۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسا نہیں ہے بلکہ تم سو برس تک اس حالت میں رہے ہو اور اب تمھارے تعجب اور حیرت کا یہ جواب ہے کہ تم ایک طرف اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ اس میں مطلق کوئی تغیر نہیں آیا، اور دوسری جانب اپنے گدھے کو دیکھو کہ اس کا جسم گل سڑ کر صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے اور پھر ہماری قدرت کا اندازہ کرو کہ جس چیز کو چاہا محفوظ رہے تو سو برس کے اس طویل عرصہ میں کسی بھی موسمی تغیرات نے اثر نہ کیا اور محفوظ و سالم رہی اور جس چیز کے متعلق ارادہ کیا کہ اُس کا جسم گل سڑ جائے تو وہ گل سڑ گیا اور اب تمھاری آنکھوں دیکھتے ہی ہم اس کو دوبارہ زندگی بخشے دیتے ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے کیا تاکہ ہم تم کو اور تمھارے واقعہ کو لوگوں کے لیے "نشان" بنا دیں اور تاکہ تم یقین کے ساتھ مشاہدہ کر لو کہ خدائے تعالیٰ اس طرح مُردہ کو زندگی بخش دیتا اور تباہ شدہ شے کو دوبارہ آباد کر دیتا ہے چنانچہ جب اس برگزیدہ ہستی نے قدرتِ الٰہی کے یہ "نشانات" دیکھنے کے بعد شہر کی جانب نظر کی تو اس کو پہلے سے زیادہ آباد اور بارونق پایا۔ تب انھوں نے اظہارِ عبودیت کے بعد یہ اقرار کیا کہ بلاشبہ تیری قدرتِ کاملہ کے لیے یہ سب کچھ آسان ہے اور مجھ کو علم الیقین کے بعد عین الیقین کا درجہ حاصل ہو گیا:۔

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ	اور کیا تم نے اُس شخص کا حال نہ دیکھا جس کا ایک بستی پر
هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ	گزر ہوا جو اپنی چھتوں سمیت زمین پر ڈھیر تھا تو وہ کہنے لگا۔
قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ	اس بستی کی موت (تباہی) کے بعد اللہ تعالیٰ کس طرح اس کو
بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ	زندگی دیگا (آباد کریگا) بس اللہ نے اُس شخص پر (اُسی جگہ)
مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ	سو برس تک موت طاری کر دی اور پھر زندہ کر دیا۔ اللہ نے

كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (بقرہ پ ۳ ع ۳)

دریافت کیا: تم یہاں کتنی مدت پڑے رہے اس نے جواب دیا: ایک دن یا دن کا بعض حصہ۔ اللہ نے کہا: ایسا نہیں ہے بلکہ تم سو برس تک اس حالت میں رہے پس تم اپنے کھانے پینے (کی چیزوں) کو دیکھو کہ وہ بگڑی تک نہیں اور پھر اپنے گدھے کو دیکھو (کہ وہ گل سڑ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے) اور (یہ سب کچھ اس لیے ہوا) تاکہ ہم تم کو لوگوں کے لیے "نشان" بنائیں اور اب تم دیکھو کہ کس طرح ہم ہڈیوں کو ایک دوسرے پر چڑھاتے اور آپس میں جوڑتے ہیں اور پھر اُن پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس کو ہماری قدرت کا مشاہدہ ہوگیا تو اس نے کہا: میں یقین کرتا ہوں کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

ان آیات کی تفسیر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص کون تھا جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تو اس کے جواب میں مشہور قول یہ ہے کہ یہ حضرتِ عُزَیر (علیہ السلام) تھے اور اللہ تعالیٰ نے اُنکو حکم فرمایا تھا کہ تم یروشلم جاؤ، ہم اس کو دوبارہ آباد کریں گے، جب یہ وہاں پہنچے اور شہر کو تباہ اور کھنڈر پایا تو بربناءِ بشریت یہ کہہ اُٹھے کہ اس مُردہ بستی کو دوبارہ کیسے زندگی ملے گی؟ اور اُن کا یہ قول بشکلِ انکار نہیں تھا بلکہ تعجب اور حیرت کے ساتھ اُن اسباب کے متلاشی تھے جن کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے برگزیدہ بندے اور نبی کی یہ بات بھی پسند نہیں آئی کیونکہ اُن کے لیے یہ کافی تھا کہ خدا نے دوبارہ اس بستی کی زندگی کا وعدہ فرمالیا ہے، چنانچہ ان کے ساتھ وہ معاملہ پیش آیا جس کا ذکر مسطورۂ بالا آیات میں ہے اور جب وہ زندہ کیے گئے تو یروشلم (بیت المقدس) آباد ہوچکا تھا۔

حضرتِ علی، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنہم) اور قتادہ

سلیمان حسن (رحمہم اللہ) کا رجحان اسی جانب ہے کہ یہ واقعہ حضرتِ عزیر (علیہ السلام) سے متعلق ہے[1]
اور وہب بن منبہ اور عبداللہ بن عبید کا اور ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن سلام کا قول یہ ہے کہ یہ شخص حضرت ارمیاہ (یرمیاہ) نبی تھے، ابن جریر طبری نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور ہمارے نزدیک بھی یہی قول راجح ہے[2]

تاریخی بحث | اور یہ اس لیے کہ جبکہ قرآن عزیز نے اس ہستی کا نام ذکر نہیں کیا اور نبیِ معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس سلسلہ میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے اور صحابہ و تابعین سے جو آثار منقول ہیں ان کا ماخذ بھی وہ روایات و اقوال ہیں جو وہب بن منبہ، کعب احبار اور حضرت عبداللہ بن سلام تک پہنچتے ہیں اور انھوں نے جن کو اسرائیلی واقعات سے نقل کر کے بیان کیا ہے تو اب واقعہ سے متعلق شخصیت کی تحقیق کے لیے صرف ایک ہی راہ باقی رہ جاتی ہے کہ توراۃ اور تاریخی مصادر سے اس کو حل کیا جائے تو اس حقیقت کے پیشِ نظر جب ہم مجموعۂ توراۃ کے صحائفِ انبیاء (علیہم السلام) اور تاریخی بیانات پر غور کرتے ہیں تب یہ تفصیلات ہمارے سامنے آتی ہیں[3]

بنی اسرائیل کی سرکشی اور شرارت حد سے تجاوز کر چکی ہے اور ظلم و فساد کا بازار گرم ہے کہ خدا کی جانب سے اس زمانہ کے پیغمبر یرمیاہ (علیہ السلام) پر وحی آتی ہے کہ بنی اسرائیل میں منادی کر دو کہ وہ اِن حرکاتِ بد سے باز آجائیں ورنہ گزشتہ قوموں کی طرح اُن کو تباہ و برباد کر دیا جائیگا یرمیاہ (علیہ السلام) نے خدا کا یہ پیغام جب بنی اسرائیل تک پہنچایا تو انھوں نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور ظلم و شرارت میں اور اضافہ اور یرمیاہ (علیہ السلام) کے ساتھ تمسخر شروع کر دیا اور انکو زندان میں ڈال دیا، اس حالت میں بھی یرمیاہ (علیہ السلام) نے ان کو بتایا کہ وہ بابل کے بادشاہ کے ہاتھوں برباد ہوں گے اور وہ اُن کو قید کر کے بابل لے جائے گا اور یروشلم کو مٹایا جائے گا[4]

تقریباً ساتویں صدی قبل مسیح کا وسط تھا کہ بابل میں بنوکد نضر (بخت نصر) کا ظہور ہوا اور

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۳۱۷ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۴۲ [2] تفسیر و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۴۴ -
[3] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۴۲-۴۶ [4] یرمیاہ نبی کا صحیفہ -

اس نے اپنی قاہرانہ اور جابرانہ طاقت سے قرب وجوار کی تمام حکومتوں کو مسخر اور زیر کرلیا اور تھوڑے عرصہ میں اس نے فلسطین پر پے بہ پے تین حملے کرکے بنی اسرائیل کو شکستِ فاش دے کر یروشلم اور فلسطین کے تمام علاقہ کو برباد کر ڈالا اور تمام بنی اسرائیل کو قید کرکے بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکاتا ہوا بابل لے گیا اور توراۃ کے تمام نسخوں کو خاکستر کردیا اور ایک نسخہ بھی اسرائیلیوں کے ہاتھ میں محفوظ باقی نہ رہا۔ جب بخت نصر اسرائیلی گھرانوں کو قید کرکے غلام بنا رہا تھا تو کسی شخص نے اس سے یہ کہا کہ یہاں ایک شخص یرمیاہ زندان میں قید ہے اُس نے تیرے اس حملہ سے پہلے ان سب حالات کے متعلق پیشین گوئی کرکے بنی اسرائیل کو ڈرایا تھا مگر اس کی قوم نے اُس کی بات پر کان نہ دھرا اور اس کو زندان میں ڈال دیا۔ بخت نصر نے یہ سُنا تو یرمیاہ (علیہ السلام) کو قید خانہ سے باہر نکالا اور اُن سے بات چیت کرتا رہا۔ یرمیاہ (علیہ السلام) کی علم و دانش سے معمور گفتگو سُن کر اُس نے خواہش کی کہ وہ بھی اس کے ساتھ بابل چلیں وہ اُن کو احترام سے رکھے گا۔ مگر حضرتِ یرمیاہ نے یہ کہہ کر اس کی خواہش کو رد کردیا کہ جبکہ میری قوم اس ذلت کے ساتھ بابل جا رہی ہو میں اس عزت کے مقابلہ میں اپنی موجودہ حالت کو ترجیح دیتا ہوں[۱] چنانچہ انھوں نے یروشلم سے دور کسی جنگل میں بود و ماند اختیار کرلی اور یرمیاہ نبی کے صحیفہ میں ہے کہ انھوں نے وہیں بیٹھ کر بابل میں اسرائیلیوں کو یہ پیشین گوئی تحریر کے ذریعہ پہنچائی تھی کہ بنی اسرائیل ستر سال بابل میں اس ذلت و خواری کے ساتھ غلام رہیں گے اور اس کے بعد وہ پھر اپنے وطن میں آکر بسیں گے[۲]۔

چنانچہ بخت نصر کی ہلاکت کے عرصۂ دراز کے بعد جب تقریباً ۵۳۹ھ ق م میں فارس کے بادشاہ سائرس (کیخسرو) نے بابل کے بادشاہ بیل شاہ زار کو شکست دے کر فارس کو اس کے بے پناہ مظالم سے نجات دلائی تو اسی زمانہ میں اس نے بنی اسرائیل کو بھی آزاد کیا اور یروشلم اور ہیکل کی تعمیر کے لیے اُن کو اجازت دی۔

شاہ خورس (کیخسرو) فتح بابل کے بعد تقریباً دس برس اور زندہ رہا اور اسی دوران میں بنی اسرائیل آزاد ہو کر بیت المقدس کی تعمیر میں مشغول ہوئے مگر جیسا کہ عزار کے صحیفہ سے معلوم

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۳۸-۳۹ صد ۲ و تاریخ ابن خلدون والسائیکلو پیڈیا آف اسلام [۲] صحیفہ یرمیاہ باب ۲۹ آیت ۱۰

ہوتا ہے یہ تعمیر اس کی زندگی میں مکمل نہیں ہوسکی اور درمیان میں بعض افسروں نے ایسی دراندازیاں کیں کہ دومرتبہ اسرائیلیوں کو اس کی تعمیر کچھ مدت کے لیے روک دینی پڑی اور کیخسرو کے بعد دارا اور دارا کے بعد اردشیر کے زمانہ میں جاکر وہ اس کو دوبارہ مکمل کرسکے۔[1]

اور یروشلم (بیت المقدس) پھر ایک مرتبہ پہلے سے زیادہ بارونق شہر نظر آنے لگا۔

ان تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ بخت نصر کے یروشلم کو تباہ کرنے اور کیخسرو سے لیکر اردشیر کے زمانے تک دوبارہ اس کے مکمل آباد ہوجانے کے درمیان جو ایک طویل مدت ہے وہی وہ وقفہ ہے جس پر یرمیاہ (علیہ السلام) کو وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیات میں کیا گیا ہے۔

قرآن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جبکہ یرمیاہ (علیہ السلام) نے بخت نصر کے ساتھ بابل جانے سے انکار کردیا اور وہ بیت المقدس کی اس تباہ حالی سے گھبراکر دور کسی جنگل میں گوشہ گیر ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بذریعہ وحی یہ حکم دیا ہوگا کہ وہ اس ویرانہ میں جاکر رہیں جو آج اگرچہ بنی اسرائیل کی تباہ کاریوں کی بدولت تباہ حال ہے مگر ہمیشہ سے نبیوں کی مقدس سرزمین رہا ہے اور یہ کہ ہم دوبارہ اس کو آباد کریں گے اور جب حضرت یرمیاہ (علیہ السلام) خدا کے حکم سے وہاں پہنچے اور اُن کی نگاہ میں اس کی بربادی کا پورا نقشہ پھر گیا تو انھوں نے حسرت و افسوس اور تعجب و حیرت کے ساتھ دل میں یا زبان سے کہا ہوگا کہ اب کون سے ایسے اسباب پیدا ہوں گے جن کے ذریعہ خدائے تعالیٰ اس مُردہ بستی کو دوبارہ زندگی بخشے گا اور پھر وہ سب کچھ پیش آیا جو زیر بحث آیات میں مذکور ہے۔

اور اگر ہم اس پر یہ اور اضافہ کردیں تو بیجا نہ ہوگا کہ خدا کی حکمت و مصلحت کا یہ تقاضا ہوا کہ جبکہ ابھی یروشلم کی دوبارہ زندگی اور آبادی میں طویل مدت باقی ہے اور یرمیاہ (علیہ السلام) قوم سے الگ اس ویرانہ میں رہیں گے تو یہ اُن کی زندگی کے لیے ناقابلِ برداشت سانحہ ہوگا لہٰذا رحمتِ حق نے اُن کے اس متعجبانہ سوال کو بہانہ بناکر اس عرصہ کے لیے اُن کو موت کی آغوش میں سُلادیا اور اُس وقت بیدار کیا جب کہ یروشلم پہلے کی طرح خوب آباد اور بارونق ہوچکا تھا۔

[1] عزرا باب ۷ آیت ۱۱

واقعات و حادثات کی اس پوری مدت میں حضرت یرمیاہ (علیہ السلام) کی عمر کا تخمینہ تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوتا ہے اور یہ مدت اس زمانہ کی عمرِ طبعی کے لحاظ سے کوئی تعجب خیز نہیں ہے۔

اس تحقیق کی تائید حضرتِ یسعیاہ (علیہ السلام) کی اس پیشین گوئی سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے سائرس نجات دہندۂ بنی اسرائیل کے متعلق ڈیڑھ سو سال قبل کی تھی[1] اس لیے کہ یسعیاہ (علیہ السلام) نبی کے انتقال سے متصل ہی یرمیاہ (علیہ السلام) کا ظہور ہوا۔ لہٰذا نجاتِ بنی اسرائیل کی درمیانی مدت کا معاملہ اُن ہی کے ساتھ پیش آسکتا ہے۔ اس کے برعکس حضرت عزیر (علیہ السلام) کی حیاتِ طیبہ کے متعلق جو تفصیلات توراۃ اور اسرائیلیات میں منقول ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابل کی اِمارت کے زمانہ میں وہ صغیر سن تھے اور اسرائیلیوں کے ساتھ بابل ہی میں رہے اور چالیس سال کی عمر میں "فقیہ" تسلیم کر لیے گئے اور وہیں منصبِ نبوت سے سرفراز ہوئے اور یروشلم کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالنے والوں کے خلاف دارا اور اردشیر کے درباروں میں جس وفد نے کوششیں کیں ان میں بھی یہی پیش پیش رہے ہیں اور توراۃ کے ناپید ہو جانے کے بعد یروشلم میں اس کی تجدید اُن ہی کے فیضانِ نبوت کا اثر تھا۔

غرض بنی اسرائیل کی اسیریِ بابل سے لے کر رہائی اور تعمیر و آبادیِ بیت المقدس تک کی درمیانی مدت میں حضرت عُزَیر (علیہ السلام)، بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔

یہ ہیں وہ شواہد و قرائن جن کی وجہ سے ہم نے مفسرین کے راجح قول کو مرجوح اور مرجوح قول کو راجح کہنے کی جسارت کی ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃِ الحال۔

مسطورۂ بالا ہر دو اقوال کے علاوہ ان آیات کے مصداق متعین کرنے میں بعض اور بھی اقوال ہیں، مثلاً حزقیل (علیہ السلام) یا بنی اسرائیل میں سے کوئی غیر معلوم شخص[2]

واقعہ کی غلط تفسیر سورۂ کہف کے تفسیری فوائد سپردِ قلم کرتے ہوئے مولانا آزاد نے ایک جگہ سورۂ بقرہ کے اس واقعہ کو حضرت حزقیل (علیہ السلام) کا مُکاشفہ قرار دیا ہے جو صحیفۂ حزقیل میں قریب قریب اس طرح مذکور ہے:[3]

[1] باب ۴۴۔ آیت ۲۸۔ [2] تفسیر ابن کثیر جلد اول ص ۳۱۴۔ [3] تفسیر ترجمان القرآن جلد ۲

ہم کو سخت تعجب ہے اور حیرت بھی کہ جب قرآن عزیز نے اس واقعہ کو صاف اور صریح طریقہ پر ایک شخص کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک معین مُدّت کے لیے موت کی آغوش میں سُلا دیا اور پھر زندہ کر کے اُس سے موت کی مدت کے بارہ میں سوال کیا جب وہ صحیح جواب نہ دے سکا تو خود اس کی تصحیح فرمائی اور اس سے متعلق شواہد کا مشاہدہ کرایا تو کس طرح مولانا آزاد نے حزقیل کے مکاشفہ کو اس واقعہ کی تفسیر یا تاویل قرار دیا۔

غور کیجیے کہ ایک برگزیدہ ہستی کا ایک ایسی کھنڈر اور ویران بستی پر گزر ہوا جو کبھی بہت ہی بارونق آباد بستی تھی اور جہاں لاکھوں انسان بس رہے تھے اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا" اُس نے یہ دیکھا تو دل میں سوچا یا زبان سے کہا کہ نہ معلوم کس طرح یہ مُردہ بستی پھر زندہ ہوگی" قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا" تب اللہ تعالیٰ نے اسی جگہ اس کی روح قبض کر لی اور سو برس تک اسی حالت میں رکھ کر دوبارہ زندہ کر دیا "فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ" اور زندگی بخشنے کے بعد اُس ہستی سے دریافت فرمایا: بتاؤ تم یہاں کتنی مدت پڑے رہے؟ برگزیدہ ہستی نے جواب دیا: ایک دن یا دن کا بعض حصہ" قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ" چونکہ جواب غلط تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح اور حقیقتِ حال کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: نہیں بلکہ سو برس تک موت کی آغوش میں سوتے رہے ہو "قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ" اور پھر اپنی قدرتِ کاملہ کے تصرفات کا مشاہدہ کرایا کہ ایک جانب اس طویل مدت کے باوجود کھانے پینے کی تمام چیزیں تر و تازہ اور موسمی اثرات سے محفوظ تھیں اور دوسری جانب ان کی سواری کا گدھا گل سڑ کر بوسیدہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا" فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ" اور پھر فرمایا کہ ہم نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ تم کو دوسروں کے لیے اپنی قدرتِ کاملہ کا ایک "نشان" بنادیں" وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ" پھر ان تمام باتوں کے بعد اس بزرگ ہستی کو مشاہدہ کرایا کہ کس طرح ہڈیوں نے آپس میں ترتیب پائی۔ پھر اُن پر گوشت چڑھا اور پھر چمڑا اور اُن کا گدھا زندہ کھڑا ہو گیا۔ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا۔

یہ سب کچھ دیکھ لینے اور مشاہدہ کر لینے کے بعد جب علم الیقین نے عین الیقین کا درجہ حاصل کر لیا تو فوراً اس برگزیدہ ہستی نے اعتراف کیا کہ بیشک خدا کی قدرتِ کاملہ کے لیے اسباب و وسائل کی حاجت نہیں وہ جس طرح چاہے بے روک ٹوک تصرف کرے کوئی اس کے لیے مانع نہیں ہے

"فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"

اب ان صاف اور واضح آیات پر دوبارہ غور کیجیئے اور سوچیے کہ قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کو ایک "حقیقی واقعہ" کی حیثیت سے بیان کیا ہے یا مجاز کے طور پر ایک "مکاشفہ" کی شکل میں۔ نیز کیا حزقیل (علیہ السلام) کے مکاشفہ اور ان آیات میں ذکر کردہ واقعہ کے درمیان مشابہت کی وجہ سے دونوں کو ایک بتانا کسی طرح صحیح ہو سکتا ہے، نہیں ہرگز نہیں۔ پس بلاشبہ مولانا آزاد کی یہ تاویل "تاویلِ باطل" ہے۔

البتہ یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ اگر حضرتِ یرمیاہ (علیہ السلام) کو یہ واقعہ پیش آیا تو اس کے قریب قریب حضرت حزقیل (علیہ السلام) کا ایک مکاشفہ بھی ہے جو مجموعۂ تورات کے صحیفۂ حزقیل میں مذکور ہے۔ اس مکاشفہ میں انھوں نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہوئی ہڈیوں کو دوبارہ زندہ ہوتے دیکھا اور خدائے تعالیٰ نے ان کو بتایا کہ اس سے یہ مراد ہے کہ بنی اسرائیل اب ناامید ہو چکے ہیں کہ ہم اس بربادی کے بعد کبھی یروشلم میں دوبارہ آباد ہوں گے۔ مگر ہم تیرے ذریعہ سے ان کو خبردار کرتے ہیں کہ خدا کا فیصلہ ہے کہ ایسا ضرور ہو گا[1]

حضرت عُزیرؑ اور عقیدۂ ابنیت

گزشتہ سطور میں ذکر آچکا ہے کہ جب بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ و برباد کر ڈالا اور بنی اسرائیل کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو بھیڑوں کی طرح ہنکا کر لے چلا تو توراۃ کے تمام نسخوں کو بھی جلا کر خاک کر دیا تھا اور بنی اسرائیل کے پاس نہ توراۃ کا کوئی نسخہ باقی بچا تھا اور نہ کوئی حافظ تھا جس کو اوّل سے آخر تک توراۃ محفوظ ہو چنانچہ اسیری کے پورے دور میں وہ توراۃ سے قطعاً محروم ہو چکے تھے لیکن جب عرصۂ دراز کے بعد اُن کو بابل کی اسیری سے نجات ملی اور وہ بیت المقدس (یروشلم) میں دوبارہ آباد ہوئے تو اب ان کو یہ فکر ہوئی

[1] حزقیل باب ۳۷ آیات ۱۴-۱

کہ خدا کی کتاب توراۃ کو کسی طرح حاصل کریں۔ تب حضرتِ عُزیرؑ (عزراہ) نبی نے سب اسرائیلیوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے توراۃ کو اول سے آخر تک پڑھا اور تحریر کرایا۔

بعض اسرائیلی روایات میں ہے کہ جس وقت انھوں نے بنی اسرائیل کو جمع کیا تو سب کی موجودگی میں آسمان سے دو چمکتے ہوئے "شہاب" اترے اور حضرتِ عُزیرؑ کے سینہ میں سما گئے تب حضرتِ عُزیرؑ نے بنی اسرائیل کو ازسرِ نو توراۃ مرتب کر کے عطا فرمائی چنانچہ جب حضرتِ عُزیرؑ اس اہم کام سے فارغ ہوئے تو بنی اسرائیل نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور ان کے قلوب میں حضرتِ عُزیرؑ کی قدر و منزلت سو گنا بڑھ گئی[1]، اور آہستہ آہستہ اس محبت نے گمراہی کی شکل اختیار کر لی کہ اُنھوں نے عُزیر (علیہ السلام) کو اسی طرح خُدا کا بیٹا مان لیا جس طرح نصاریٰ عیسیٰ (علیہ السلام) کو ابن اللہ تسلیم کرتے ہیں اور بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے اپنے اس عقیدہ کے لیے یہ دلیل قائم کر لی کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے جب ہم کو توراۃ لا کر دی تھی تو الواح پر لکھی تھی مگر عُزیر (علیہ السلام) نے تو کسی لوح یا قرطاس پر مکتوب لا کر دینے کی بجائے حرف بحرف اپنے سینہ کی لوح سے اس کو ہمارے سامنے نقل کر دیا اور عُزیرؑ میں یہ قدرت جب ہی ہوئی کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔[2] (العیاذ باللہ) سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ۔

ایک شبہ کا جواب قرآنِ عزیز کے اس اعلان پر کہ عُزیرؑ کو یہود خدا کا بیٹا کہتے ہیں آج کے بعض یہودی عالم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہم تو عُزیرؑ کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے اس لیے قرآن کا یہ دعویٰ غلط ہے مگر ان علماءِ یہود کا یہ اعتراض بھی اپنے پیشروؤں کی طرح تلبیس اور کتمانِ حق پر مبنی ہے ورنہ تو وہ جانتے ہیں اور اُن کے علاوہ ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے ممالکِ اسلامیہ کی سیر و سیاحت کی اور اس کو اقوامِ عالم کے مذاہب کی تحقیق سے دلچسپی رہی ہو کہ آج بھی نواحِ فلسطین میں یہود کا وہ فرقہ موجود ہے جو عُزیر (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا مانتا ہے اور رومن کیتھولک عیسائیوں کی طرح اُن کا مجسمہ بنا کر ان کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو خدا کے ساتھ ہونا چاہیے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کی زندگی مُبارک حضرت عُزیر (علیہ السلام) کی حیاتِ طیبہ سے متعلق تفصیلی حالات

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۴۵۔ [2] ایضاً ص ۴۶۔

کا کچھ زیادہ مواد کُتبِ سیر و تاریخ میں نہیں پایا جاتا اور مجموعۂ توراۃ کے صحیفۂ عزرا میں بھی خود اُن کی زندگیِ پاک پر مفصل روشنی نہیں پڑتی اور اُس کا زیادہ حصہ بنی اسرائیل کی امارتِ بابل اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے۔ البتہ تورات اور وہب بن منبہ اور کعبِ اَحبار سے منقول روایات سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ بخت نصر کے حملۂ بیت المقدس کے زمانہ میں صغیر سن تھے اور چالیس[1] برس کی عمر میں بنی اسرائیل کے منصب "فقیہ" پر فائز ہوئے اور اس کے بعد اُن کو منصبِ نبوت عطا ہوا اور وہ اور نحمیاہ نبی (علیہ السلام) بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کا فرض انجام دیتے اور اردشیر کے زمانہ میں وہ بنی اسرائیل کی مشکلات سے متعلق تعمیر بیت المقدس کو دور کرنے کے سلسلہ میں شاہی دربار میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے رہے[2]۔

اور مشہور قول کے مطابق جن بزرگوں نے سورۂ بقرہ کے واقعہ کا تعلق اُن کے ساتھ بتایا ہے انھوں نے اس سلسلہ میں بعض مزید تفصیلات حضرت عبداللہ بن سلام اور کعبِ اَحبار وغیرہ سے نقل فرمائی ہیں جن کا ذکر ابن کثیر نے بھی اپنی تاریخ میں کیا ہے اور بعض مفسرین نے بھی آیاتِ زیرِ بحث کی تفسیر کے ضمن میں اُن کو نقل کیا ہے۔

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے واقعات کے ضمن میں ایک صحیح روایت نقل کی گئی تھی کہ کسی نبیؑ کے ایک چیونٹی نے کاٹ لیا۔ انھوں نے غصہ میں چیونٹی کے سوراخ میں آگ ڈال کر تمام چیونٹیوں کو جلوا دیا، تب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ان پر عتاب فرمایا کہ تم نے ایک چیونٹی کی خطا پر تمام چیونٹیوں کو جلا دینا کس طرح جائز رکھا؟ تو اس واقعہ کے متعلق ابن کثیر نے اسحٰق بن بشیر کی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ مجاہد، ابنِ عباس اور حسن بصری وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ نبی "عزیر" (علیہ السلام) تھے[3]۔

عزیر (علیہ السلام) کے متعلق بعض اور بھی واقعات نقل کیے جاتے ہیں مگر روایت اور درایت دونوں اعتبار سے ساقطُ الاعتبار ہیں بلکہ لغو اور لاطائل ہیں، چنانچہ ابن کثیر وغیرہ نے بھی ان کو نقل کرکے رد کر دیا ہے[4]۔

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۴۲ [2] صحیفۂ عزرا [3] البدایۃ والنہایۃ و تاریخ طبری۔ [4] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۴۶۔

حضرتِ عُزیرؑ اور منصبِ نبوت

مگر یہ واضح رہے کہ جن روایات میں حضرتِ عُزیرؑ کو آیاتِ مسطورۂ بالا کا مصداق قرار دیا گیا ہے اُن میں یہ بھی تصریح ہے کہ عزیر (علیہ السلام) نبی نہیں تھے بلکہ "مردِ صالح" تھے۔ حالانکہ جمہور کا قول یہ ہے کہ حضرتِ عزیرؑ "نبی" تھے اور قرآنِ عزیز نے بھی جس انداز اور اسلوب سے اُن کا ذکر کیا ہے وہ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور گمراہ یہودیوں نے اُن کو اسی طرح "ابن اللہ" بنا لیا جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو۔ نیز توراۃ بھی اُن کے نبی ہونے کا اقرار کرتی ہے۔

علاوہ ازیں جو حضرات ایک طرف سورۂ بقرہ کی زیرِ بحث آیات کا مصداق عزیر (علیہ السلام) کو بتاتے ہیں اور دوسری جانب اُن کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں اُن کے لیے یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بقرہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بلاواسطہ خطاب فرمایا ہے اور ان سے ہم کلام ہوا ہے اور یہ اُن کے نبی ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

بہرحال عزیر (علیہ السلام) کے نبی ہونے کے متعلق دو قول ہیں اور راجح قول یہی ہے کہ وہ بلاشبہ خدا کے پیغمبر ہیں۔

نسب

عزیر (علیہ السلام) کے والد اور سلسلۂ نسب کے بعض دوسرے ناموں میں مؤرخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ حضرت ہارون بن عمران (علیہ السلام) کی نسل سے ہیں۔

ابن عساکر ان کے والد کا نام جروہ بتاتے ہیں اور بعض سُوریق اور بعض سرخا بیان کرتے ہیں اور صحیفۂ عزرا میں ہے کہ اُن کا نام خلقیاہ تھا۔

وفات اور قبرِ مبارک

ابن کثیر نے وہب بن منبہ، کعب احبار اور عبد اللہ بن سلام سے عزیر (علیہ السلام) کے متعلق جو طویل روایت نقل کی ہے اس میں ہے کہ عزیر (علیہ السلام) نے بنی اسرائیل کے لیے توراۃ کی تجدید عراق کے اندر دیرِ حزقیل میں کی تھی اور اسی نواح کے ایک قریہ سائر آباد میں اُن کی وفات ہوئی[1]۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ بعض آثار میں موجود ہے کہ اُن کی

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۴۵۔

قبر دمشق میں ہے۔[1]

بصائر حضرتِ عزیر (علیہ السلام) کے واقعات کو جو حضرات قصہ کہانی کی بجائے تاریخی حقائق سمجھتے ہیں وہ بلاشبہ اس سے بہت اہم نتائج اخذ کر سکتے ہیں اور کیا عجب ہے کہ وہ حسب ذیل بصائر و عبر کو بھی اسی سلسلہ کی کڑی سمجھیں۔

(۱) انسان کتنا ہی معراجِ ترقی اور بامِ رفعت پر پہنچ جائے اور خدائے تعالیٰ کے ساتھ اُس کو زیادہ سے زیادہ بھی قرب حاصل ہو جائے تب بھی وہ "خدا کا بندہ" ہی رہتا ہے اور کسی بھی مقامِ بلند پر پہنچ کر وہ خدا یا خدا کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس وحدہٗ لاشریک لہٗ اور باپ اور بیٹے کی نسبتوں سے پاک اور وراء الوراء ہے لہٰذا یہ انسان کی سب سے بڑی گمراہی ہے کہ وہ جب کسی برگزیدہ انسان سے ایسے امور صادر ہوتے دیکھتا ہے جو عام طور پر عقل کے نزدیک حیرت زا اور تعجب خیز ہوں تو وہ رعب یا انتہاء عقیدت کی وجہ سے پکار اُٹھتا ہے کہ یہ ہستی تو خدا کا اوتار (خدا بشکلِ انسان) یا اُس کا بیٹا ہے اور وہ یہ نہیں سوچتا کہ بلاشبہ ان واقعات کا صدور خدا کی طاقت کے ذریعہ بطور "نشان" اس کے ہاتھوں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ نہ خدا ہے اور نہ خدا کا بیٹا، بلکہ اس کا ایک مقرب بندہ ہے اور یہ امور خدا کے خاص قوانین کے ماتحت محض اس کی تائید اور اس کی صداقت کے لیے ظاہر ہوتے ہیں۔ ورنہ تو یہ بھی خدا کے سامنے اسی طرح مجبور ہے جس طرح دوسری مخلوق۔ چنانچہ قرآنِ عزیز نے جگہ جگہ اس حقیقت کو واضح کر کے انسان کو اس گمراہ کن عقیدت سے سختی کے ساتھ باز رکھا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کے اس واقعہ کو ابراہیم (علیہ السلام) کے اُس واقعہ سے متصل بیان فرمایا ہے جس میں مذکور ہے کہ انھوں نے بھی ایک مرتبہ خدائے تعالیٰ سے یہ دریافت کیا تھا کہ مجھ کو یہ بتا کہ تو کس طرح مردہ میں جان ڈال دیتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اُن سے یہ سوال کیا کہ ابراہیم! کیا تم اس مسئلہ پر ایمان نہیں رکھتے؟ تب ابراہیم (علیہ السلام) نے جواب میں عرض کیا: خدایا! میں بے شک اس پر ایمان رکھتا ہوں کہ تو مُردہ کو زندہ کر دیتا ہے مگر میرے سوال کا

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۴۳۔

مقصد قلبی اطمینان حاصل کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ نے پہلے واقعہ کو اس واقعہ کے ساتھ اس غرض سے بیان فرمایا ہے تاکہ یہ مسئلہ واضح اور روشن ہو جائے کہ انبیاء (علیہم السلام) کی جانب سے ان سوالات کا پیش آنا اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ "احیاءِ موتی" کے بارے میں شک رکھتے اور اس کو دور کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان کے استفسار کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کو اس کے بارے میں جو "علم الیقین" حاصل ہے وہ "عین الیقین"[1] اور "حق الیقین" کے درجہ تک پہنچ جائے یعنی وہ جس طرح دل سے اس پر یقین رکھتے ہیں اسی طرح وہ چاہتے ہیں کہ آنکھوں سے بھی مشاہدہ کرلیں کیونکہ وہ مخلوقِ خدا کی رُشد و ہدایت پر مامور ہونے کی وجہ سے جن ذمہ داریوں کے حامل ہیں ان کی تبلیغ و دعوت کو باحسن وجوہ انجام دے سکیں اور یقین کا کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ ایسا باقی نہ رہے جو اُن کو حاصل نہ ہو۔

(۳) دنیا "دار العمل" ہے اور "دار الجزاء" ایک دوسرا عالم ہے جس کو "دارِ آخرت" کہا جاتا ہے لیکن عادۃ اللہ یہ جاری ہے کہ "ظلم" اور "کبر" دو ایسے عمل ہیں کہ ظالم اور متکبر کو اس دنیا میں بھی ضرور ذلت و رسوائی کا پھل چکھاتے ہیں، خصوصاً جبکہ یہ دونوں اعمالِ بد افراد کی جگہ قوموں کا مزاج بن جائیں اور اُن کی طبیعت کا جزو ہو جائیں۔ "قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ"[2] لیکن یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ قوموں کی اجتماعی حیات کی بقاء و فنا کی عمر انفرادی زندگی سے جُدا ہوتی ہے اس لیے ان کے پاداشِ عمل کی تاخیر سے کبھی بھی باہمت اور صاحبِ استقلال انسان کو گھبرانا اور مایوس ہونا نہیں چاہیے اس لیے کہ خدا کا بنایا ہوا قانون "پاداشِ عمل" اپنے معین وقت سے ٹل نہیں سکتا۔



[1] اس کے لیے قصص القرآن جلد اول ملاحظہ فرمائیں۔ [2] سورۂ نمل۔

حضرتِ زکریا علیہ السلام

قرآن عزیز اور حضرتِ زکریا (علیہ السلام)، نسب، حالاتِ زندگی، چند تفسیری حقائق

قرآنِ عزیز اور حضرتِ زکریا (علیہ السلام)

قرآنِ عزیز میں حضرتِ زکریا (علیہ السلام) کا ذکر چار سورتوں آلِ عمران، انعام، مریم اور انبیاء کی حسب ذیل آیات میں آیا ہے:

شمار	سورۃ	آیت	عدد
۱	آلِ عمران	۳۷-۴۱	۵
۲	انعام	۸۵	۱
۳	مریم	۲-۱۱	۱۰
۴	انبیاء	۸۹-۹۰	۲
			۱۸

ان میں سے سورۂ انعام میں تو صرف فہرستِ انبیاء میں نام ذکر کیا گیا ہے اور باقی تین سورتوں میں مختصر تذکرہ منقول ہے۔

نسب قرآنِ عزیز جن زکریا (علیہ السلام) کا ذکر کر رہا ہے، یہ وہ نہیں ہیں جن کا ذکر مجموعۂ توراۃ کے صحیفۂ زکریا میں آیا ہے اس لیے کہ توراۃ میں جن زکریا کا تذکرہ ہے اُن کا ظہور داریوس (دارا) کے زمانہ میں ہوا ہے، چنانچہ "زکریاہ نبی کی کتاب" میں ہے:

"دارا کے دوسرے برس کے آٹھویں مہینے میں خداوند کا کلام زکریاہ بن برخیاہ بن عدو کو پہنچا[1]"

اور دارا بن گشتاسپ کا زمانہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی ولادت سے پانچ سو سال قبل ہے کیونکہ وہ کیقباد بن کیخسرو کے انتقال کے بعد ۵۲۱ ق م میں تخت نشین ہوا ہے اور قرآنِ عزیز نے

[1] باب ۱- آیت ۱-

جن زکریا (علیہ السلام) کا ذکر کیا ہے وہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی والدہ حضرتِ مریم (علیہا السلام) کے مربی اور حضرتِ مسیحؑ کے معاصر ہیں اور ان کے اور یحییٰ بن زکریا اور مسیح (علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے اور یہ حضرتِ یحییٰ (علیہ السلام) کے والد ماجد ہیں[1]

حضرتِ زکریا (علیہ السلام) کے والد کا نام کیا تھا۔ اس میں اصحابِ سیر کے مختلف اقوال ہیں اور اُن میں سے کوئی قول بھی باوثوق نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں ابن عساکر سے وہ سب اقوال نقل کر دیے ہیں۔ یعنی زکریا بن اُدن (دان) یا ابن شبوی یا ابن لدن یا ابن برخیا بن مسلم[2] بن صدوق بن جشان بن داؤد بن سلیمان بن مسلم بن صدیقہ بن برخیا بن بلعاطہ بن ناحور بن شلوم بن بہفاشاط بن اینامن بن رجعام بن سلیمان بن داؤد (علیہما السلام)

لیکن یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ حضرتِ سلیمان بن داؤد (علیہما السلام) کی ذریت میں سے ہیں[3]

حالاتِ زندگی | زکریا (علیہ السلام) کی حیاتِ طیبہ کے حالات تفصیل سے معلوم نہیں ہیں لیکن جس قدر بھی قرآنِ عزیز اور سیر و تاریخ کی قابلِ اعتماد روایات سے معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

گزشتہ مباحث میں گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل میں "کاہن" ایک معزز مذہبی عہدہ تھا اور اس کے ذمہ یہ خدمت تھی کہ وہ ہیکل (صخرۂ بیت المقدس) کی مقدس رسوم ادا کیا کرے اس کے لیے مختلف قبائل میں سے الگ کاہن منتخب ہوتے اور اپنی اپنی نوبت پر اس خدمت کو انجام دیا کرتے تھے۔

چنانچہ حضرتِ زکریا (علیہ السلام)، بنی اسرائیل میں معزز کاہن بھی تھے اور جلیل القدر پیغمبر بھی، چنانچہ قرآنِ عزیز نے اُن کو انبیاء کی فہرست میں شمار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:۔

---

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۵ [2] فتح الباری جلد ۶ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۴۷
[3] تاریخ ابن کثیر جلد ۲۔ ص ۴۷۔

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس

كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ یہ سب نیکوکاروں میں سے ہیں۔

اور لوقا کی انجیل میں اُن کو کاہن[1] کہا گیا ہے:

یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں زکریاہ نام کا ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون (علیہ السلام) کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا اور وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانون پر بے عیب چلنے والے تھے[2]

مگر انجیل برنابا میں بصراحت مذکور ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے، چنانچہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) یہود کو مخاطب کرکے ارشاد فرما رہے ہیں:

وہ وقت قریب ہے جب تم پر اُن انبیاء (علیہم السلام) کا وبال پڑنے والا ہے جن کو تم نے زکریا (علیہ السلام) کے زمانہ تک قتل کیا ہے اور جبکہ زکریا (علیہ السلام) کو ہیکل اور قربانگاہ کے درمیان قتل کیا[3]

زکریا (علیہ السلام) سُلالۂ داؤد (علیہ السلام) سے تھے اور اُن کی زوجہ مطہرہ ایشاع یا الیشبع حضرتِ ہارون (علیہ السلام) کی ذریت میں سے تھیں[4]

گزشتہ مباحث میں یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ تمام انبیاء (علیہم السلام) "خواہ وہ بادشاہ اور صاحبِ حکومت ہی کیوں نہ ہوں" اپنی روزی ہاتھ کی محنت سے پیدا کرتے اور کسی کے

---

[1] اسلام کے دورِ اوّل میں عرب کے اندر جو کاہن (جوتشی) ہوتے اور مستقبل کے حالات بتایا کرتے تھے اور جن کی باتوں پر ایمان لانا اسلام کے ساتھ کفر کرنا بتایا گیا ہے وہ بنی اسرائیل کے اس منصب سے الگ شے ہے۔
[2] باب ۱- آیت ۵-۶ [3] مشہور چار انجیلوں سے الگ یہ پانچویں انجیل ہے جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کے حواری برنابا کی جانب منسوب ہے، یہ روما کے پوپ سکٹس کے کتب خانہ میں محفوظ تھی اور وہاں سے ایک اسقف نے کسی طرح حاصل کرکے اس کو شائع کردیا اور وہ مسلمان ہوگیا، کیونکہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی شہادتیں صاف اور واضح پائی جاتی ہیں۔ [4] فتح الباری جلد ۶ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲

لیے باردوش نہیں ہوتے تھے اسی لیے ہر نبی نے جب اپنی اُمت کو رُشد و ہدایت کی تبلیغ کی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا ہے وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ میں تم سے اس تبلیغ پر کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میرا اجر تو خدا کے سوا اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ چنانچہ زکریا (علیہ السلام) بھی اپنی روزی کے لیے نجاری کا پیشہ کرتے تھے جیسا کہ مسلم، ابن ماجہ اور مسند احمد میں بصراحت مذکور ہے۔

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کان زکریا نجارًا۔ (الحدیث[1])	حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، زکریا (علیہ السلام) نجاری (بڑھئی کا کام) کرتے تھے۔

اُن ہی کے خاندان یعنی سلیمان بن داؤد (علیہما السلام) کی نسل میں سے عمران بن ماثان اور اس کی بیوی حنہ بنت فاقود نیک نفس[2] انسان تھے اور پارسائی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر لاولد تھے اور جیسا کہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے تذکرہ میں تفصیل سے آئے گا، حنہ کی دعا سے ان کے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام اُنھوں نے مریم رکھا اور حنہ نے اپنی منت کے مطابق مریم (علیہا السلام) کو "ہیکل" کی نذر کر دیا۔ تو اب سوال پیدا ہوا کہ اس کی کفالت، پرورش اور نگہداشت کس کے سپرد ہو، کاہنوں کے درمیان اس "مقبول نذرِ خدا" کے بارے میں اختلاف ہو کر جب بات قرعۂ و فال پر آکر ٹھہری تو قرعہ زکریا (علیہ السلام) کے نام نکلا اور وہی مریم کے کفیل قرار پائے۔

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّاهُ (آلِ عمران)	اور زکریا (علیہ السلام) نے مریم کی کفالت کا بوجھ اپنے ذمہ رکھا
وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ	اور تم (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے پاس موجود نہ تھے
اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ	جب وہ اپنے اپنے قلم (قرعہ کے لیے) ڈال رہے تھے کہ ان
مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ	میں سے کون شخص مریم کی کفالت کرے اور نہ تم ان کے

[1] کتاب الانبیاء   [2] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۴

اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ ○ پاس تھے جب وہ مریمؑ کی کفالت کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے۔

علماءِ سیر و تاریخ کہتے ہیں کہ زکریا (علیہ السلام) یوں بھی مریم (علیہا السلام) کی کفالت کے حقدار تھے اس لیے کہ بشیر بن اسحٰق نے "المبتداء" میں نقل کیا ہے کہ زکریا (علیہ السلام) کی بیوی ایشاع (الیشع) اور حضرت مریم (علیہا السلام) کی والدہ حنہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں[1] اور خالہ بمنزلہ والدہ کے ہوتی ہے جیسا کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمارہ بنتِ حمزہ (رضی اللہ عنہ) کے متعلق فرمایا تھا کہ اُن کی پرورش حضرت جعفر (رضی اللہ عنہ) کی بیوی کریں کیوں کہ وہ عمارہ کی خالہ ہیں" والخالۃ بمنزلۃ الأم"[2]

جب مریم (علیہا السلام) سمجھ دار ہوگئیں تو زکریا (علیہ السلام) نے اُن کے لیے ہیکل کے قریب ایک حجرہ (خلوہ) مخصوص کر دیا جہاں وہ دن میں عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتی اور رات اپنی خالہ کے پاس گزارتی تھیں۔

جب زکریا (علیہ السلام) مریم (علیہا السلام) کے حجرہ (محراب) میں داخل ہوتے تو دیکھتے کہ اُن کے پاس غیر موسمی پھل رکھے ہیں۔ ایک مرتبہ تعجب سے زکریا (علیہ السلام) نے دریافت کیا۔ مریم! تیرے پاس یہ کہاں سے آئے؟ مریم (علیہا السلام) نے کہا: یہ خدا کی جانب سے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق عطا کر دیتا ہے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ	جب زکریاؑ مریمؑ کے پاس محراب (خلوہ) میں داخل ہوتا
وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يَا مَرْيَمُ	تو اس کے پاس کھانے پینے کا سامان رکھا دیکھتا زکریاؑ نے
أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ	دریافت کیا۔ مریمؑ! یہ تیرے پاس کہاں سے آتا ہے
عِنْدِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ	مریمؑ نے کہا۔ یہ اللہ کے پاس سے ہے وہ بلاشبہ جس کو
يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (پ)	چاہتا ہے بے گمان رزق عطا کر دیتا ہے۔

مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ضحاک، قتادہ۔ ابراہیم نخعی (رحمہم اللہ) رزقًا کی تفسیر میں

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۴ [2] بخاری باب الحضانۃ۔

فرماتے ہیں کہ زکریا (علیہ السلام) مریم (علیہا السلام) کے پاس غیر موسمی پھل رکھے پاتے تھے[1]۔
زکریا (علیہ السلام) کے کوئی اولاد نہیں تھی اور وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اس بات سے علاوہ کہ میں اولاد کی دولت سے محروم ہوں زیادہ فکر اس امر کا ہے کہ میرے بھائی بند ہرگز اس کے اہل نہیں ہیں کہ میرے بعد بنی اسرائیل کی رُشد و ہدایت کی خدمت انجام دے سکیں پس اگر اللہ تعالیٰ میرے کوئی نیک سرشت لڑکا پیدا کر دیتا تو مجھ کو یہ اطمینان ہو جاتا کہ بنی اسرائیل کی راہنمائی کا خدمت گزار میرے بعد موجود ہے[2]۔
مگر چونکہ اُن کی عمر بقول ابن کثیر ستّر سال اور بقول ثعلبی نوّے، بانوے یا ایک سو بیس سال ہو چکی تھی[3] اور ان کی بیوی بانجھ تھیں اس لیے بہ اسبابِ ظاہر وہ مایوس تھے کہ اب اولاد ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔
لیکن جب انھوں نے مریم (علیہا السلام) کے پاس بے موسم پھل دیکھے اور ان کو یہ معلوم ہوا کہ مریم پر خدا کا یہ فضل و انعام ہے تو اُن کے دل میں فوراً جوش پیدا ہوا کہ جو ذاتِ اقدس اس طرح بے موسم مریم کو پھل بخشتی ہے کیا وہ ہم کو موجودہ نا اُمیدی کی عالت میں ثمرِ حیات (بیٹا) نہ بخشے گی۔ پس ہماری مایوسی سرتا سر غلط ہے، بلاشبہ جس ذاتِ پاک نے مریم پر اپنا انعام و اکرام کیا ہے وہ ضرور ہم پر بھی فضل و کرم کرے گا۔ چنانچہ انھوں نے درگاہِ الٰہی میں دعا کی خدایا میں تنہا ہوں اور وارث کا محتاج، اور یوں تو حقیقی وارث صرف تیری ہی ذات ہے، خدایا مجھ کو پاک اولاد عطا فرما مجھے یقین ہے کہ تو حاجتمند کی دعا کو ضرور سنتا ہے: نبی کی دعا، اور دعا بھی صرف ذات کے لیے نہیں بلکہ قوم کی رُشد و ہدایت کی خاطر فوراً مستجاب ہوئی اور جب زکریا (علیہ السلام) ہیکل میں مشغولِ عبادت تھے تو خدا کا فرشتہ اُن پر ظاہر ہوا اور اس نے بشارت دی کہ تمہارے بیٹا پیدا ہوگا اور تم اس کا نام یحییٰ رکھنا۔ زکریا (علیہ السلام) کو یہ سُن کر بیحد مسرت ہوئی اور تعجب سے دریافت کرنے لگے یہ بشارت کس طرح پوری ہوگی؟ یعنی

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۶۰۔ [2] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۴۔ [3] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۴۹۔

مجھ کو جوانی عطا ہوگی یا میری بیوی کا مرض (بانجھ پن) دور کر دیا جائے گا۔ فرشتہ نے جواب دیا: میں اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ حالات کچھ بھی ہوں تمھارے ضرور بیٹا ہوگا۔ کیونکہ خدا کا فیصلہ اٹل ہے اور تیرا خدا کہتا ہے کہ میرے لیے یہ بہت آسان ہے یعنی جو طریقہ بھی اس کے لیے چاہوں اختیار کروں، کیا تجھ کو میں نے نیست سے ہست نہیں کیا۔

اب زکریا (علیہ السلام) نے درگاہِ الٰہی میں عرض کیا: خدایا: ایسا کوئی نشان عطا کر جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ بشارت نے وجود کی شکل اختیار کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: علامت یہ ہے کہ جب تم تین روز تک بات نہ کر سکو اور صرف اشاروں سے ہی اپنا مطلب ادا کر سکو تو سمجھ لینا کہ بشارت نے وجود اختیار کر لیا لیکن ان دنوں میں تم خدا کی تسبیح و تہلیل میں زیادہ مشغول رہنا، چنانچہ جب وہ وقت آپہنچا تو زکریا (علیہ السلام) یادِ خدا میں اور زیادہ منہمک ہو گئے اور اُمت کو بھی اشاروں سے یہ حکم دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ خدا کی یاد میں مشغول رہیں اور یہ اس لیے کہ جس طرح یحییٰ (علیہ السلام) کی ولادت کی بشارت حضرت زکریا (علیہ السلام) کے لیے باعثِ صد ہزار مسرت تھی، اسی طرح بنی اسرائیل کے لیے بھی کم خوشی کا باعث نہیں تھی کہ زکریا (علیہ السلام) کا ایک صحیح جانشین اور علم و حکمت و نبوت کا سچا وارث عالم وجود میں آنے والا ہے۔

یہی واقعات ہیں جو قرآن عزیز اور صحیح احادیث کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں اور صرف ان ہی پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ یا اسرائیلی روایات ہیں جو اکثر و بیشتر تو اس مسئلہ میں قرآن و حدیث کے بیان کردہ واقعات کی مطابقت کرتی ہیں اور بعض ساقط الاعتبار ہیں اور یا بعض وہ آثار ہیں جو روایت و درایت کے اعتبار سے ناقابلِ حجت اور غیر مستند ہیں، اور سورۂ مریم میں ہے:

كٓهٰيٰعٓصٓ ۝ ذِكْرُ رَحْمَةِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝ اِذْ نَادٰى

کاف، ہا، یا، عین، صاد (اے پیغمبر!) تیرے پروردگار نے اپنے بندے زکریا پر جو مہربانی کی تھی یہ اُس کا بیان ہے،

رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ	جب ایسا ہوا تھا کہ زکریا نے چپکے چپکے اپنے پروردگار کو پکارا،
اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَ	اس نے عرض کیا "پروردگار! میرا جسم کمزور پڑ گیا ہے میرے سر
اشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ	کے بال بڑھاپے سے بالکل سفید ہو گئے ہیں۔ خدایا! کبھی
اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝	ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تیری جناب میں دعا کی ہو اور محروم
وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ	رہا ہوں مجھے اپنے مرنے کے بعد اپنے بھائی بندوں سے
وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا	اندیشہ ہے (کہ نہ معلوم وہ کیا خرابی پھیلائیں) اور میری
فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝	بیوی بانجھ ہے، پس تو اپنے خاص فضل سے مجھے ایک
يَّرِثُنِیْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ	وارث بخش دے ایسا وارث جو میرا بھی وارث ہو اور خاندان
وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ يٰزَكَرِيَّآ	یعقوب (کی برکتوں) کا بھی اور پروردگار! اسے ایسا کر دیجیو
اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ	کہ (تیرے اور تیرے بندوں کی نظر میں) پسندیدہ ہو (اس پر
يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ	حکم ہوا) اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی پیدائش کی خوشخبری
سَمِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ	دیتے ہیں، اس کا نام یحییٰ رکھا جائے اس سے پہلے ہم نے کسی
لِیْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِیْ	کے لیے یہ نام نہیں ٹھہرایا ہے (زکریا نے متعجب ہو کر کہا) پروردگار!
عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ	میرے یہاں لڑکا کہاں سے ہوگا، میری بیوی بانجھ ہو چکی اور
عِتِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ	میرا بڑھاپا دور تک پہنچ چکا۔ ارشاد ہوا: ایسا ہی ہوگا، تیرا
رَبُّكَ هُوَ عَلَیَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ	پروردگار فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے مشکل نہیں میں نے
خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ	اس سے پہلے خود تجھے پیدا کیا۔ حالانکہ تیری ہستی کا نام و نشان
شَيْـًٔا ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ	نہ تھا، اس پر زکریا نے عرض کیا "خدایا! میرے لیے (اس
اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ	بارے میں) ایک نشانی ٹھہرا دے" فرمایا "تیری نشانی یہ ہے کہ
النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝	صحیح و تندرست ہونے کے باوجود تو تین رات لوگوں سے بات
فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ	نہ کرے گا۔ پھر وہ حجرہ سے نکلا اور اپنے لوگوں میں آیا اور انہیں

فَاَوْحٰٓی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا	اُن سے اشارہ سے کہا "صبح شام خدا کی پاکی وجلال
بُکْرَةً وَّعَشِیًّا ۝ (مریم پ۱۶ ع۱)	کی صدائیں بلند کرتے رہو۔"

اور سورۂ انبیاء میں ارشاد ہے:

وَزَکَرِیَّآ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ	اور اسی طرح زکریا (کا معاملہ یاد کرو) جب اس نے اپنے
رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ	پروردگار کو پکارا تھا "خدایا مجھے (اس دنیا میں) اکیلا نہ چھوڑ
خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا	(یعنی بغیر وارث کے نہ چھوڑ) اور (ویسے تو) تو ہی (ہم سب کا)
لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ یَحْیٰی وَاَصْلَحْنَا	بہتر وارث ہے" تو دیکھو ہم نے اس کی پکار سن لی۔ اسے (ایک
لَهٗ زَوْجَهٗ اِنَّهُمْ کَانُوْا	فرزند) یحییٰ عطا فرمایا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے تندرست
یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَ	کردیا۔ یہ تمام لوگ نیکی کی راہوں میں سرگرم تھے (اور ہمارے
یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ط	فضل سے) اُمید لگائے ہوئے اور (ہمارے جلال سے)
وَکَانُوْا لَنَا خٰشِعِیْنَ ۝	ڈرتے ہوئے دعائیں مانگتے تھے اور ہمارے آگے عجز ونیاز
(انبیاء پ۱۷ ع۶)	سے جھکے ہوئے تھے۔

اور سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہے:۔

هُنَالِكَ دَعَا زَکَرِیَّا رَبَّهٗ ج	اسی وقت زکریا نے اپنے پروردگار سے دعا کی، کہا: اے
قَالَ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ	میرے پروردگار! مجھ کو اپنے فضل سے پاکیزہ اولاد عطا کر
ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً ج اِنَّكَ سَمِیْعُ	بلاشبہ تو دعا کا سننے والا ہے۔ پھر جب زکریا حجرہ کے اندر
الدُّعَآءِ ۝ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِکَةُ	نماز میں مشغول تھا تو فرشتوں نے اس کو آواز دی کہ اللہ
وَهُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ	تجھ کو یحییٰ کی (ولادت کی) خوشخبری دیتا ہے جو شہادت
اَنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكَ بِیَحْیٰی	دے گا اللہ کے ایک کلمہ (عیسیٰ علیہ السلام) کی، اور
مُصَدِّقًا بِکَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ	صاحب مرتبہ ہوگا اور عورت کے پاس تک نہ جائے گا
وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِیًّا	(یا ہر قسم کی چھوٹی بڑی تلویث سے پاک ہوگا) اور نکوکاروں

مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ قَالَ رَبِّ	سے (ہونے ہوئے) نبی ہوگا (زکریا) نے کہا:
اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ	پروردگار! میرے لڑکا کس طرح ہوگا جب کہ میں
بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ	بہت بوڑھا ہوگیا اور میری بیوی بانجھ ہے فرمایا:
قَالَ کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَفْعَلُ	اللہ جو چاہے اسی طرح کرتا ہے۔ زکریا نے کہا
مَا یَشَآءُ ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ	پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر کیجیے۔
لِّیْٓ اٰیَۃً ۚ قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا	فرمایا: یہ نشانی ہے کہ تو تین دن لوگوں سے
تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ	اشارہ کے سوا (زبان سے) بات نہ کرے گا،
اِلَّا رَمْزًا ۚ وَاذْکُرْ رَّبَّکَ	اور اپنے رب کی یاد میں (اظہارِ شکر کے لیے)
کَثِیْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ	بہت زیادہ رہ اور صبح و شام تسبیح کر۔

وَالْاِبْکَارِ ۝ (آل عمران پ ۳ ع ۲)

چند تفسیری حقائق سورۂ آلِ عمران اور مریم میں ہے کہ جب زکریا (علیہ السلام) کو یحییٰ (علیہ السلام) کی ولادت کی بشارت دی گئی تو وہ تعجب کا اظہار کرنے لگے کہ میں ضعیف العمر اور بیوی بانجھ، پھر یہ بشارت کس طرح عالمِ وجود میں آئے گی۔ شاہ عبدالقادر (نوّر اللہ مرقدہٗ) اس کے متعلق ایک لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں:۔

"انوکھی چیز مانگتے تعجب نہیں آیا۔ جب سُنا کہ ہوگا تب تعجب کیا" [1]

گزشتہ مباحث میں یہ کئی جگہ ذکر ہو چکا ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) کی جانب سے اس قسم کے سوالات کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ خدا کی قدرتِ کاملہ کے بارے میں شک کرتے ہیں بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ اُن کو یہ بتا دیا جائے تو بہتر ہے کہ قدرتِ الٰہی کا یہ کرشمہ کس نوعیت کے ساتھ وجود پذیر ہونے والا ہے، مگر چونکہ سوال کی ظاہر سطح ایسی ہوتی ہے کہ گویا وہ اس کے وقوع کے بارہ میں متردد ہیں اس لیے سُنّت اللہ یہ جاری ہے کہ اوّل اُن کو اسی انداز

[1] موضح القرآن۔ سورۂ مریم۔

پر جواب دیا جاتا ہے تاکہ ان کو متنبہ کر دیا جائے کہ اگرچہ بہ تقاضائے بشریت اُن کا یہ سوال قابلِ گرفت نہیں ہے تاہم اُن کی شانِ رفیع سے یہ بہت نازل اور کمتر بات ہے کہ وہ مقرب بارگاہ ہوتے ہوئے اس قسم کے معاملہ میں اظہارِ تعجب کریں۔ چنانچہ شاہ عبد القادر صاحب نے اپنے مختصر سے دو جملوں میں اسی جانب اشارہ کیا ہے، لیکن ساتھ ہی سوال کی جو حقیقی روح ہے اس کے پیشِ نظر اصل جواب بھی ضرور دیا جاتا ہے تاکہ اُن کا قلب مطمئن ہو جائے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر اس مقام پر بھی اوّل زکریا (علیہ السلام) کے تعجب کے مطابق جواب دیا اور اپنی قدرتِ کاملہ کے بے روک ٹوک تصرفات کا اظہار فرمایا اور پھر زکریا (علیہ السلام) کے سوال کی حقیقی روح کے مطابق یہ جواب دیا "وَاَصْلَحْنَا لَہٗ زَوْجَہٗ" ہم نے اس کی بیوی کے مرض کو دور کر کے صحیح و تندرست کر دیا۔

(۲) سورۂ مریم میں ہے کہ حضرتِ زکریاؑ نے اولاد کی دعا مانگتے ہوئے درگاہِ الٰہی میں یہ کہا تھا: "یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ" تو یہاں وراثت سے علم و حکمت اور نبوت کی میراث مراد ہے جیسا کہ حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کے واقعات میں گذر چکا اور اس مقام پر تو یہ معنی اس لیے بھی زیادہ واضح ہیں کہ زکریا (علیہ السلام) مال و دولت سے خالی تھے اور نجاری کے ذریعہ روزانہ کی قوتِ لایموت حاصل کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس وہ دولت ہی کہاں تھی جس کی وراثت کی اُن کو تمنا ہوتی، نیز اس لیے بھی وراثتِ مالی مراد نہیں ہو سکتی کہ اگر یہ مقصد ہوتا تو زکریا (علیہ السلام) کو فقط یہ کہنا چاہیے تھا کہ "یَرِثُنِیْ" وہ میرا وارث بنے گا "یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ" کہنے کے کیا معنی؟ یحییٰ (علیہ السلام) تنہا تمام خاندانِ یعقوب (علیہ السلام) کے کس طرح مالی وارث ہو سکتے تھے۔

(۳) سورۂ آلِ عمران اور مریم میں ہے "اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا" ہم نے اس کی تفسیر جمہور کے مطابق کی ہے، چنانچہ عبد اللہ بن عباس، مجاہد، عکرمہ، قتادہ اور دوسرے علماء اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

اعتقل لسانہ من غیر	ان کی زبان تین دن کے لیے بغیر کسی مرض اور خرابی کے
مرض وَلا علة وقال زید	بندہ گئی تھی اور زید بن اسلم کہتے ہیں کہ ان کی زبان گنگ
بن اسلم من غیر خرس	کے مرض سے پاک رہتے ہوئے تین دن کے لیے بند ہو گئی
ولا یستطیع ان یکلم	تھی اور اُن میں یہ قدرت نہیں رہی تھی کہ قوم سے اشارہ
قومہ الا اشارۃ [1]	کے سوا بول سکیں۔

البتہ آیت کے اس جملہ میں سَوِیًّا کے معنی میں دو قول ہیں ایک سَوِیٌّ بمعنی صحیح و تندرست اور دوسرے بمعنی متتابعات (یعنی مسلسل تین روز) قولِ اول جمہور کا قول ہے اور عوفی نے ابن عباس (رضی اللہ عنہ) سے ایک روایت دوسرے قول کے مطابق نقل کی ہے، حافظ عماد الدین جمہور کے قول کو ترجیح دیتے ہیں[2] لوقا کی انجیل میں بھی زکریا (علیہ السلام) کے اس واقعہ کا اسی طرح ذکر ہے جس طرح اس آیت کی تفسیر میں جمہورِ علماء کا مسلک ہے۔

"زکریاہ نے فرشتے سے کہا: میں یہ بات کس طرح جانوں کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ فرشتے نے جواب میں اُس سے کہا: میں جبرئیل ہوں جو خدا کے حضور کھڑا رہتا ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھ سے کلام کروں اور تجھے ان باتوں کی خوش خبری دوں، اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا۔[3]

لیکن مولانا آزاد ترجمان القرآن میں جمہور کی تفسیر سے جُدا یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ زکریا (علیہ السلام) سے کہا گیا کہ تم بنی اسرائیل کے روزوں کی طرح تین دن کھانے پینے وغیرہ سے باز رہنے کے ساتھ ساتھ خاموشی بھی اختیار کیے رہو تو موعودہ بشارت کا وقت شروع ہو جائے گا۔" چنانچہ لوقا کی انجیل کا مسطورۂ بالا حوالہ نقل کر کے فرماتے ہیں:۔

قرآن نے یہ نہیں کہا ہے کہ حضرت زکریا گونگے ہو گئے۔ یہ یقیناً بعد کی تعبیرات ہیں جو حسب معمول

---

[1][2] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۱۱۲۔ [3] لوقا باب ۱، آیت ۱۸، ۲۰۔

پیدا ہو گئیں۔ صاف بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت زکریا کو روزہ رکھنے اور مشغولِ عبادت رہنے کا حکم ہوا اور یہودیوں کے یہاں روزہ کے اعمال میں ایک عمل "خاموشی" بھی تھی۔

"اَنْ لَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ" کی یہ تفسیر اگرچہ عربیت کے قواعد کے بموجب بن سکتی ہے لیکن سلفِ صالحین سے چونکہ باتفاق اس کے خلاف مذکور ہے اس لیے ہمارے نزدیک قابلِ قبول نہیں، رہا "گونگا ہو جانا" تو اس کے متعلق گزشتہ سطور میں نقل ہو چکا کہ یہ مسلک کسی کا بھی نہیں کہ وہ ایسے مرض میں گرفتار کر دیے گئے تھے جس کو خرس (گونگا ہونا) کہتے ہیں، بلکہ زبان میں قوتِ گویائی کے صحیح و سالم رہنے کے باوجود علامت کے طور پر تین دن کے لیے منجانب اللہ زبان میں (حصر) رکاوٹ واقع ہو گئی تھی۔

(۴) سورۂ آلِ عمران میں "وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا" کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ یہاں رزق سے مراد علم و حکمت کے صحیفے ہیں، مگر ہم نے اس قول کو اختیار نہیں کیا اس لیے کہ صاف اور متبادر معنی وہی ہیں جو جمہور سے منقول ہیں۔



حضرتِ یحییٰ علیہ السلام

قرآنِ عزیز اور حضرتِ یحییٰ (علیہ السلام) نام و نسب، حالاتِ زندگی، دعوت و تبلیغ، واقعۂ شہادت، مقتل، شبِ معراج اور یحییٰ (علیہ السلام) زکریا (علیہ السلام) کی وفات یحییٰ (علیہ السلام) اور اہلِ کتاب، بصائر۔

قرآنِ عزیز اور حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرتِ یحییٰ (علیہ السلام) کا ذکر قرآنِ عزیز میں اُن ہی سورتوں میں آیا ہے جن میں زکریا (علیہ السلام) کا ذکر ہے۔ یعنی آلِ عمران، انعام، مریم، انبیاء۔

نام و نسب یہ زکریا (علیہ السلام) کے بیٹے اور اُن کی پیغمبرانہ دعاؤں کا حاصل تھے۔ ان کا نام بھی اللہ تعالیٰ کا فرمودہ ہے اور ایسا نام ہے کہ اس سے قبل اُن کے خاندان میں کسی کا یہ نام نہیں رکھا گیا۔

یٰزَكَرِيَّآ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامِ ۣ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ (مریم پ ۱۶ ع ۱)	اے زکریا! ہم بیشک تم کو بشارت دیتے ہیں ایک فرزند کی، اس کا نام یحییٰ ہوگا کہ اُس سے قبل ہم نے کسی کے لیے یہ نام نہیں ٹھہرایا ہے۔

حالاتِ زندگی مالک بن انس فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن زکریا اور عیسیٰ بن مریم کا رحمِ مادر میں استقرار ایک ہی زمانہ میں ہوا اور ثعلبی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے چھ ماہ قبل ہوا ہے[1] اور لوقا کی انجیل میں ہے کہ جب زکریا (علیہ السلام) کی بیوی الیشع کو حاملہ ہوئے چھ ماہ گزر گئے تب جبرئیل (علیہ السلام) فرشتہ مریم (علیہا السلام) پر ظاہر ہوا اور اس نے عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق ان کو بشارت دی:

---

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۴۔

اور دیکھ تیری رشتہ دار الیشع کے بھی بڑھاپے میں بیٹا ہونے والا ہے اور اب اس کو جو بانجھ کہلاتی تھی چھٹا مہینہ ہے[1]

ان نقول کا حاصل یہ ہے کہ حضرت یحییٰ (علیہ السلام) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے چھ ماہ بڑے تھے۔

یحییٰ (علیہ السلام) کے لیے جب زکریا (علیہ السلام) نے دعا کی تھی تو اس میں یہ کہا تھا کہ وہ "ذریت طیبہ" ہو، چنانچہ قرآنِ عزیز نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا منظور فرمائی، چنانچہ یحییٰ (علیہ السلام) نیکوں کے سردار اور زہد و ورع میں بے مثال تھے، نہ انھوں نے شادی کی اور نہ ان کے قلب میں کبھی گناہ کا خطرہ پیدا ہوا اور اپنے والد ماجد کی طرح وہ بھی خدا کے برگزیدہ نبی تھے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو بچپن ہی میں علم و حکمت سے معمور کر دیا تھا اور ان کی زندگی کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ عیسیٰ (علیہ السلام) کی آمد کی بشارت دیتے اور اُن کی آمد سے قبل رشد و ہدایت کے لیے زمین ہموار کرتے تھے، چنانچہ ارشادِ مبارک ہے:

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّىْ فِى الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًاۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (آلِ عمران پ ۳ ع ۴)	پس زکریا جس وقت حجرہ میں نماز ادا کر رہا تھا تو فرشتے نے اس کو پکارا: اے زکریا: اللہ تعالیٰ تجھ کو (ایک فرزند) یحییٰ کی بشارت دیتا ہے جو اللہ کے کلمہ (عیسیٰ) کی بشارت دے گا اور وہ (اللہ کے اور اس کے بندوں کی نظر میں برگزیدہ اور گناہوں سے بے لوث ہوگا اور نکوکاروں میں سے نبی ہوگا۔

کُتبِ سِیَر میں اس مقام پر "سید" کے مختلف معنی منقول ہیں مثلاً حلیم، عالم، فقیہ، دین و دنیا کا سردار، شریف و پرہیزگار، اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور برگزیدہ لیکن آخری معنی چونکہ مسطورۂ بالا تمام معانی کو حاوی ہیں اس لیے ترجمہ میں ان ہی کو اختیار کیا گیا۔[2]

[1] باب ۱، آیت ۳۶۔ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۶۱۔

اسی طرح "حصور" کے بھی مختلف معنی مذکور ہیں" وہ شخص جو عورت کے قریب تک نہ گیا ہو" "جو ہر قسم کی معصیت سے محفوظ ہو اور اس کے قلب میں معصیت کا خطرہ بھی نہ گزرتا ہو" "جو شخص اپنے نفس پر پوری طرح قابو رکھتا اور خواہشاتِ نفس کو روکتا ہو"[1]

ہمارے خیال میں یہ سب معانی ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں اس لیے کہ لغت میں "حصر" کے معنی "رکاوٹ" کے آتے ہیں اور "حصور" اسم فاعل مبالغہ کا صیغہ ہے لہٰذا اس جگہ یہ مطلب ہے کہ خدا کے نزدیک جن امور سے رُکنا ضروری ہے اُن سے رُکنے والا "حصور" ہے اور اس لحاظ سے چونکہ یحییٰ (علیہ السلام) موصوف بہمہ صفت ہیں اس لیے مسطورۂ بالا تمام معانی بیک وقت اُن پر صادق آتے ہیں۔

ان معانی سے جُدا بعض کے نزدیک "حصور" کے معنی قوتِ مردمی سے محروم کے ہیں، مگر یہ معنی اس جگہ قطعاً باطل ہیں اس لیے کہ یہ معنی مرد کے لیے مدح کے نہیں ہیں بلکہ نقص اور عیب ہیں۔ چنانچہ اس بنا پر محققین نے اپنی تفاسیر میں اس کو مردود قرار دیا ہے اور قاضی عیاض نے شفاء میں اور خفاجی نے اس کی شرح نسیم الریاض میں اس پر سخت نکتہ چینی کر کے جمہور کے نزدیک اس قول کو باطل ٹھہرایا ہے۔

البتہ بقاءِ قوت کے باوجود اُس پر قابو پانے کے لیے خدا کے برگزیدہ انسانوں کے ہمیشہ سے دو طریقے رہے ہیں ایک یہ کہ تجرد و تبطل کی زندگی اختیار کر کے مجاہدات و ریاضات اور نفس کُشی کے ذریعہ ہمیشہ کے لیے اس کو دبا دیا جائے۔ گویا اس کو فنا کر دیا گیا عیسیٰ (علیہ السلام) کی زندگیِ مبارک میں یہی پہلو زیادہ نمایاں ہے اور یحییٰ (علیہ السلام) میں خدائے تعالیٰ نے یہ وصف بغیر مجاہدہ و ریاضت ہی کے بدءِ فطرت میں ودیعت کر دیا تھا۔

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اس درجہ قابو میں رکھا جائے اور اس پر اس حد تک ضبط قائم کیا جائے کہ وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی بے محل حرکت میں نہ آنے پائے بلکہ مختص

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۶۱۔

حرکت میں آنے کا خطرہ تک باقی نہ رہے، لیکن بقاءِ نسلِ انسانی کے لیے صحیح طریقِ کار کے ذریعہ تأہل (ازدواجی) زندگی اختیار کی جائے۔

پہلا طریقہ اگرچہ بعض حالات میں محمود ہوتا ہے مگر فطرتِ انسانی اور حیاتِ اجتماعی کے لیے غیر مناسب ہے پس جن انبیاء علیہم السلام نے اس طریقِ کار کو اختیار فرمایا وہ وقت کی اہم ضرورت کے پیشِ نظر تھا خصوصاً جبکہ ان کی دعوت خاص خاص قوموں میں محدود تھی لیکن جماعتی حیات کے لیے فطرت کا حقیقی تقاضا صرف دوسرا طریقِ کار پورا کرتا ہے اور اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کا ذاتی عمل اسی طریقِ کار کی تائید کرتے ہیں اور جبکہ آپ کی بعثت "کَافَّۃً لِلنَّاس" تمام عالم کے لیے ہے تو ایسی صورت میں آپ کے لائے ہوئے "دینِ فطرت" میں اسی کو برتری حاصل ہونی چاہیے تھی، چنانچہ آپ نے متعدد شعبہ ہائے حیات میں اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے کہ دنیا کے معاملات سے جدا ہو کر پہاڑوں کے غاروں اور بیابانوں میں زندگی گزارنے والے شخص کے مقابلہ میں اُس شخص کا مرتبہ خدا کے یہاں زیادہ بلند ہے جو دنیوی زندگی کے معاملات میں مقیدرہ کر ایک لمحہ کے لیے بھی خدا کی نافرمانی نہ کرے اور قدم قدم پر اس کے احکام کو پیشِ نظر رکھے۔

اس کے بعد ارشادِ مبارک ہے:۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِيًّا وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا (مریم پ ۱۶ ع ۱)	اے یحییٰ! (خدا کا حکم ہوا کیونکہ وہ خوشخبری کے مطابق پیدا ہوا اور بڑھا) کتابِ الٰہی (توراۃ) کے پیچھے مضبوطی کے ساتھ لگ جا چنانچہ وہ ابھی لڑکا ہی تھا کہ ہم نے اُسے علم و فضیلت بخش دی نیز اپنے خاص فضل سے دل کی نرمی اور نفس کی پاکی عطا فرمائی وہ پرہیزگار اور ماں باپ کا خدمت گزار تھا، سخت گیر اور نافرمان نہ تھا۔ اس پر سلام ہو (یعنی سلامتی ہو) جس دن پیدا ہوا اور جس دن مرا اور جس دن پھر زندہ کیا جائے گا۔

ولادتِ باسعادت کی بشارت کے بعد قرآن نے یحییٰ (علیہ السلام) کے بچپن کے اُن واقعات کو نظر انداز کر کے جو اُس کے مقصد سے غیر متعلق تھے یہ ذکر کیا ہے کہ خدا نے یحییٰ کو حکم دیا کہ وہ اس کے قانون "توراۃ" پر مضبوطی سے عمل کریں اور اسی کے مطابق لوگوں کو ہدایت دیں" اس لیے کہ یحییٰ (علیہ السلام) نبی تھے رسول نہ تھے اور توراۃ ہی کی شریعت کے پابند تھے" اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا کہ ہم نے عام بچوں کی زندگی سے جُدا اُن کو بچپن ہی میں علم و فضیلت بخش دیے تھے تاکہ وہ جلد ہی نبوّت کے منصب پر فائز ہو سکیں چنانچہ سِیَر کی کتابوں میں مذکور ہے کہ بچپن میں جب بچے اُن سے کھیلنے پر اصرار کرتے تو وہ یہ جواب دیدیتے "خدا نے مجھ کو لہو ولعب کے لیے نہیں پیدا کیا"[1] اور یہ بھی مذکور ہے کہ وہ تیس سال سے قبل ہی نبی بنا دیے گئے تھے۔[2]

آیاتِ زیرِ بحث میں "وَاٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا" کے یہی معنی ہیں جیسا کہ عبداللہ بن مُبارکؒ نے معمرؒ سے نقل کیا ہے[3]، اور جس شخص نے اُس سے یہ مراد لی ہے کہ "یحییٰ (علیہ السلام) بچپن ہی میں نبی بنا دیے گئے تھے" صحیح نہیں ہے اس لیے کہ منصبِ نبوّت جیسا اعلیٰ و اہم منصب کسی کو بھی صغر سِنی میں عطا ہونا نہ عقل کے نزدیک درست ہے اور نہ نقل سے ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرتِ یحییٰ (علیہ السلام) کو ان آیات میں جو سلامتی کی دعاء دی گئی ہے وہ تین اوقات کی تخصیص کے ساتھ ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے یہی تین اوقات سب سے زیادہ نازک اور اہم ہیں۔ وقتِ ولادت جس میں رحمِ مادر سے جُدا ہو کر عالمِ دنیا میں آتا ہے" اور وقتِ موت کہ "جس میں عالمِ دنیا سے وداع ہو کر عالمِ برزخ میں پہنچتا ہے" اور وقتِ حشر و نشر کہ جس میں عالمِ قبر (برزخ) سے عالمِ آخرت میں اعمال کی جزاء و سزا کے لیے پیش ہوتا ہے" لہٰذا جس شخص کو خدا کی جانب سے ان تین اوقات کے لیے سلامتی کی بشارت مل گئی اس کو سعادتِ دارین کا کل ذخیرہ مل گیا" فَطُوْبٰی لَہٗ وَحُسْنُ مَاٰبٍ"

---

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۵۰ [2] قصص الانبیاء للنجار ص ۴۲۰ [3] تاریخ ابن کثیر جلد ۲۔

اور سورۂ انبیاء میں ارشاد ہے :-

وَزَكَرِيَّآ إِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّأَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۚ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَأَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۗ إِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۖ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝ (انبیاء پ ۱۷)

اور اسی طرح (زکریا کا معاملہ یاد کرو) جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا "خدا مجھے (اس دنیا میں) اکیلا نہ چھوڑ (یعنی بغیر وارث کے نہ چھوڑ) اور (ویسے تو) تو ہی (ہم سب کا) بہتر وارث ہے، تو (دیکھو) ہم نے اس کی پکار سن لی اسے (ایک فرزند) یحییٰ عطا فرمایا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے تندرست کر دیا۔ یہ تمام لوگ نیکی کی راہوں میں سرگرم تھے (ہمارے فضل سے) امید لگائے ہوئے (ہمارے جلال سے) ڈرتے ہوئے دعائیں مانگتے تھے اور ہمارے آگے عجز و نیاز کے ساتھ جھکتے تھے۔

دعوت و تبلیغ مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ (وغیرہ) میں حارث اشعری رضؓ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے یحییٰ بن زکریا (علیہما السلام) کو پانچ باتوں کا خصوصیت کے ساتھ حکم فرمایا کہ وہ خود بھی ان پر عامل ہوں اور بنی اسرائیل کو بھی ان کی تلقین فرمائیں۔ مگر یحییٰ (علیہ السلام) کو ان امورِ خمسہ کی تلقین میں کچھ تاخیر ہو گئی تب عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: میرے بھائی! اگر تم مناسب سمجھو تو میں بنی اسرائیل کو ان کلمات کی تلقین کر دوں جن کے لیے تم کسی وجہ سے تاخیر کر رہے ہو۔ یحییٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: بھائی! میں اگر تم کو اجازت دے دوں اور خود تعمیلِ حکم نہ کروں تو مجھے خوف ہے کہ کہیں مجھ پر کوئی عذاب نہ آجائے یا میں زمین میں دھنسا نہ دیا جاؤں اس لیے میں ہی پیش قدمی کرتا ہوں چنانچہ انھوں نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں جمع کیا اور جب مسجد بھر گئی تو وعظ بیان کیا اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو پانچ باتوں کا حکم کیا ہے کہ میں خود بھی ان پر عمل کروں اور تم کو بھی عمل کی تلقین کروں اور وہ پانچ احکام یہ ہیں :-

(۱) پہلا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو اور نہ کسی کو اس کا شریک سہیم ٹھہراؤ، کیونکہ مشرک کی مثال اس غلام کی سی ہے جس کو اس کے مالک نے اپنے روپیہ سے خریدا اگر غلام نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ جو کچھ کماتا ہے وہ مالک کے سوا ایک دوسرے شخص کو دے دیتا ہے تو اب بتاؤ کہ تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کرے گا کہ اُس کا غلام ایسا ہو؟ لہٰذا سمجھ لو کہ جب خدا ہی نے تم کو پیدا کیا اور وہی تم کو رزق دیتا ہے تو تم بھی صرف اسی کی پرستش کرو اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ (۲) دوسرا حکم یہ ہے کہ تم خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرو، کیونکہ جب تک تم نماز میں کسی دوسری جانب متوجہ نہ ہوگے خدائے تعالیٰ برابر تمھاری جانب رضا و رحمت کے ساتھ متوجہ رہے گا۔ (۳) تیسرا حکم یہ ہے کہ روزہ رکھو اس لیے کہ روزہ دار کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو ایک جماعت میں بیٹھا ہو اور اس کے پاس مشک کی تھیلی ہو، چنانچہ مشک اس کو بھی اور اس کے رفقاء کو بھی اپنی خوشبو سے مست کرتا رہے گا اور روزہ دار کے مُنہ کی بُو کا خیال نہ کرو، اس لیے کہ اللہ کے نزدیک روزہ دار کے مُنہ کی بو (جو خالی معدے سے اُٹھتی ہے) مشک کی خوشبو سے زیادہ پاک ہے (۴) چوتھا حکم یہ ہے کہ مال میں سے صدقہ نکالا کرو کیونکہ صدقہ کرنے والے کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس کو اس کے دشمنوں نے اچانک آپکڑا ہو اور اُس کے ہاتھوں کو گردن سے باندھ کر قتل کی جانب لے چلے ہوں اور اس نا اُمیدی کی حالت میں وہ یہ کہے: کیا یہ ممکن ہے کہ میں مال دے کر اپنی جان چھڑالوں! اور اثبات میں جواب پاکر اپنی جان کے بدلے سب دھن دولت قربان کر دے (۵) اور پانچواں حکم یہ ہے کہ دن رات میں کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے رہا کرو کیوں کہ ایسے شخص کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دشمن سے بھاگ رہا ہو اور دشمن تیزی کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہا ہو اور بھاگ کر وہ کسی مضبوط قلعہ میں پناہ گزین ہو کر دشمن سے محفوظ ہو جائے بلاشبہ انسان کے دشمن شیطان کے مقابلہ میں ذکر اللہ کے اندر مشغول ہو جانا محکم قلعہ میں محفوظ ہو جانا ہے۔

اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی جانب متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا۔ میں بھی تم کو ایسی پانچ باتوں کا حکم کرتا ہوں جن کا خدا نے مجھ کو حکم کیا ہے یعنی "لزومِ جماعت" "سمع" اور "طاعت" "ہجرت" اور "جہاد فی سبیل اللہ"۔ پس جو شخص "جماعت" سے ایک بالشت باہر نکل گیا اُس نے بلاشبہ اپنی گردن سے اسلام کی رسّی کو نکال دیا مگر یہ کہ جماعت کا لزوم اختیار کرے اور جس شخص نے جاہلیت کے دور کی باتوں کی طرف دعوت دی تو اُس نے جہنم کو ٹھکانا بنایا، حارث اشعریؓ کہتے ہیں کہنے والے نے کہا! یا رسول اللہ اگرچہ وہ شخص نماز اور روزہ کا پابند ہی ہو، تب بھی جہنم کا سزاوار ہے؟ فرمایا: ہاں، اگرچہ وہ نماز اور روزہ کا پابند بھی ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں تب بھی سزاوارِ جہنم ہے[1]۔

علماءِ سِیَر نے اسرائیلیات سے نقل کیا ہے کہ یحییٰ (علیہ السلام) کی زندگی کا بہت بڑا حصہ صحرا میں بسر ہوا وہ جنگلوں میں خلوت نشین رہتے اور درختوں کے پتّے اور ٹڈیاں اُن کی خوراک تھیں اور وہیں اُن پر اللہ کا کلام نازل ہوا تب انھوں نے دریائے یردن کے نواح میں دینِ الٰہی کی منادی شروع کر دی اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے ظہور کی بشارت دینے لگے۔ لوقا کی انجیل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

اُس وقت خدا کا کلام بیابان میں زکریا کے بیٹے یوحنا (یحییٰ) پر اُترا اور وہ یردن کے سارے گرد و نواح میں جا کر گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کے بپتسمہ (اصطباغ) کی منادی کرنے لگا[2]۔

ابن عساکر نے وہب بن منبہ سے چند روایات نقل کی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ یحییٰ (علیہ السلام) پر خدا کی خشیت اس درجہ تھی کہ وہ اکثر روتے رہتے تھے حتیٰ کہ اُن کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان پڑ گئے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان کے والد زکریا (علیہ السلام) نے جب اُن کو جنگل میں تلاش کر کے پالیا تو اُن سے فرمایا: "بیٹا ہم تو تیری یاد میں مضطرب تجھ کو تلاش کر رہے ہیں اور تو یہاں آہ و گریہ میں مشغول ہے؟ تو یحییٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا:

---

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۵۲ ۔ [2] باب ۱۔ آیت ۱۔

اے باپ! تم نے مجھ کو بتایا ہے کہ جنّت اور جہنّم کے درمیان ایک ایسا لق و دق میدان ہے جو خدا کی خشیت میں آنسو بہائے بغیر طے نہیں ہوتا اور جنّت تک رسائی نہیں ہوتی یہ سُن کر زکریا (علیہ السلام) بھی رونے لگے [1]

واقعۂ شہادت | یحییٰ (علیہ السلام) نے جب خدا کے دین کی منادی شروع کر دی اور لوگوں کو یہ بتانے لگے کہ مجھ سے بڑھ کر ایک اور خدا کا پیغمبر آنے والا ہے تو یہود کو اُن کے ساتھ دشمنی اور عداوت پیدا ہو گئی اور ان کی برگزیدگی و مقبولیت اور منادی کو برداشت نہ کر سکے اور ایک دن اُن کے پاس جمع ہو کر آئے اور دریافت کیا: کیا تو مسیح ہے؟ اس نے کہا، نہیں۔ تب انھوں نے کہا: کیا تو وہ نبی ہے؟ اُس نے کہا، نہیں۔ کیا تو ایلیا نبی ہے؟ اس نے کہا نہیں تب اُن سب نے کہا کہ پھر تو کون ہے جو اس طرح منادی کرتا اور ہم کو دعوت دیتا ہے؟ یحییٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا: میں جنگل میں پکارنے والے کی ایک آواز ہوں جو حق کے لیے بلند کی گئی ہے۔[2] یہ سُن کر یہودی بھڑک اُٹھے اور آخر کار اُن کو شہید کر ڈالا۔

اور ابن عساکر نے "المستقصیٰ فی فضائل الاقصیٰ" میں حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے مولیٰ قاسم سے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں یحییٰ (علیہ السلام) کی شہادت کا واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ دمشق کے بادشاہ ہداد بن حدار نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تھیں، اور پھر چاہتا تھا کہ اس کو واپس کر کے بیوی بنالے یحییٰ (علیہ السلام) سے فتویٰ طلب کیا۔ انھوں نے فرمایا "کہ اب یہ تجھ پر حرام ہے" ملکہ کو یہ بات سخت ناگوار گذری اور یحییٰ (علیہ السلام) کے قتل کے درپے ہو گئی اور بادشاہ کو مجبور کر کے قتل کی اجازت حاصل کر لی اور جبکہ وہ مسجد جبرون میں نماز میں مشغول تھے ان کو قتل کرا دیا اور چینی کے طشت میں اُن کا سرِ مبارک سامنے منگوایا۔ مگر سر اس حالت میں بھی یہی کہتا رہا کہ تو بادشاہ کے لیے حلال نہیں تاوقتیکہ دوسرے سے شادی نہ کر لے اور اسی حالت میں خدا کا عذاب آیا اور اس عورت کو مع سرمبارک زمین میں دھنسا دیا۔

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۵۳۔ [2] انجیل یوحنا باب ۱۔ آیات ۱۹۔۲۸۔

اس روایت میں ایک واقعہ ایسا مذکور ہے جس کی وجہ سے تمام روایت ساقطُ الاعتبار ہوجاتی ہے وہ یہ کہ یحییٰ (علیہ السلام) کا خون فوارہ کی طرح جسمِ مبارک سے برابر نکلتا رہا تا آں کہ بخت نصر نے دمشق کو فتح کر کے اُس پر ستر ہزار اسرائیلیوں کا خون نہ بہا دیا۔ تب ارمیاہ (علیہ السلام) نے آکر خون کو مخاطب کر کے کہا: اے خون! کیا اب بھی تو ساکن نہ ہوگا؟ کتنی مخلوقِ خدا فنا ہوچکی اب ساکن ہوجا۔ چنانچہ اس وقت وہ خون بند ہوگیا۔"[1]

اور حافظ ابن حجرؒ نے اس قصہ کو نقل کرلینے کے بعد فرمایا ہے کہ اس قصہ کی اصل حاکم کی وہ روایت ہے جو انھوں نے مستدرک میں نقل کی ہے۔

روایت کے اس حصہ کو اگر تاریخ کا مبتدی طالبِ علم بھی سُنے گا تو وہ بلا تردد باطل قرار دے گا۔ اس لیے کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بخت نصر کا زمانہ عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ سے صدیوں پہلے ہے پھر یحییٰ (علیہ السلام) کے واقعہ میں بخت نصر کے حملۂ دمشق کا جوڑ لگانا کس طرح درست ہوسکتا ہے؟ اس لیے سخت تعجب ہے کہ حافظ ابن عساکر اور حافظ عماد الدین بن کثیر جیسے صاحبِ نقد بزرگوں نے اس طرح اس روایت کو نقل کر کے سکوت اختیار فرمایا۔ علاوہ ازیں اس روایت میں جس قسم کے عجائب و غرائب بیان کیے گئے ہیں وہ اس وقت تک ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوسکتے۔ جب تک اُن کا ثبوت "نصِ صریح" سے حاصل نہ ہوجائے اور حاکم کی روایت بلحاظِ سند بھی محلِ نظر ہے اور بلحاظِ درایت بھی۔

تعلق | علماءِ سِیَر و تاریخ کا اس میں اختلاف ہے کہ یحییٰ علیہ السلام کا واقعۂ شہادت کس جگہ پیش آیا، ایک قول یہ ہے کہ بیت المقدس میں ہیکل اور قربان گاہ کے درمیان ہوا اور اس جگہ ستر انبیاء شہید کیے گئے، سفیان ثوری نے شمر بن عطیہ سے یہی قول نقل کیا ہے۔[2]

اور ابو عبیدہ قاسم بن سلّام نے حضرت سعید بن مُسیّبؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ دمشق میں قتل ہوئے اور اسی میں بخت نصر کا واقعہ بھی ذکر کیا ہے اور ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ جب صحیح

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۵۵ - [2] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۵۵ -

ہو سکتا ہے کہ عطاء اور حسن کے اس قول کو تسلیم کر لیا جائے کہ بخت نصر عیسیٰ (علیہ السلام) کا معاصر تھا۔[1]

اور ہم ثابت کر چکے ہیں کہ مستند اور صحیح تاریخی شہادتوں سے یہ قول باطل ہے اس لیے کہ بخت نصر، مسیح (علیہ السلام) سے صدیوں قبل ہو گزرا ہے جیسا کہ خود ابن کثیر نے بیت المقدس کی تباہی اور عزیر (علیہ السلام) کے واقعات میں اس کو تسلیم کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس غلط بات کو تسلیم کر لینے کے بعد پھر یہ قول بھی قبول کر لینا ہوگا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) انبیاء بنی اسرائیل کے آخری نبی نہیں ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان "فترۃ" کا زمانہ بھی نہیں ہے بلکہ ارمیاہ، حزقیل، عزیر اور دانیال (علیہم السلام) وغیرہ انبیاء بنی اسرائیل جو سلسلہ طور پر بخت نصر اور اس کے بعد کے زمانہ تک بابل میں قید رہے اُن سب کا ظہور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بعد ہوا حالانکہ یہ تمام باتیں باتفاقِ توراۃ، تاریخی شہادت اور اسلامی روایات، قطعاً غلط اور باطل ہیں۔

البتہ یہ بات کہ یحییٰ (علیہ السلام) کا مقتل بیت المقدس نہیں بلکہ دمشق تھا تو حافظ ابن عساکر کی اس روایت سے بھی اُس کی تائید ہوتی ہے جو اُنھوں نے ولید بن مسلم کی سند سے نقل کی ہے کہ زید بن واقد کہتے ہیں کہ دمشق میں جب عمودِ سکاسکہ کے نیچے ایک مسجد کو دوبارہ تعمیر کیا جا رہا تھا تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ شرقی جانب محراب کے قریب ایک ستون کی کھدائی میں یحییٰ (علیہ السلام) کا سر برآمد ہوا اور چہرۂ مبارک حتیٰ کہ بالوں تک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور خون آلود ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابھی کاٹا گیا ہے[2] لیکن یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ یحییٰ (علیہ السلام) ہی کا سرِ مبارک ہے، کسی اور نبی یا مردِ صالح کا نہیں ہے۔

الحاصل اس بارہ میں کوئی فیصلہ کن شہادت مُہیا نہیں ہے کہ یحییٰ (علیہ السلام) کا

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۵۵ [2] ایضاً۔

مقتل کونسا مقام ہے لیکن یہ مسلمات میں سے ہے کہ یہود نے ان کو شہید کر دیا اور جب عیسیٰ (علیہ السلام) کو ان کی شہادت کا حال معلوم ہوا تو پھر انھوں نے علی الاعلان اپنی دعوتِ حق شروع کر دی۔

قرآنِ عزیز نے متعدد جگہ یہود کی فتنہ پردازیوں اور باطل کوشیوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ انھوں نے اپنے نبیوں اور پیغمبروں کو بھی قتل کئے بغیر نہیں چھوڑا، چنانچہ آلِ عمران میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (آلِ عمران پ ۳ ع ۲)	جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کے حکموں کا اور ناحق پیغمبروں کو قتل کرتے ہیں اور (نبیوں کے سوا) جو لوگ ان کو انصاف کرنے کا حکم کرتے ہیں اُن کو (بھی) قتل کرتے ہیں تو ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سُنادو۔

اور ابن ابی حاتمؒ نے بسلسلۂ سند حضرت ابو عبیدۃ بن الجراحؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل نے ایک دن میں تینتالیس نبیوں اور ایک سو ستر صلحاء کو قتل کر دیا تھا جو اُن کو امر بالمعروف کرتے تھے[1]

زکریا (علیہ السلام) کی وفات

یحییٰ (علیہ السلام) کے واقعۂ شہادت کے ضمن میں علماءِ سیر و تاریخ کے درمیان یہ مسئلہ اختلافی رہا ہے کہ زکریا (علیہ السلام) کی وفات طبعی موت سے واقع ہوئی یا وہ شہید کیے گئے اور لطف یہ ہے کہ دونوں کی سند وہب بن منبہ ہی پر جاکر پہنچتی ہے چنانچہ وہب کی ایک روایت میں ہے کہ یہود نے جب یحییٰ (علیہ السلام) کو شہید کر دیا تو پھر زکریا (علیہ السلام) کی طرف متوجہ ہوئے کہ اُن کو بھی قتل کریں، زکریا (علیہ السلام) نے جب یہ دیکھا تو وہ بھاگے تاکہ اُن کے ہاتھ نہ لگ سکیں، سامنے ایک درخت آگیا اور وہ اس کے شگاف میں گھس گئے

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۲۵۵۔

یہودی تعاقب کر رہے تھے تو انھوں نے جب یہ دیکھا تو ان کو نکلنے پر مجبور کرنے کی بجائے درخت پر آرہ چلا دیا، جب آرہ زکریا (علیہ السلام) پر پہنچا تو خدا کی وحی آئی اور زکریا (علیہ السلام) سے کہا گیا کہ اگر تم نے کچھ بھی آہ وزاری کی تو ہم یہ سب زمین تہ و بالا کر دینگے اور اگر تم نے صبر سے کام لیا تو ہم بھی اُن یہود پر فوراً اپنا غضب نازل نہیں کریں گے۔ چنانچہ زکریا (علیہ السلام) نے صبر سے کام لیا اور اُف تک نہیں کی اور یہود نے درخت کے ساتھ اُن کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے[1]۔ اور ان ہی وہب سے دوسری روایت یہ ہے کہ درخت پر آرہ کشی کا جو معاملہ پیش آیا وہ شعیا (علیہ السلام) سے متعلق ہے اور زکریا (علیہ السلام) شہید نہیں ہوئے بلکہ اُنھوں نے طبعی موت سے وفات پائی[2]۔

بہرحال مشہور قول یہی ہے کہ ان کو بھی یہود نے شہید کر دیا تھا، رہا یہ معاملہ کہ کس طرح اور کس مقام پر شہید کیا تو اس کے متعلق صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ "واللہ اعلم بحقیقۃ الحال"

شب معراج اور یحییٰ (علیہ السلام) بخاری نے یحییٰ (علیہ السلام) کے ذکر میں صرف اسراء کی حدیث کے اس ٹکڑے کو بیان کیا ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرے آسمان پر اُن کے ساتھ ملاقات کرنا مذکور ہے۔ روایت میں ہے:-

فلما خلصت فاذا یحییٰ وعیسیٰ	پس جب میں (دوسرے آسمان پر) پہنچا تو دیکھا کہ یحییٰ اور
وھما ابنا خالۃ قال ھذا یحییٰ	عیسیٰ موجود ہیں اور یہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں جبرئیل نے
وعیسیٰ فسلم علیھما فسلمت	کہا یہ یحییٰ اور عیسیٰ ہیں ان کو سلام کیجئے میں نے ان کو سلام کیا
فردا ثم قالا مرحبا بالاخ الصالح	تو ان دونوں نے سلام کا جواب دیا اور پھر دونوں نے
والنبی الصالح[3]	کہا آپ کا آنا مبارک ہو اے ہمارے نیک بھائی اور نیک پیغمبر!

زکریا (علیہ السلام) کے واقعات میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ یحییٰ (علیہ السلام) کی والدہ ایشاع (الیشبع) اور مریم (علیہا السلام) کی والدہ حنہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں اس لیے

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۵۲۔ [2] ایضاً۔ [3] کتاب الانبیاء۔

حدیثِ معراج میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ یحییٰ اور عیسیٰ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں مجازِ متعارف کے اصول پر ہے یعنی رشتوں میں اس قسم کا مجاز مشہور اور رائج ہے کہ والدہ کی خالہ کو اولاد بھی خالہ کہا کرتی ہے۔

یحییٰ (علیہ السلام) اور اہلِ کتاب

اس سے قبل لوقا کی انجیل سے ہم یحییٰ (علیہ السلام) کے متعلق بعض حوالجات نقل کر چکے ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ یہود تو اپنی سرشت کے مطابق یحییٰ (علیہ السلام) کے منکر ہیں مگر نصاریٰ اُن کو "یسوع مسیح کا منادی" تسلیم کرتے ہیں اور ان کے والد زکریا (علیہ السلام) کو صرف "کاہن" مانتے ہیں اور اہلِ کتاب اُن کا نام یوحنا بیان کرتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ عبری میں یوحنا کے وہی معنی ہوں جو یحییٰ کے ہیں اور ممکن ہے کہ عبری کے یوحنا نے عربی میں یحییٰ کا تلفظ اختیار کر لیا ہو۔

انجیل لوقا میں بھی قرآنِ عزیز کے ارشاد کے مطابق یہ تصریح کی ہے کہ یہ نام اُن کے خاندان میں کسی شخص کا اُن سے پہلے نہیں تھا۔ اس لیے خاندان والوں نے جب سُنا تو تعجب کا اظہار کیا۔

> اور آٹھویں دن ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کا ختنہ کرنے آئے اور اُس کا نام اُس کے باپ کے نام پر زکریاہ رکھنے لگے۔ مگر اس کی ماں نے کہا: نہیں بلکہ اس کا نام یوحنا رکھا جائے۔ انھوں نے اس سے کہا: تیرے کنبے میں کسی کا یہ نام نہیں اور انھوں نے اس کے باپ کو اشارہ کیا کہ تو اس کا نام کیا رکھنا چاہتا ہے؟ اس نے تختی منگا کر کے یہ لکھا کہ اس کا نام یوحنا ہے، اور سب نے تعجب کیا۔ اسی دم اُس کا منہ اور زبان کھل گئی اور وہ بولنے اور خدا کی حمد کرنے لگا۔[1]

اور ان کی عام رہائش اور زندگی کے متعلق متی کی انجیل میں ہے:۔

> یوحنا اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا پٹکا اپنی کمر سے باندھے رہتا تھا

---

[1] لوقا باب ۱ آیات ۵۹-۶۴۔

اور اس کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا[1]

اور یوحنا کی انجیل میں ان کی دعوت و تبلیغ کے متعلق یہ لکھا ہے :۔

"اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے "کاہن" اور "لاوی" یہ پوچھنے کو بھیجے کہ تو کون ہے ؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے ؟ کیا تو ایلیا ہے ۔ اس نے کہا میں نہیں ہوں ۔ کیا تو وہ نبی ہے ؟ یعنی نبی منتظر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس نے جواب دیا کہ نہیں ۔ پس انھوں نے اس سے کہا ، پھر تو ہے کون ؟" تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے ؟ اس نے کہا ، میں جیسا یسعیاہ نبی نے کہا ہے" بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو"[2]

اور لوقا کی انجیل میں اس طرح مذکور ہے :۔

اس وقت خدا کا کلام بیابان میں زکریاہ کے بیٹے یوحنا پر اترا اور وہ یردن کے سارے گرد و نواح میں جا کر گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کے بپتسمہ کی منادی کرنے لگا جیسا کہ یسعیاہ نبی کے کلام کی کتاب میں لکھا ہے کہ :۔

" بیابان میں پکارنے والے کی آواز آتی ہے کہ خداوند کی راہ تیار کرو ، اس کے راستے سیدھے بناؤ" [3]

اور اسی انجیل میں اُن کی گرفتاری کے متعلق یہ الفاظ مذکور ہیں :۔

پس وہ (یوحنا) اور بہت سی نصیحتیں دے دے کر لوگوں کو خوش خبری سُناتا رہا ۔ لیکن چوتھائی ملک کے حاکم ہیرودیس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرودیاس کے سبب اور ان ساری برائیوں کے باعث جو ہیرودیس نے کی تھیں یوحنا سے ملامت اُٹھا کر اُن سب سے بڑھ کر یہ بھی کیا کہ اُس کو قید میں ڈالا ۔[4]

---

[1] باب ۳ آیت ۴-۵ [2] باب ۱ آیات ۱۹-۲۳ [3] لوقا باب ۳ آیات ۵-۲ [4] باب ۳ آیات ۱۸-۱۹

اور آگے چل کر اسی انجیل میں اُن کی شہادت کے متعلق یہ ذکر ہے:۔

اور چوتھائی ملک کے حاکم ہیرودیس سب احوال سُن کر گھبرا گیا اس لیے کہ بعض کہتے تھے کہ یوحنا مُردوں میں سے جی اُٹھا ہے اور بعض یہ کہ ایلیاہ ظاہر ہوا ہے اور بعض یہ کہ قدیم نبیوں میں سے کوئی جی اُٹھا ہے۔ مگر ہیرودیس نے کہا کہ یوحنا کا تو میں نے سر کٹوا دیا۔" اب یہ (مسیح) کون ہے جس کی بابت ایسی باتیں سُنتا ہوں؟[1]

بصائر حضرت زکریا اور یحییٰ (علیہما السلام) کے واقعات وحالات سے اگرچہ حقیقت بین نگاہیں خود ہی نتائج وبصائر اخذ کر سکتی ہیں تاہم یہ چند باتیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہیں:

(۱) دنیا میں اس شخص سے زیادہ شقی اور بدبخت دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا جو ایسی مقدس ہستی کو قتل کر دے جو نہ اُس کو ستاتی ہے اور نہ اس کے مال و دولت پر ہاتھ ڈالتی ہے بلکہ اس کے برعکس بغیر کسی اُجرت و عوض اس کی زندگی کی اصلاح کے لیے ہر قسم کی خدمت انجام دیتی اور اخلاق، اعمال اور عقائد کی ایسی تعلیم بخشتی ہے جو اس شخص کی دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح و سعادت کی کفیل ہو۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح ؓ کے اس سوال پر کہ قیامت میں سب سے زیادہ مستحقِ عذاب کون شخص ہوگا؟ یہ ارشاد فرمایا:۔

قال: رجلٌ قتل نبیًّا او من امر بالمعروف ونهى عن المنكر[2] (الحدیث)	وہ شخص جو نبی کو یا ایسے شخص کو قتل کرے جو اس کو بھلائی کا حکم کرتا اور بُرائی سے باز رکھتا ہے۔

اقوامِ عالم میں "یہود" کو اس شقاوت میں یدِ طولیٰ حاصل رہا ہے۔ انھوں نے اپنے پیغمبروں اور نبیوں کے ساتھ جس قسم کے توہین آمیز سلوک حتیٰ کہ قتل تک کو روا رکھا اس کی نظیر دُنیا کی دوسری قوموں میں مفقود ہے۔

(۲) بنی اسرائیل چونکہ مختلف اسباط (قبائل) میں تقسیم تھے اور اس وجہ سے اُن کی

---

[1] باب ۹ آیات ۷-۹ [2] تفسیر ابن کثیر عن ابی حاتمؒ جلد ۱ ص ۳۵۵۔

آبادیاں چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے مراکز جُدا جُدا تھے اس لیے اُن کے درمیان ایک ہی وقت میں متعدد نبی اور پیغمبر مبعوث ہوتے رہے ہیں مگر "تورات" ان سب کی تعلیم کے لیے اساس اور بُنیاد رہی ہے اور موسیٰ (علیہ السلام) کے حق میں ان انبیاء علیہم السلام کی حیثیت اس درجہ کی تھی جو اس اُمت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح اور حقیقی جانشین "علماءِ حق" کو حاصل ہے۔ اور اگرچہ حدیث "عُلماءُ امتی کانبیاء بنی اسرائیل" الفاظ کے لحاظ سے محلِ نظر ہو لیکن مراد اور مفہوم کے اعتبار سے قطعاً صحیح اور درست ہے اس لیے کہ خاتم الانبیاء کے بعد اب جبکہ سلسلۂ نبوت اپنے عروجِ کمال پر پہنچ کر ختم ہوگیا تو اُمتِ مرحومہ کی تاقیامِ قیامت اصلاح و رشد کے لیے "علماءِ حق" کے سوا دوسری کوئی جماعت نہیں ہوسکتی اور منصبِ نبوت کے خصوصی شرف کے علاوہ ان کی حیثیت بلاشبہ وہی ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) کی تعلیم کے نشر و ابلاغ کے لیے انبیاء بنی اسرائیل کی تھی۔

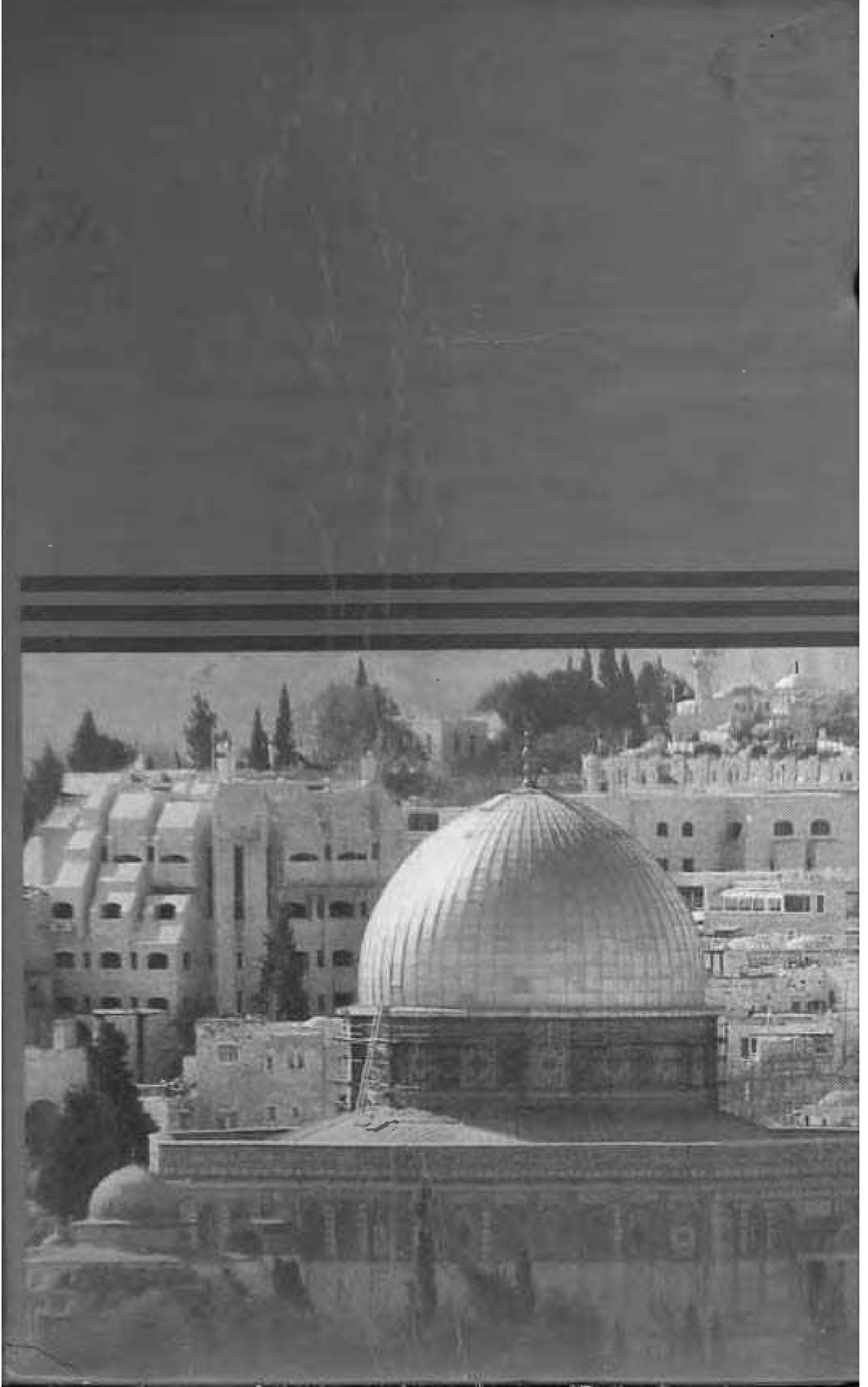
ہم نے "عالِم" کے ساتھ حق کی شرط لگائی ہے اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "علماءِ سوء" کو "شرار الخلق" بدترین مخلوق فرمایا ہے، لیکن یہ واضح رہے کہ جس طرح "علماءِ سوء" کی پیروی اُمت کی گمراہی کا باعث ہوتی ہے اس سے زیادہ دین کی بربادی کا سامان اس طرح مہیا ہوتا ہے کہ "علماءِ سوء" کی آڑ لے کر "علماءِ حق" کے خلاف اُمت میں بدگمانی پھیلائی جائے اور اُن کا استہزاء و تمسخر کرکے "دینِ قیّم" کو تباہ کرنے کی سعی نامشکور کی جائے اور "حق" اور "سوء" کے امتیاز کے لیے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کو حَکم بنانے کی جگہ اپنی آراء اور خواہشات کی موافقت و مخالفت کو "معیار" قرار دے لیا جائے۔

نیز مخصوص اشخاص و افراد کی مخالفت کے جذبہ میں عام طریقہ پر "علماءِ دین" کو ہدفِ ملامت بنانا اور ان کی توہین و تذلیل کرنا دراصل "دینِ حق" کی تعلیم کے خلاف "علمِ بغاوت" بلند کرنا ہے اور اس آیت و حدیث کا مصداق بننا ہے جو گزشتہ صفحات میں یہود کے سلسلہ میں بیان ہوچکی ہیں۔

(۳) انسان کو خدا کے فضل و کرم سے کبھی نا اُمید نہیں ہونا چاہیے اور اگر بعض حالات میں خلوص کے ساتھ دعائیں کرنے کے باوجود بھی مقصد حاصل نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس شخص سے خدا کی نگاہِ مہر نے رُخ پھیر لیا ہے نہیں بلکہ "حکیم مطلق" کی علمتِ عام اور مصلحتِ تام کی نظر میں کبھی انسان کی طلب کردہ شئے مآل اور انجام کے لحاظ سے اس کے لیے مفید ہونے کی جگہ مضر ہوتی ہے جس کا خود اس کو اس لیے علم نہیں ہوتا کہ اس کا علم محدود ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ مطلوب مصالحِ شخصیہ سے بالاتر مصالحِ اجتماعیہ کی فلاح و نجاح کی خاطر "تاخیر" چاہتا ہے یا اس سے بہتر مقصد کے لیے اس کو قربان کر دیا جاتا ہے۔
بہرحال "قنوط" اور "مایوسی" درگاہِ رب العزت میں غیر محمود اور ناپسندیدہ بات ہے:

لَا تَايْئَسُوا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِنَّهٗ	خدا کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو اس لیے کہ
لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا	خدا کی رحمت سے صرف وہی لوگ نا اُمید
الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (یوسف - پ ۱۳ ع)	ہوتے ہیں جو منکر ہیں۔





Custom Scan



Input

Scanner: Panasonic KX-MB2010SX | Options...

Sides: Both Sides

Color Mode: Autodetect

Resolution: 300 DPI

Paper Size: Custom

Width: 135 mm Height: 218 mm

☑ Prompt for scanning more pages

Output

◉ New PDF Document

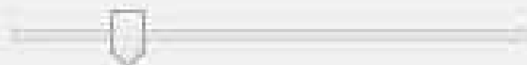
☐ Multiple files | More Options...

○ Append to existing file or portfolio

Select: C:\Users\Salman\AppData\Local\Ter | Browse

Document Settings

☑ Optimize Scanned PDF

Small Size  High Quality | Options...

☐ Make Searchable (Run OCR) | Options...

☐ Make PDF/A-1b compliant ☐ Add Metadata

Help | Defaults | Scan | Cancel